زاد راہ پیغمبر اسلامؐ کی نصیحتیں جناب ابوذرؓ سے

دوسری جلد

تالیف: آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیتؑ

فہرست مطالب

حسی اور دنیوی لذتوں کی طرف عمومی تمایل:چونکہ اکثر لوگ دنیوی اور حسی لذتوں کی طرف میلان رکھتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ انسان کیا کرے تاکہ تکامل و ترقی کی راہ پر گامزن ہو، اپنے اندر مادی رجحان اور حیوانی لذتوں کو پاکر ان سے چشم پوش کر کے حق کے راستہ کی طرف قدم بڑھائے؟ جواب میں کہنا چاہئے کہ لذت خواہی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ انسان کے انجام دیئے جانے والے کاموں میں محرک وہ لذت ہے جو اسے حاصل ہوتی ہے۔ ہم وہ کام انجام دیتے ہیں جسے ہم پسند کرتے ہیں اور جس کام کو پسند نہیں کرتے، اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باطل اور گناہ میں بھی اپنے لئے ایک لذت پاتے ہیں، لیکن ان سے چشم پوشی اور اجتناب کا راستہ یہ ہے کہ گناہ کے نتائج، انجام اور گناہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے بارے میں فکر کریں یا نیک کام کی لذتوں کے بارے میں فکر کریں۔ اگر چہ نیک کام اور حق کی سختیوں کو برداشت کرنا دشوار ہے، لیکن اگر ہم ان کی جزا خوش کرنے والے انجام کو مدِ نظر رکھیں تو ہمارے لئے وہ ساری مشکلات آسان ہوجائیں گی۔

حقیقت میں لوگ سخت اور دشوار دنیوی کام انجام دینے کے بارے میں یوں موازنہ کرتے ہیں:جو مزدور صبح سویرے ایک محرک کی بنا پر ایک سخت کام شروع کرتا ہے اور شام تک کام کرتا رہتا ہے اور پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے، وہ برداشت کی گئی تمام سختیوں سے لذت کا احساس کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے کام کے نتیجہ پر نظر رکھتا ہے۔ نانوائی جو کبھی ۵۰ درجہ گرمی میں روٹی پکاتا ہے، تمام مشکلات کو برداشت کرتا ہے، کیونکہ اجرت لیتا ہے اور اس سے اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ وہ جب اپنے کام کے نتیجہ پر غور و فکر کرتا ہے اور یہ کہ اس اجرت سے اپنی زندگی کے بعض مشکلات کو دور کرتا ہے، یہ امر باعث بنتا ہے کہ وہ زندگی سے لذت محسوس کرے، کام کی زحمت اور محنت اس کے لئے آسان ہوجاتی ہے۔ حقیقت میں ان مشکلات کو برداشت کرنا عقلمندی ہے اور سب لوگ ایسے ہی ہیں کہ جب سختیوں کو لذتوں سے موازنہ کرتے ہیں، تو ایسے کام کو انجام دیتے ہیں جس میں زیادہ لذت ہو۔ اگر وہ اپنے کام میں زیادہ اجرت اور نفع کمائیں تو بالآخر زیادہ لذت پاتے ہیں۔ حقیقت میں جو اجر و پاداش براہ راست اپنے کام سے حاصل کرتے ہیں، اس میں کوئی لذت نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ لذت پانے کے لئے ایک وسیلہ ہوتا ہے، انسان پیسے کے ذریعہ اپنی زندگی کے

لئے گھر اور ضروری اشیاء تہیہ کرتا ہے اور ان سے لذت پاتا ہے۔ پس عقلمند انسان کام کی سختی کو برداشت کرتا ہے تاکہ سرانجام کام کی سختی سے بہتر لذت حاصل کرے۔ عاقل انسان نشہ آور چیزوں کے استعمال اور عارضی لذت سے پرہیز کرتا ہے، کیونکہ وہ ان کے نتائج کے بارے میں سوچتا ہے، وہ جانتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے لذت پاتا ہے۔

اور لاش کی طرح مردہ ہوکر گر جاتا ہے، اور عمر بھر کے لئے بدبخت ہوجاتا ہے۔ اگر ہم یقین کریں کہ گناہ جس قدر بھی شیریں اور لذت بخش ہو اس کا انجام کتنا بُرا ہے۔ اگر دنیا میں ہم اسکے برے انجام سے دو چار نہ بھی ہوں مگر آخرت کی مصیبت میں گرفتار ضرور ہوں گے تو جس دلیل سے ہم نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں اسی دلیل کی بنیاد پر گناہ کی لذتوں کو بھی نظر انداز کریں تاکہ عذاب ابدی میں مبتلا نہ ہوں اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''؛ورب شھوۃ ساعۃ تورث حزناً طویلا ''چند لمحوں کی لذتیں جن کا انجام طولانی مشکلات اور مصائب ہیں، ہمارے زمانے میں ان کے فراوان نمونے پائے جاتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں صرف شراب تھی جو انسان کو چند لمحوں کے لئے مست و مدہوش کرتی تھی اور اس کے بعد اس کے برے اثرات رونما ہوتے تھے، لیکن آج نشہ آور چیزوں کے انواع و اقسام میں اضافہ ہوا ہے۔

بُرا دوست انسان کو دھوکہ دیتا ہے اور ہیروئن جیسی نشہ آور چیز کی لذت بیان کر کے اسے استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پہلی بار انسان لذت کا احساس کرتا ہے، دوبارہ اسے استعمال کرتا ہے اور سرانجام اس کا عادی بن جاتا ہے اور عمر بھر کے لئے بدبخت ہوتا ہے۔ دوسرے گناہ بھی اس طرح کے ہیں۔ اگر ہم فکر کریں کہ جن گناہوں کے ہم مرتکب ہونا چاہتے ہیں ان کا کتنا برا انجام ہے، تو ہم ان سے پرہیز کریں گے۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو آخرت کے علاوہ انسان کو اسی دنیا میں مشکلات سے دوچار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کبھی نامحرم پر ایک نظر ڈالنا انسان کو عمر بھر کے لئے بدبخت اور بیچارہ بنا دیتا ہے اور اس کے سبب سے ایک خاندان ویران ہوجاتا ہے، یہ اس گناہ کا دنیوی انجام ہے، اخروی گرفتاریاں اپنی جگہ پر ہیں :(فاذاقھم اللہ الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا

ولعذاب الآخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون[1]) ''پھر خدا نے انہیں حیات دنیا میں ذلت کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہر حال بہت بڑا ہے اگر انہیں معلوم ہو سکے۔ ''ایک دوسری جگہ پر خدائے متعال فرماتا ہے :(لھم عذاب فی الحیٰوۃ الدنیا و لعذاب الآخرۃ اشق[2]...) ''ان کے لئے زندگانی دنیا میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اور زیادہ سخت ہے۔ ''پس، ہم گناہ کی لذت کو اس کے انجام سے موازنہ کرتے ہوئے یہ کوشش کریں کہ گناہ میں آلودہ نہ ہوں، خاص کر جب تک گناہ کا جاذبہ ہم میں اثر نہ کرے اور ہم گناہ کی سرحد تک نہ پہنچیں گناہ سے پرہیز کرنا آسان ہے، چونکہ گناہ کے جاذبہ نے ہم پر اثر کیا اور ہم گناہ کی سرحد تک پہنچ گئے، تو بہت مشکل ہے کہ ہم اس کو انجام دینے سے پرہیز کریں۔

ایک بزرگ شخص خدا ان پر رحمت نازل کرے کہتے تھے : اے جوانو! خدا سے دعا کرو کہ تمہاری شہوت کی دیگ ابلنے نہ پائے، کیونکہ اس صورت میں اسے خاموش کرنا مشکل ہے، جب تک انسان شہوت یا غضب کا اسیر نہیں ہے، آرام میں ہے اور فکر کر سکتا ہے اور فیصلہ کرکے محاسبہ کر سکتا ہے، اور اس کی شہوت مشتعل ہونے تک گناہ سے اجتناب کر سکتا ہے لیکن اگر پہلے سے فیصلہ نہ کرے اور فکر نہ کرے تو شہوت اور غضب کے مشتعل ہونے پر فکر کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، کیونکہ شہوت کے مشتعل ہونے سے عقل کا چراغ بجھ جاتا ہے۔

شیطان انسان کو منحرف کرنے کے لئے شہوت اور غضب کے علاوہ دوسری طاقتیں بھی رکھتا ہے کہ من جملہ ان کے اجتماعی عوامل میں سے ایک یہ کہ، سماج میں ہر شخص دوسروں کے جیسا ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک روحانی اور نفسیاتی عامل ہے کہ انسان کے بچپنے میں پیدا ہوتی ہے۔ البتہ اس عامل کے بھی دوسرے عوامل کی طرح مثبت و منفی آثار ہیں' درحقیقت خیر و شر کی سرحد کو پہچاننا چاہئے اور اس عامل سے صحیح حد تک استفادہ کرنا چاہئے تاکہ انسان اندھی تقلید نہ کرے۔ دوسروں کے ساتھ ہم رنگ ہونا ' بہت سے مواقع پر انسان کی نجات کا سبب بنتا ہے' کتنے ہی زیادہ جوانوں نے اچھے دوستوں سے مصاحبت کی وجہ سے مسجد کی طرف رخ

---

[1] زمر، ۲۶
[2] رعد، ۳۴

کیا ہے اور کتنے ہی جوان اس عامل کی وجہ سے محاذ جنگ کا رخ کر چکے ہیں۔ وہ ابتداء میں محاذ جنگ پر جانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے دوست اور محلے کے نوجوان محاذ جنگ پر جا رہے ہیں' ان میں بھی محاذ جنگ میں جانے کی رغبت پیدا ہو گئی۔ یہ اس عامل کے اچھے اثرات ہیں،اس کے برعکس جس ماحول کو فساد نے آلودہ بنایا ہو' وہاں پر یہی عامل فساد کی طرف میلان میں اضافہ کا سبب بنتا ہے' خاص کر نوجوانوں میں کیونکہ نوجوان اپنے آس پاس کے ماحول سے فوراً متاثر ہوتے ہیں' اور ماحول پر حاوی فساد اور برائی کے مقابلہ میں کوئی خاص استقامت نہیں دکھا سکتے ہیں لیکن سن رسیدہ لوگوں میں دوسروں سے متاثر ہونے کا عامل ضعیف تر ہوتا ہے۔

معاشرے کی اکثریت یا برتر افراد یا ترقی یافتہ دنیا کی ملتوں کا نمونہ نوجوان ہیں۔ جب لوگوں کی اکثریت میں کسی قسم کا میلان موجود ہو' تو نمونوں کی تقلید کرنے والا انسان اپنے آپ سے کہتا ہے:عام لوگ عقل رکھتے ہیں' پاگل تو نہیں ہیں' اسلئے ان کا کام صحیح ہے،اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد اس عامل سے متاثر ہو کر فساد اور برائیوں میں پھنس جاتے ہیں' خصوصاً اگر معاشرے کی اکثریت فاسد ہو۔

پہلا درس

فقیہ کامل اور توحید کے اعتقاد کی عملی صورت

توحید کے اعتقاد کی عملی صورت

''یا اباذر: لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتیٰ یری الناس فی جنب اللہ تبارک و تعالیٰ امثال الأ باعر، ثم یرجع الی نفسہ فیکون ھو احقر حاقرٍ لھا یا اباذر! لا تصیب حقیقہ الایمان حتی تری الناس کلھم حمقیٰ فی دینھم، عقلا فی دنیا ھم، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جناب ابوذرؓ کو کئے جانے والے موعظہ کے سلسلے میں ہم ایک ایسی بحث تک پہنچ گئے جو توحید افعالی سے مربوط ہے، جس کی وضاحت ضروری ہے: توحید پر اعتقاد کے چند مراتب ہیں کہ ان کا سب سے ادنی مرتبہ اسلام میں نصاب توحید ہے اور ہر شخص اس اعتقاد کی بنیاد پر اسلام کے نقطہ نظر سے موحد کہلاتا ہے، خدا کی وحدانیت پر اعتقاد اس کی ذات و صفات میں ''ربوبیت تکوینی'' اور ''ربوبیت تشریعی[1]''کی توحید پر اعتقاد نیز اس پر اعتقاد کہ خدائے متعال تنہا معبود ہے۔

اس ربوبیت الٰہی کے تقاضا کے مطابق خدا وند عالم ارادہ کے مقدمات (شوق و انگیزہ) اور اختیار نیز امور کے اسباب و وسائل کہ جو انسان کے اختیار مین قرار دیتا ہے اس کے علاوہ درست اور صحیح راستہ کی بھی رہنمائی کرتا ہے، اچھے اور برے کی انھیں ہدایت کرتا ہے اور اس کی فردی اور اجتماعی زندگی کے لئے دستور و قوانین وضع کرتا ہے۔ مرحلہ سے بالا تر وہ مراحل ہیں کہ منجملہ ان میں توحید افعالی پر اعتقاد رکھنا ہے توحید افعالی یعنی انسان ابتداء علم کے ذریعہ اور اس کے بعد شہود کے ذریعہ یقین پیدا کرے کہ کائنات کے اندر موثر حقیقی خدا وند عالم ہے، اس کے علاوہ کوئی بھی مخلوق مستقل حیثیت سے اثر نہیں رکھتی (رہی یہ بحث کہ یہ اعتقاد مسئلہ

---

[1] ''ربوبیت تکوینی'' میں توحیدکا مفہوم یہ ہے کہ ہم کا ئنات کی تدبیر اوراس کے نظام کو چلانا خدا کے اختیار میں جائیں اور اعتقاد رکھیں کہ چاند سورج کی گردش' دن رات کا پیدا ہونا' انسانوں کی موت و حیات اور کھانے والوں کو رزق دینا خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہے جو آسمانوں و زمین کی نگرانی کرتا ہے۔ اسی طرح جو بھی مخلوق اس وسیع و عریض کائنات کے کسی کوشے میں پیدا ہو اور اس کو پروان چڑھائے نسلوں کا سلسلہ قائم ہوا کرے اور ہر موجود کا ظاہر ہو ناسب کی سب اللہ کی تدبیر کے تحت انجام پاتے ہیں اور کوئی شے خدا کی ربوبیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے، ''ربوبیت تشریعی'' انسان کی اختیاری تدبیر سے مربوط ہے۔ خدا کی تمام مخلوقات میں صرف انسان ہے کہ جس کی ترقی اور تکا مل اس کے افعال اختیاری کے دائرے میں ہے ۔

اختیار و تکلیف سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں تو یہ کلامی و فلسفی بحثوں میں بیان ہوا ہے یہاں پر اس کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ توحید افعالی کے اعتقاد کے لئے دو مرحلے ہیں، پہلا مرحلہ: استدلال کے ذریعہ توحید افعالی کا اعتقاد، یعنی اس امر کا برہان و علم حاصل کرنا کہ کوئی بھی مخلوق ذاتی طور پر آزاد اور مستقل نہیں ہے بلکہ ہر مخلوق علت (خدا) کے ساتھ مربوط و وابستہ ہے۔ تمام تاثیر، علت اور معلول ذات مقدس پروردگار کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ توحید پر اعتقاد کا یہ مرحلہ بہت اہم اور قابل قدر ہے، لیکن اس کی اہمیت توحید افعال کی شہود کے مرحلہ کے برابر نہیں ہے۔

دوسرا مرحلہ: انسان توحید افعالی پر علم حاصل کرنے کے بعد سیر و سلوک اور شہود کی راہ سے ایک عرفان تک پہنچتا ہے اور باور کرتا ہے کہ کائنات میں حقیقی موثر صرف اللہ ہے۔ اس مرحلہ میں انسان اس بات کو درک کرتا ہے کہ شدت و ضعف کے لحاظ سے اللہ کے علاوہ کوئی بھی انسان کی تقدیر کے بارے میں موثر نہیں ہے اور یہ خدائے متعال ہے جو نفوذ رکھتا ہے اور اسباب و وسائل میں ظہور پیدا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور توحید افعالی پر اعتقاد

توحید افعالی کے معتقد افراد کی بہترین مثالیں، جو اسباب و مسبات کے نظام کو مشیت الٰہی کے ارادہ سے وابستہ جانتے ہیں اور مستقل و براہ راست تاثیر کو صرف اللہ سے مربوط جانتے ہیں، اس کے علاوہ کسی کو ملجا و ماوی نہیں جانتے، انبیاء علیہم السلام اور دین کے پیشوا ہیں۔ یہاں پر ہم موحدوں کے نمایاں اسوہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے دعوت الٰہی کی راہ میں کسی سے خوف نہ کیا، بابل کے مشرکوں اور بت پرستوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے اور ان کی عدم موجودگی میں بتوں کو توڑ ڈالا، اور جب وہ لوگ شہر کی طرف واپس آئے تو بتوں کے توڑے جانے کے بارے میں آگاہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان سے مجادلہ و مناظرہ کیا اور واضح روشن اور قوی استدلال سے ان کے بے بنیاد اعتقادات کو باطل ثابت کیا۔ یہاں تک وہ لوگ اس کی قوی منطق کے مقابلے میں کچھ نہ بول سکے صرف ایک ہی چارہ ان کی نظروں میں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے غضب کی آگ میں جلا

دیں: (قالوا حرّقوہ وانصروا آلھتکم ان کنتم فاعلین[1]) ''ان لوگوں نے کہا ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دو اور اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس طرح اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ ''اس کے بعد بہت سی لکڑیاں جمع کی گئی اور مقررہ دن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے اندر ڈال دیا، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف ذات مقدس الٰہی کی طرف متوجہ تھے۔ یہاں تک حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف یہ فرماتے تھے'' :یا احدُ یا احدُ یا صمدُ یا صمدُ یا من لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ''اس کے بعد فرمایا: ''صرف خدائے متعال پر توکل کرتا ہوں[2]''

وہ اس قدر خدا پر اعتماد رکھتے تھے اور اپنے ایمان پر راسخ الاعتقاد تھے اور پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو رب العزت کا محتاج پاتے تھے اور انہوں نے خدا کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا یہاں تک خدا کے مقرب فرشتے کی طرف سے مدد کی پیشکش بھی قبول نہیں کی: امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں'' :لما القی ابراہیم' علیہ السلام' فی النار تلقاہ جبرئیل فی الھواء وھو یھوی فقال: یا ابراہیم الک حاجۃ؟ فقال اما الیک فلا[3]'' ''جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، جبرئیل نے آسمان سے نازل ہوتے ہوئے انھیں دیکھا اور عرض کی: کیا کوئی حاجت ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ہے لیکن تم سے نہیں؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان جو شیعہ و سنی دونوں سے نقل ہوا ہے' اس الٰہی سورما کی بزرگ روح میں توحید کے بلند مراتب کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور یہ ایسا اعتقاد اور جذبہ ہے جس نے انہیں غیبی امداد کے لائق قرار دیا۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ سرد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے :آگ اتنی ٹھنڈی ہو گئی کہ حضرت ابراہیمؑ سردی سے کانپ رہے تھے اور ان کے دانت بج رہے تھے اور انھوں نے اپنے دانتوں کو دبا رکھا تھا یہاں تک خدائے متعال نے دوبارہ حکم دیا: ''اے آگ ان پر سالم ہو جاؤ ''!اس کشمکش کے دوران جبرئیل نازل ہوئے اور آگ کے اندر حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹھ گئے اور گفتگو کی۔ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں'' :حضرت علی علیہ السلام کے غلام قنبر حضرتؑ سے انتہائی محبت کرتے تھے' اور جب حضرتؑ گھر سے باہر نکلتے تھے'

---

[1] انبیاء،۶۸

[2] المیزان ،ج۱۴ص،۳۰۷

[3] اصول کافی (باترجمہ) ج۳ص،۹۸

تو قنبر بھی ایک تلوار لئے ہوئے ان کے پیچھے ہو لیتے تھے،ایک رات حضرت علی،نے جب انھیں دیکھا تو فرمایا: اے قنبر! کیا کر رہے ہو؟ عرض کی: یا امیر المومنین، آیا ہوں تاکہ آپ کے پیچھے پیچھے چلوں۔ حضرتؑ نے فرمایا: افسوس ہو تم پر! تم اہل آسمان یا اہل زمین سے میری حفاظت کر رہے ہو؟ عرض کی: اہل زمین سے۔ حضرتؑ نے فرمایا: اہل زمین خدا کی اجازت کے بغیر میرے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے ہیں، تم واپس چلے جاؤ، وہ واپس چلے گئے۔

غیر خدا پر اعتماد، توحید افعالی پر عدم اعتقاد کا نتیجہ

جو کچھ بیان ہوا وہ توحید افعالی پر اعتقاد، نقطہ نظر اور رفتار و کردار کا انعکاس تھا کہ انسان کو چاہئے صرف خدا پر تکیہ کرے اور اس کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہ لائے، جبکہ توحید افعالی کے مرحلۂ شہود تک پہنچنے سے پہلے انسان دوسروں پر بھروسہ کرتا ہے اور سوچتا ہے ان کا محتاج اور نیاز مند ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ اس کی حاجت پوری کریں گے اور اس کی مشکل کو دور کریں گے۔ یا یہ کہ اسے کوئی نقصان پہنچائے گا ، اس لئے وہ خوف و تشویش میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ تاثیر کے بارے میں مستقل اور آزاد اسباب و مسبات کا قائل ہے اور ان پر بھروسہ کرتا ہے۔ یقیناً یہ رویہ توحیدی تفکر کے ساتھ تناسب نہیں رکھتا یہ تصور ''بحول اللہ وقوتہ اقوم و اقعد'' اور ولاحول ولا قوۃ الّا باللہ'' کے ساتھ تناسب نہیں ہے۔

توحیدی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی پر تکیہ نہ کرے اور ماسوا اللہ کسی پر اعتقاد نہ رکھے۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں''یا اباذر! لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتی یری الناس فی جنب اللہ تبارک و تعالیٰ امثال الاباعر ، ثم یرجع الی نفسہ فیکون ہو احقر حاقر لھا''''اے ابوذر! انسان تب تک کامل فہم و ادراک تک نہیں پہنچتا یہاں تک کہ لوگوں کو عظمت الٰہی کے سامنے بے شعور اونٹوں کے مانند دیکھے، اس کے بعد اپنے آپ پر نظر ڈال کر خود کو ان سے کم تر جان لے۔''دلچسپ بات یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں کوئی شخص کامل فقیہ نہیں ہوتا، مگر یہ کہ انسانوں کے اختیارات کسی اور کے ہاتھ میں دیکھے، اونٹوں کی طرح جن کی لگام ساربان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ اونٹوں کے گلہ کی ہدایت کرتا ہے اور وہ آزاد نہیں

ہیں، حرکت کی جہت کا انتخاب اور کاموں کی تنظیم و تدبیر کسی اور کے ہاتھ میں ہے، لگام اس کے ہاتھ میں ہے۔ ابتدا میں انسان تصور کرتا ہے کہ دوسرے لوگ اپنی حرکتوں، جنگوں، کامیابیوں اور پیدا ہونے والے تحولات میں آزاد ہیں۔ لیکن جب اس کی معرفت میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور معرفت توحیدی تک پہنچتا ہے، تو انہیں اونٹوں کی قطار کے مانند دیکھتا ہے کہ ان کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور ان اسباب کے متحرک سلسلہ کو خدا جانتا ہے۔

صحیح ہے کہ کچھ اسباب و مسبات کی بنا پر یہ سلسلہ حرکت میں ہے، لیکن یہ سلسلہ متزلزل ہے۔ کوئی ہے جس نے ان اونٹوں کی لگام کو پکڑ رکھا ہے۔ البتہ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان مجبور ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ مطلق تاثیر اس کے اختیار میں نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہی سب کچھ ہیں اور فیصلہ کرنے والے ہیں؛ بلکہ کسی اور نظام کے تحت ہیں اور بشری ارادہ سے بالا کوئی اور ارادہ ان پر حکومت کر رہا ہے۔ پس، موحد وہ ہے جو اللہ کو فراموش نہ کرے اور کائنات کے نظام میں دست قدرت الٰہی سے آنکھ بند نہ کرے، اگر ایسا نہیں ہے تو۔ توحید کو درک نہیں کیا ہے۔

البتہ ان مطالب کا بیان اور وضاحت آسان نہیں ہے۔ اس حقیقت کے فہم و ادراک میں بیان کا کوئی بنیادی رول نہیں ہے، بلکہ ہمیں خداوند متعال سے درخواست کرنی چاہئے تاکہ ان حقائق کو درک کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں فقیہ، وہ اصطلاحی فقیہ نہیں ہے کہ جس کا آج مجتہد کے لئے احکام شرعی کے استنباط کے سلسلہ میں اطلاق ہوتا ہے، بلکہ یہ لغوی معنی میں ہے، یعنی وہ شخص جسے معارف دینی میں حقیقی فہم و شعور ہو) معرفت کی اس حد تک پہنچنے کے باوجود بھی انسان کو شیطانی وسوسوں سے اپنے کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے، کیونکہ شیطان کسی بھی وقت انسان کو نہیں چھوڑتا ہے۔ خاص طور پر شیطان ان لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تلاش کرتا ہے جنھوں نے حق و کمال کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والے لوگ خود شیطان کے پیچھے قدم بڑھاتے ہیں اور شیطان کو انھیں منحرف کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔

شیخ انصاری اور شیطان کے پھندے سے فرار :ایک معروف داستان ہے کہ شیخ انصاریؒ کے زمانے میں ایک شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کافی تعداد میں رنگا رنگ رسیاں ہیں، ان میں سے بعض رسیاں سبز، بعض سرخ اور بعض زرد رنگ کی تھیں ان رسیوں میں سے کچھ رسیاں باریک تھیں اور کچھ موٹی۔ ان رسیوں میں ایک رسی کافی موٹی تھی جو ٹوٹ گئی تھی۔ اس شخص نے شیطان سے پوچھا : یہ رسیاں کس لئے ہیں؟ شیطان نے کہا : یہ وہ پھندے ہیں جن کے ذریعہ میں بنی آدم کو اپنے جال میں پھنسا کر دھوکہ دیتا ہوں۔ اس شخص نے ہر ایک رسی کے بارے میں سوال کیا۔ ایک رسی کے بارے سوال کیا تو شیطان نے کہا : یہ عورت ہے، یہ گھر ہے کسی سوال کے جواب میں کہا یہ زندگی، پیسہ اور مقام ہے۔ سوال کیا : میرا پھندا کونسا ہے؟ شیطان نے کہا : تجھے پھندے کی ضرورت نہیں ہے، تم تو خود میرے پیچھے آرہے ہو! یہ پھندے ان لوگوں کے لئے ہیں جو میرے پیچھے نہیں آتے ہیں، میں ان پھندوں کو ان کی گردنوں میں ڈال کر زبردستی اپنے پیچھے کھینچ لیتا ہوں پھر سوال کیا : یہ رسی جو دو ٹکڑے ہو گئی ہے وہ کس لئے ہے ؟ کہا : مدتوں محنت کر کے اس رسی کو شیخ انصاری کے لئے درست کیا تھا، لیکن گزشتہ رات جب اسے ان کی گردن میں ڈالا، تو انھوں نے اسے ایک جھٹکا دیکر توڑ دیا! شیطان غم و غصہ کے مارے ایک چیخ ماری دور چلا گیا۔

وہ شخص نیند سے بیدار ہوا اور صبح تک ناراض اور پریشان تھا کہ یہ کیسا حادثہ پیش آیا۔ صبح کو جب اس نے مرحوم شیخ انصاری کے پاس جاکر خواب بیان کیا۔ شیخ سن کر رو پڑے اور کہا : گزشتہ رات میری بیوی کے وضع حمل کا وقت آپہنچا، دایہ اور ہمسایہ کی عورتوں نے کہا : جننے والی کو تیل پینا چاہئے۔ مجھے کہا : جاکر تھوڑا سا تیل خرید لائیے۔ تیل خرید نے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں تھے، میرے پاس مال امام کے صرف دو تومان تھے جنھیں میں نے الگ رکھ رکھا تھا تا کہ کسی مستحق کو دیدوں۔ انہی پیسوں کو اٹھا کر چلا گیا تاکہ اپنی بیوی کے لئے تیل خرید لوں۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ اگر آج رات کسی طالب علم کی بیوی کے لئے یہی صورت حال پیش آگئی تو کیا اس کے پاس تیل خرید نے کے لئے پیسے ہیں؟ اس کے بعد اپنے آپ سے کہا : شاید نجف کے کسی گوشے میں کوئی طالب علم ہوگا جس کی بیوی آج رات وضع حمل کرنا چاہتی ہو اور اس کے پاس تیل خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں۔ میں واپس لوٹا اور پیسے

اپنی جگہ پر رکھدیئے اور کہا رہنے دو تیل کو! یہ ایک پھندا تھا جسے شیطان نے میرے لئے پھیلایا تھا اور نو مہینوں سے منتظر تھا کہ ایسی ایک رات پہنچے تاکہ میں سہم امام پر تصرف کروں، لیکن خدائے متعال نے مجھے توفیق بخشی اور میں نے اس پھندے کو توڑ دیا۔

جی ہاں، شیطان اپنی پوری طاقت ایسے افراد کو منحرف کرنے پر صرف کرتا ہے، جو کمال کی راہ میں گامزن ہوتے ہیں۔ جب انسان نے کمال و معرفت کے مراحل میں قدم رکھا ہے،

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کا دل منور ہوا اور توحید کے کچھ جلوے اس کے لئے رونما ہوئے، یا اس کے لئے کوئی مکاشفہ ہوا، کسی چیز کو دیکھا یا کوئی آواز سنی تو فوراً شیطان حاضر ہوتا ہے اور وسوسہ کرتا ہے اور انسان کو مغرور کر ڈالتا ہے کہ تم عالی مقام پر پہنچے ہو دوسروں سے بہت فرق رکھتے ہو۔ جب انسان تلاش و کوشش کے نتیجہ میں معرفت کے اس مرحلہ میں پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے انسان اثر ڈالنے میں آزاد اور مستقل نہیں ہیں ان کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہے کہ انسان تھوڑے سے پیسوں کیلئے یا اس لئے کہ اسی کے لئے کوئی کام انجام دیں' ان کے سامنے جھک جائے یا ہاتھ پھیلائے اور ان سے مدد طلب کرے، تو اچانک شیطان اسے وسوسہ میں ڈالتا ہے کہ تم نے عجیب بلند معرفت حاصل کی ہے! بڑی اہم شخصیت بن گئے ہو اس صورت میں انسان غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایسے ہی غرور کو روکنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمانے کے بعد کہ: ''دوسروں کو خدا کے پاس، اونٹوں کے مانند دیکھو'' فوراً فرماتے ہیں: ''لیکن خود کو ان سے پست تر دیکھو'' خود کو بھی دوسروں کے مانند بلکہ ان سے چھوٹا دیکھو کہ تم مخلوقات کی مسلسل کڑیوں میں سے ایک کڑی ہو دوسری اور ان کڑیوں کو ہلانے والا کوئی اور ہے نہ صرف دوسروں کی حرکت بلکہ تیری حرکت بھی اس سے ہے، بقول شاعر

؎ ما ہمہ شیریم ولی شیر علم

حملہ مان از باد باشد دم بہ دم

حملہ مان باد و نا پید است باد

جان فدا ی آنکہ نا پید است باد

''ہم سب شیر ہیں لیکن وہ شیر جو پرچم پر (نقشہ) بنا ہوتا ہے، ہمارا حملہ ہوا کے ذریعہ ہوتا ہے (جب ہوا کے جھونکوں سے پرچم ہلتا ہے۔ ہمارا حملہ ہوا کے ذریعہ سے ہے لیکن ہوا دیکھائی نہیں دیتی۔ اس پر ہماری جان قربان ہو جو دکھائی نہیں دیتا''

لہٰذا اگر دین میں کوئی فقیہ بن گیا تو، پہلے یہ کہجب تمام لوگوں کا خدائے متعال سے موازنہ کرتا ہے تو انہیں ناچیز دیکھتا ہے، دوسرے یہ کہ جب دیگر لوگوں کا اپنے سے موازنہ کرتا ہے تو سب کو اپنے سے بہتر دیکھتا ہے اور یہ خصوصیت عجیب ہے۔ یعنی خدائے متعال انسان کو ایسی توفیق عطا کرتا ہے کہ ایک طرف تمام لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا نیز، اپنی زندگی میں اثر ڈالنے کے لحاظ سے دوسروں کو اہمیت نہیں دیتا اور دوسری جانب سے آداب شرعی کی بھی رعایت کرتا ہے، جبکہ اس حالت میں دوسروں کے لئے کسی رول یا مقام کا قائل نہیں ہے، انہیں تواضع، ادب اور احترام کرنے سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ آداب شرعی کی رعایت کرتا ہے اور حقیقت میں اپنے آپ کو دوسروں سے چھوٹا سمجھتا ہے۔

ایک طرف سے انسانوں کی خدا کے سامنے بوجھ اٹھانے والے اونٹوں کے مانند دیکھتا ہے کہ ان کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف سے خود کو ان کے درمیان ایک چھوٹے اونٹ کے مانند دیکھتا ہے۔ نہ یہ کہ ان کو اونٹ کے مانند دیکھتے وقت اپنے کو اونٹ سوار د یکھے! بلکہ خود کو چھوٹا اور دوسروں سے ذلیل تر دیکھتا ہے اور اپنی نفس کے حقیر ہونے کا اعتراف کرتا ہے، لیکن یہ مشکل ہے انسان اس نظریہ کے مطابق دوسروں کے مقابل میں خود کو اس طرح چھوٹا شمار کر کے تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن یہ ممکن ہے اور حقیقت بھی ہے۔ اگر انسان اس مطلب کو درک کرے اور دوسروں کے لئے کسی رول اور اثر کا قائل بھی نہ ہو اور ان کے سامنے کمال انکساری اور تواضع بھی رکھتا ہو، تو معارف دینی میں موجود ہ بہت سوالات کا جواب واضح

ہوجاتا ہے۔ حقیقت میں پیغمبر اسلامؐ کے اس بیان سے تواضع کی حد بھی واضح ہوجاتی ہے اور تواضع اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل و خوار کرنے کے معنی میں نہیں ہوتا ہے بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام مبارک میں تواضع انسان کی عظمت و عزت کو بڑھاتا ہے۔

تواضع، عزت و سربلندی کا سبب

ایک روایت میں حسن بن جہم حضرت امام رضا علیہ اسلام سے تواضع کی حد کے بارے میں سوال کرتے ہیں، حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں '':تواضع کے چند درجات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی قدر و منزلت کو پہچان لے اور اپنے آپ کو خوشی اور رضایت قلب کے ساتھ اپنی جگہ پر قرار دے اور جس طرح لوگوں نے اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہے وہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے (اگر اس کے ساتھ نیکی کی ہے تو وہ بھی نیکی کرے) اگر ان سے برائی دیکھے تو اسے نیکی سے پردہ پوشی کرے۔ اپنے غصہ کو پی جائے اور لوگوں کو معاف کردے اور خدائے متعال بھی نیک انسانوں کو دوست رکھتا ہے۔

یقیناً اس قسم کا تواضع نہ صرف انسان کی پستی و خواری کا سبب نہیں بنتا ہے بلکہ اس کی عظمت اور عزت میں اضافہ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں.... '':وان التواضع یزید صاحبه رفعة فتواضعوا یرفعکم اللہ ''.. بعض ماہر نفسیات معتقد ہیں کہ اگر انسان اپنے آپ کو دوسروں سے چھوٹا اور حقیر سمجھے تو ''احساس کم تری '' کا شکار ہو کر دوسروں سے رابطہ برقرار نہیں کرسکتا۔ وہ اچھی طرح بات بھی نہیں کرسکتا ہے۔ شرم و حیا سے دوچار ہوتا ہے، خود اعتمادی کو کھو دیتا ہے۔ معاشرتی زندگی کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ اس صورت میں تواضع اور خود اعتمادی کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے، یعنی ہم ایک طرف سے تواضع کو اپنا شیوہ بنائیں اور دوسری طرف سے اپنی روح کی حفاظت کریں، ایک طرف سے خود کو دوسروں سے حقیر سمجھیں اور دوسری طرف سے اپنی روحانی نشاط کی حفاظت کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ انسانوں میں موجودہ بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا سرچشمہ (بغیر اس کے کہ ہم خاندان اور موحول کے رول کو مد نظر نہ رکھیں) خداوند متعال پر بھروسہ نہ کرنا ہے،

اگر انسان اس بنیادی اعتمادی اور اہم نقطہ کو کھودے، نفسیاتی حوادث و بحرانوں کا ایک سیلاب اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور اس کی روح آفات و امراض کے حملوں کا نشانہ بن جائے گی،لیکن اگر انسان اپنے عمل اور ردعمل کو آسمانی معیاروں کے مطابق منظم کرے تو وہ بہت سی نفسیاتی بیماریوں سے نجات پائے گا،اس لحاظ سے روایتوں میں تواضع کے خدا نے قید لگائی ہے: ''مَن تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ'' اگر انسان کا تواضع دوسروں کے مقابلے میں صرف خدا کی خوشنودی کے لئے ہو اور اس کا عمل خدا کے لئے مخلصانہ ہو،تو وہ کسی قسم کی حقارت کا احساس نہیں کرے گا۔

پس وہ تواضع پسندیدہ ہے جس کا سرچشمہ خدا کے کے لئے اخلاص ہو ورنہ اگر تواضع کا سرچشمہ ضعف،ناکامی اور احساس کمتری ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی ثواب بھی نہیں ہے۔ا۔ ''قال قلت: ما حد التواضع الذی اذا فعلہ العبد کان متواضعا؟ فقال : التواضع درجات منھاان یعرف المأقدر نفسہ فینزلہا بقلب سلیم ' لایحب ان یاتی الی احد الا مثل ما یوتی الیہ ان رای سیءۃ دراھا بالحسنۃ کاظم الغیظ عاف عن الناس واللّٰہ یحب المحسنین'' (اصول کافی ''باترجمہ' 'ج ۳' کتاب الایمان والکفر۔ص ۱۸۹)اس تجزیہ کے مطابق کہنا چاہئے: اگر انسان کا تواضع دوسروں کے سامنے، صرف فرمان الٰہی کی عبودیت و اطاعت پر مبنی ہوتو، نہ صرف ضعیفِ نفس کا سبب نہیں بنے گا بلکہ انسان کے فخر و مباہات کا سبب بھی بنے گا،یعنی انسان تواضع کو خدا کی عبادت جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے سامنے خاک پر رکھنا،پیشانی کو مٹی پر رگڑنا اور سجدہ کرنا کسی مومن کے لئے احساس کمتری کا سبب نہیں بنتا،بلکہ اس کے لئے فخر و عزت فراہم کرتا ہے، اسی طرح انسان کا دوسروں کے سامنے جب خدا اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے ہوتو،فخر و مباہات کا سبب بنتا ہے۔

حضرت سجاد علیہ السلام نقص اور فقر ذاتی کا ادراک:گزشتہ مطالب کے پیش نظر ہم بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت امام سجاد علیہ السلام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں اس مقام عصمت و طہارت نفس کے باوجود کیوں بارگاہ الٰہی میں یوں پیش آتے ہیں... '' :فمن یکون اسوء حالاً منّی ان انا نقلت علی مثل حالی الیٰ قبر لم امھدہ لرقدتی''' ...کون مجھ سے بد حال تر ہے اور کس کا دن مجھ سے تاریک تر ہے،اگر میں

اسی حالت میں جو اس وقت رکھتا ہوں قبر میں منتقل ہو جاؤں تو اسے میں نے اپنے آرام کے لئے آمادہ نہیں کیا ہے''

(امام تکلف اور مذاق نہیں کرتے ان کی بات سنجیدہ ہے) یہ کہ امام معصوم کا حال کس طرح تمام لوگوں سے بد تر ہے، یہ ایک پیچیدہ معما ہے لیکن اگر انسان معارف توحیدی سے آشنا ہو جائے تو یہ معما اس کے لئے حل ہوجائے گا۔ جب انسان کو یہ علم ہو جائے کہ تمام ظروف خالی ہیں جو بھی جو کچھ بھی رکھتا ہے،اسے خدا نے دیا ہے، وہ اسی سے نتیجہ اخذ کرے گا کہ جو بھی نقص ہے وہ ہماری وجہ سے اور ہم میں موجودہ فقر کی وجہ سے ہے۔

یہ ہمارے گناہ انجام دینے کی وجہ سے ہے، یا اس لئے ہے کہ ہم معرفت نہیں رکھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کس کے سامنے ہیں، کس کی مخالفت کرتے ہیں،یا ہمارا ارادہ اس قدر ضعیف ہے کہ شہوت اور غضب کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں یہ سب ہماری کمزوری کی حکایت کرتے ہیں اور انسان، ضعف و کمزوری کے علاوہ اپنی کوئی چیز نہیں رکھتا ہے۔ہمارا اپنا کیا ہے کہ خدا نے ہمیں نہیں دیا ہے؟ علم، فہم،اندیشہ، عبادت اور عبادت و عمل کی توفیق اور جو بھی ہم رکھتے ہیں وہ خدا سے ہے،یہ سب چیزیں توفیق الٰہی سے ہمیں ملی ہیں، سوال کرنا بھی اس نے ہمارے اختیار میں رکھا ہے، ورنہ ہم اپنی طرف سے کوئی چیز سوائے ان نابود ہونے والی حیثیت (ضعف و نقص)کے نہیں رکھتے اور اگر ہم خدائے متعال سے اپنے حساب کو جدا کرنا چاہیں تو ہمارے پاس صرف ایک خالی ظرف بچے گا،اگر تعبیر ظرف صحیح ہے تب۔ ہم اپنی طرف سے نہ ثروت رکھتے ہیں اور نہ فہم و عقل،جو کچھ ہماری طرف سے ہے وہ جہل،بے چارہ گی،کج فہمی اور کمزور ارادہ ہے کہ یہ سب نقص و کمزوریاں ہیں۔ اگر نقائص اور کمزوریاں انحراف اور لغزش کا سبب بنتی ہیں، تو جس میں نقائص اور کمزوریاں زیادہ ہوں اس میں منحرف ہونے کے زیادہ امکانات ہیں، جس میں نقص و ضعف زیادہ ہو اس میں ظرفیت و جودی زیادہ ہے: جب ظرف بڑا ہے تو،زیادہ گنجائش رکھتا ہے اور اسے پُر کرنے کے لئے زیادہ اشیا کی ضرورت پڑتی ہے، جب انسان کی ظرفیت وجودی زیادہ ہو، تو اسے بیشتر کمال عنایت ہونا چاہیے،بہر صورت وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا ہے،ایک چڑیا، اس کے چھوٹے پن کے پیش نظر تھوڑی سی ظرفیت کی مالک ہے تو اس کی ظرفیت کی حد میں خدائے متعال نے

اسے آنکھ، کان، پرواز کی طاقت اور شور مچانے کی قدرت عطا کی ہے،اگر خدائے متعال ان چیزوں کو اس سے لے لے، تو ایک چڑیا کے برابر ظرف خالی ہوگا ، لیکن ایک ہاتھی جس کی ظرفیت زیادہ ہے، خدانے اسے اس کی ظرفیت کی حد میں اعضا و جوارح اور قدرت و توانائی عطا کی ہے، اب اگر ان کو اس سے لے لے، تو ایک ہاتھی کے برابر ظرفیت خالی ہوگی۔

کیا ہماری معنوی ظرفیت حضرت امام سجاد علیہ السلام کی معنوی ظرفیت کے برابر ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے،ہماری ظرفیت کم ہے، ہمارے فہم و شعور کے مطابق ہے،اس لحاظ سے ہم اپنی ظرفیت کے مطابق مجازات ہوں گے اور جس طرح امام سجاد علیہ السلام کا حساب و کتاب ہوگا، ہر گز ہمارا اس طرح نہیں ہوگا ۔ جو تکلیف پیغمبر اور امام علیہم السلام کے لئے ہے، کبھی ہمارے لئے وہی تکلیف نہیں ہے، کیونکہ ہم اسے برداشت کرنے کی توانائی نہیں رکھتے ہیں،پس ہماری ظرفیت معصوم کی نسبت بہت محدود ہے،اس لحاظ سے ہماری کمزوریاں اور ضعف بھی محدود ہیں، امامؑ جب خود پر نظر ڈالتے ہیں جو کچھ خدا نے انہیں دیا ہے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے، تو بے شمار کمزوریاں مشاہدہ کرتے ہیں،کیونکہ خدا نے جو کچھ انہیں دیا ہے یادے گا اس کی نسبت زیادہ توانائی، ظرفیت اور قابلیت رکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے جب اپنے پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں ان کی کمزوریاں دوسروں سے زیادہ ہیں، کیونکہ ان کی ظرفیت زیادہ ہے، لہذا فرماتے ہیں: ''فمن یکون اسوء حالاً منّی''کیا اگر ایک نوجوان جو ابھی بالغ ہوا ہے، اور محدود معرفت رکھتا ہے، ایک اشتباہ و خطا کا مرتکب ہوجائے تو اس کا گناہ ایک دانشمند جو پچاس سال تک درس پڑھ چکا ہے حدیث و قرآن مجید کے علوم پڑھ چکا ہے،اور اسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو،اس کے برابر ہے؟ یقیناً اس عالم کا گناہ زیادہ ہے، کیونکہ وہ زیادہ ظرفیت و قابلیت رکھتا ہے،اس نوجوان کا گناہ بہت کم ہے کیونکہ اس کی فہم و ظرفیت بہت کم ہے اور وہ عالم چونکہ زیادہ ظرفیت رکھتا ہے،اس کا گناہ زیادہ اور اس کی سزا سخت تر ہوگی، اس لحاظ سے ایک روایت میں آیا ہے... ''یغفر للجاھل سبعون ذنباً قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد...''[1] ''عالم کے

[1] بحار الانوار ،ج۲،ص۲۷

ایک گناہ کو بخش دئے جانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ بخش دئے جاتے ہیں'' جاہل کے گناہ کم ہیں، کیونکہ اس کی فہم و ظرفیت کم تر ہے، بہ فرض محال، اگر امام معصوم کسی گناہ کا مرتکب ہوتو اس کی سزا عام انسانوں کی سزا کے ہزاروں برابر ہے، کیونکہ ان کی ظرفیت زیادہ ہے، امام جب خود پر نظر ڈالتا ہے تو مشاہدہ کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے بندگی، اطاعت اور شائستہ اعمال انجام دیا ہے سب خدا کی طرف سے ہے اور اس کی توفیق سے انجام پایا ہے اور اس سے ضعف کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں بچتی، اور چونکہ وہ اپنے ضعف کو زیادہ دیکھتا ہے، اس لئے، دیگر لوگوں سے شرمندہ تر ہے، یہ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے بیانات کے بارے میں ایک توجیہ تھی۔

اگر انسان کے چشم و دل کھل جائیں اور حقائق کو بیشتر ملاحظہ کرے تو وہ درک کرے گا کہ خدا کے سامنے کتنا ضعیف اور کمزور ہے، احساس کرے گا کہ اسے خود پر ناز نہیں کرنا چاہیے، اسے اپنے آپ کو دیکھ کر خود خواہی کو پہچاننا چاہیے، کیا وہ نجس پانی کے ایک قطرہ سے زیادہ تھا، کہ اب اس مرحلہ پر پہنچا ہے؟ اب جبکہ رشد و تکامل اور ترقی کے مرحلہ پر پہنچا ہے، جو کچھ رکھتا ہے کیا وہ اس کا اپنا ہے تاکہ اس پر ناز کرے؟ پس حقیقت میں اگر ہم اپنے آپ پر نظر ڈالیں تو یقیناً خود کو حقیر دیکھیں گے، یہ نفاق ہے کہ انسان ظاہر میں اور زبان پر یہ کہے: میں سب سے حقیر اور چھوٹا ہوں اور دل میں خود کو دوسروں سے برتر سمجھے، ہمیں دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے حقیر اور چھوٹا سمجھنا چاہیے اور یہ توفیق الٰہی اور اس کی طرف سے عنایت کے لئے نور معرفت کے علاوہ کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتا، امید رکھتا ہوں خدائے متعال ہمیں یہ معرفت اور اس سے بالاتر معرفت عنایت فرمائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں حقیقی ایمان کا نتیجہ: حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

''یا اباذرَ! لا تصیب حقیقۃ الایمان حتیٰ تری الناس کلھم حمقیٰ فی دینھم عقلاء فی دنیا ھم'''' اے ابوذر! ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچوگے، مگر یہ کہ لوگوں کو اپنے دین میں احمق اور اپنی دنیا میں عاقل پاؤ گے'' اے ابوذر! جب حقیقت ایمان کو درک کرو گے اور دیکھو گے کہ لوگ اپنی دنیا میں ترقی کر رہے ہیں اور مختلف کام انجام دے رہے ہیں، تو جان لینا کہ وہ اپنی دنیا کے بارے میں عاقل

ہیں اور فہم و شعور رکھتے ہیں، لیکن وہ اپنی آخرت کے بارے میں کافی نادان اور احمق ہیں۔ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کینصیحتوں میں ''کلھم ''کی تعبیر آئی ہے،یعنی سب لوگ ایسے ہیں، کیونکہ جو لوگ اپنی آخرت کے بارے میں عاقل ہیں، بہت کم ہیں اور خالص ہونے کے مانند نایاب ہیں،اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے میں،

جو اپنی آخرت کے بارے میں احمق ہیں قابل توجہ تعداد نہیں ہے)عاقل وہ ہے کہ اگر اسے مفید و مفید تر کے درمیان انتخاب کرنا ہو، تو وہ مفید کاانتخاب کرے،اگر ہم دنیا کا آخرت سے موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت، دنیا کی نسبت کئی گنا زیادہ فائدہ مند اور مفید تر ہے، کیونکہ مدت اور وسعت کے لحاظ سے بھی لامتنا ہی ہے، انسان کی دنیوی عمر ۷۰، سے ۸۰، سال یا حد اکثر ۱۰۰، سے زیادہ نہیں ہے، حتی اگر ہم فرض کریں کہ انسان کی عمر ہزار سال کی ہوجائے، پھر بھی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے اور کیفیت کے لحاظ سے بھی دنیوی لذت، دسیوں مشکلات اور محنتوں کے بعد ہاتھ آتی ہے اس کے باوجود مشکلات اور سختیوں سے ملی ہوئی ہوتی ہے البتہ ہم نے رنج و آلام سے ایسا انس پیدا کیا ہے کہ اسی تھوڑی لذت وہ بھی رنج والم سے مخلوط شدہ پر قناعت کرتے ہیں، کھانا کھانے سے جولذت ہم پاتے ہیں اس کے لئے کس قدر محنت کرنا پڑتی ہے، پیسے پیدا کریں ان سے غذا خرید لیں پھر اس غذا کو چباتے وقت ہمارے جبڑوں میں تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے،یہ سب رنج و مشکلات اس لئے ہے کہ غذا ہمارے منہ سے نیچے اترے اور ہم تھوڑی سی لذت پائیں! پھراس کے بعد تھکاوٹ اور سستی ہم پر طاری ہوتی ہے، لیکن اخروی لذت، رنج و تھکاوٹ کا سبب نہیں ہے، نہ اس کو آمادہ کرنے میں انسان کو محنت کرنی ہے نہ اس کو مصرف کرنے میں اور نہ استفادہ کرنے کے بعد تھک جاتا ہے'':لا یمسّنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب'' (فاطر، ۳۵) ''جہاں نہ کوئی تھکن ہمیں چھوسکتی ہے اور نہ کوئی تکلیف ہم تک پہنچ سکتی ہے۔ ''آخرت کیفیت کے لحاظ سے بھی دنیا سے برتر ہے اور کمیت کے لحاظ سے بھی دنیا سے بے انتہا اور برتر ہے: ''والآخرۃ خیر وابقیٰ ''(اعلیٰ،۱۷) ''جبکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ''آخرت کی دنیا پر ناقابل تصور برتری کے پیش نظر، ان دونوں کا موازنہ کر کے عقل ان میں سے کس کو اختیار کرے گی؟ یقیناً عقل آخرت کا انتخاب کرے گی، لیکن لوگوں میں بہت

کم ایسے لوگ ہیں جو اس قسم کا موازنہ کرکے اس پر عمل کریں، چونکہ اکثر لوگ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچتے ہیں، لیکن جو حقیقت ایمان تک پہنچے ہیں وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے علاوہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ اپنی دنیا کے بارے میں عاقل ہیں، لیکن آخرت کے بارے میں جاہل ہیں: انہوں نے امور کے بارے میں نفع و نقصان کی اچھی طرح تشخیص دیتے ہیں اور اپنے مادی منافع کے بارے میں آگاہ ہیں، لیکن آخرت کے بارے میں کسی قسم کی معرفت نہیں رکھتے ہیں،وہ یقین نہیں کرتے ہیں کہ آخرت بھی ہے اور وہ دنیا سے بہتر ہے۔

شاید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا راز اس میں مضمر ہو کہ جب مومن اس یقین پر پہنچتا ہے کہ اکثر لوگ اپنے دین میں جاہل و احمق ہیں، تو اپنی زندگی سلسلہ میں ان کی پیروی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اپنے راستہ کو ان سے جدا کرلے گا، کوشش کرے گا کہ آخرت کے بارے میں دوسروں کی خطاؤں سے عبرت حاصل کرے اور خود حقیقت کی راہ کو طے کرے، دوسری جہت سے دنیا کے بارے میں عقلمندوں کے تجربہ سے دنیا میں استفادہ کرے گا، البتہ دینی قواعد و ضوابط کی رعایت کرتے ہوئے۔

دوسرا درس

اعمال کے محاسبہ و موازنہ کی اہمیت اور خدائے متعال سے شرم

اعمال کے محاسبہ موازنہ کی اہمیت

خدائے متعال سے شرم '' یا اباذر؛ حاسب نفسک قبل ان تحاسب فھو اھون لحسابک غداً وزن نفسک قبل ان توزن و تجھز للعرض الاکبر یوم تعرض لا تخفی علی اللہ خافیۃ۔ '''' یا اباذر؛ استح من اللہ فانی و الذی نفسی بیدہ لا ازال حین اذھب الی الغائط متقنعاً بثوبی ' استحی من الملکین اللذین معی۔ '' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ محاسبہ اور حیائے الٰہی سے مربوط ہے۔ روایتوں میں من جملہ نہج البلاغہ میں ''محاسبہ نفس'' پر فراواں تاکید کی گئی ہے اور علمائے اخلاق ''محاسبہ'' کو سیر و سلوک اور تہذیب نفس کے لئے ابتدائی مراحل جانتے ہیں '':یا اباذر؛ حاسب نفسک قبل ان تحاسب فھو اھون لحسابک غداً ''''اے ابوذر! اپنے نفس کا حساب لو، اس سے پہلے تمھارے نفس کا حساب لیا جائے تاکہ کل تمھارے لئے محاسبہ آسان ہوجائے۔ '' بالکل یہی مضمون ایک اور روایت میں تکرار ہوا ہے '':حَاسِبوا اَنْفُسَکُم قَبْلَ اَن تُحَاسَبُوا ''''اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، تم اپنا محاسبہ خود کرلو''،جو کچھ دوسری روایتوں میں آیا ہے، اس کے علاوہ اس روایت میں ایک نکتہ کا اضافہ ہوا ہے کہ اس دنیا میں محاسبہ، تمھارے قیامت کے حساب کو سبک اور آسان کرتا ہے۔ محاسبہ، ایک ناقابل اجتناب ضرورت:تمام کارکردگی کا محاسبہ اور جانچ پڑتال بنیادی طور پر ایک ناقابل اجتناب امر ہے اور یہ ہر ایک کے لئے قابل درک و فہم ہے، ہر ایک اپنی زندگی میں حساب و کتاب رکھتا ہے، خاص کر وہ لوگ جو اہل کسب و تجارت ہیں اور ان کا واسطہ سرمایہ، پیسے اور نفع و نقصان سے ہے، ان کے لئے حساب نہایت اہمیت رکھتا ہے، عام طور پر ہر بازاری سال میں ایک بار اپنے حساب کی جانچ کرتے ہیں، تاکہ سالانہ حساب آسان طور پر انجام پائے، اگر تاجر اپنے روزانہ، ہفتگی اور ماہانہ حساب کی جانچ پڑتال انجام نہ دے اور حساب و کتاب کو انبار کرکے رکھدے تو اس کا کام مشکل

ہو جائے گا اور کبھی اس لاپروائی اور بے توجہی کے نتیجہ میں بہت بڑی غلطیاں رونما ہوجاتی ہیں۔بات یہ ہے کہ جس طرح تاجر وقت سے اپنے نفع نقصان کے حساب و کتاب کا خیال رکھتا ہے اور ایک پیسہ کے بارے میں کوتا ہی نہیں کرتا ہے، مومن کو بھی خدائے متعال سے اپنا حساب چکا نا چاہیے، اس سلسلہ میں اسے اپنے نفس کے مکر سے پرہیز کرنا چاہیے کہ نفس اسے فریب نہ دے اور گناہوں کی توجیہ کر کے دقیق محاسبہ انجام دینے میں رکاوٹ نہ ڈالے، اسے اپنی تمام کارکردگی کے مقابلے میں اپنے نفس سے اطمینان بخش جواب حاصل کرنا چاہیے اور اسے اپنی تمام کارکردگی کے مقابلے میں اپنے نفس سے اطمینان بخش جواب حاصل کرنا چاہیے اور اسے اپنے آپ کا ایسے محاسبہ کرنا چاہیے جیسے قیامت کے دن خدا کے ماموراس کا محاسبہ کریں گے۔

اصولی طور پر اگر گناہوں کا محاسبہ وقت پر انجام پائے اور گناہ جمع ہو کر انبار نہ ہوجائیں،تو محاسبہ دقیق ہوتا ہے اور انسان صحیح نتیجہ اخذ کرتا ہے اور کم تر مشکلات سے روبرو ہوتا ہے، یہ ایک رخ ہے اور دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر ہم اپنے گناہوں کے حساب میں تاخیر کر دیں، رفتہ رفتہ انہیں فراموش کردیں گے اور ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ کن کن گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور کتنے گناہوں کا ڈھیر لگ گیا ہے،اس کے علاوہ جب ہم اپنے گناہوں پر توجہ نہیں کرتے، تو ان کی چارہ جوئی کی بھی ہمیں فکر نہیں ہوتی اور اپنے گناہوں کے حجم کے بارے میں باور نہیں کرتے، اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ میں زندگی میں کتنے گناہوں کا مرتکب ہوا ہوں، میں اگر بڑے انصاف سے کام لوں تو کہوں گا ہزار گناہ، جبکہ اگر دقیق حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینے میں ہزار سے زیادہ گناہ کا مرتکب ہوا ہوں! جب ان سارے گناہوں کا ڈھیر لگ جائے گا تو ان کی ایک بہت بڑی تعداد بن جائے گی۔ہم غافل ہیں اور خیال کرتے ہیں چونکہ ہم نے چوری نہیں کی ہے کسی کو قتل نہیں کیا ہے، اس لئے ہمارے گناہ اہم نہیں ہیں، شاید اگر ہمیں گناہ گار کہا جائے تو ہم اعتراض کریں گے ہیں اور کہیں گے: مگر ہم نے کونسا گناہ انجام دیا ہے؟انسان کی فطرت فراموش کار ہے، خاص کر اس چیز کے بارے میں جو اس کے لئے نقصان دہ ہو: علم نفسیات کے بحث میں یہ بھی ہے چونکہ انسان خطاؤں اور گناہوں کی یاددہانی اس کے لئے شرم و حیا کا سبب بنتی ہے اس لئے وہ مائل نہیں ہے کہ ان کی طرف توجہ کرے اور

کوشش کرتا ہے کہ ان خطاؤں کو فراموش کردے، آج کل ماہرین نفسیات نے، فراموش کاری، حوادث و واقعات کو ذہن کے سپرد کرنے میں، یہ کہ انسان کس طرح کی چیز کو فراموش کرتا ہے، فراموشی اور خود کو فراموش کاربنانے میں کونسے عوامل موثر ہیں اور یہ کہحوادث اور واقعات کو ذہن کے حوالے کرنے میں کون کون سے عوامل کا رفرما ہیں،بہت زیادہ بحث کی ہے،افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ ان موضوعات میں جانچ پڑتال ہمارے دین و دنیا کی مصلحت میں انتہائی اہم ہیں ہم نے اس بارے میں کوئی کام نہیں کیا ہےاور دوسروں سے پیچھے ہیں۔

پس، انسان جسے پسند نہیں کرتا، نہیں چاہتا اسے اپنے سے نسبت دے، نفسیاتی تحقیقات کے مطابق، انسان ہر جرم و ظلم انجام دینے کے درپے ہے لیکن اپنے گناہ کی توجیہ کرتا ہے، انسان، اس عمل کو انجام دینے کی وجہ سے پیدا شدہ روحی عذاب سے اپنے آپ کو نجات دینے کے لئے گناہ کے انجام کو اپنی ذات سے جدا کرنا چاہتا ہے، دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا ہے، اس لئے کوشش کرتا ہے کہ یا اپنے گناہ کو فراموش کردے یا دوسرے افراد، یا ماحول، یا دنیا، یا شیطان، یا سماجی سسٹم یا کسی دوسرے عامل کے سر تھونپے، اس طرح اپنے آپ اور اپنے عمل کے دفاع کے لئے ''دفاعی میکانزم'' کا سہارا لیتا ہے اور اگر ''دفاعی میکانزم'' سے متوسل ہونا انسان میں تقویت پاگیا اور ہر گناہ کی وہ توجیہ کرنے لگا اور صحیح طور پر اپنے آپ کو مورد سوال قرار نہیں دیا' اور اپنے بارے میں عادلانہ فیصلہ نہیں کیا اور اپنے آپ کو مجرم قرار نہیں دیا تو اس سے بالا تر جرائم کے ارتکاب کا خطرہ موجود ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو گناہ کے تاریخ سے آزاد کیا ہے اور اب اس سلسلہ میں رنج والم نہیں رکھتا ہے تاکہ گناہ کے بُرے انجام سے ڈرے،یہی وہ جگہ ہے جہاں پر گناہ کی توجیہ اور اس کا خطرہ خود گناہ سے بیشتر ہے۔ چونکہ انسان حب نفس رکھتا ہے، اس کے علاوہ لوگوں کے پاس محترم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے پاس بھی سربلند ہونا چاہتا ہے، وہ نہیں چاہتا اپنی نظر میں شرمساراور خود کو ناقص دیکھے۔ وہ کمال وعزت کا مالک بننا چاہتا ہے،اس لئے جو اس کے لئے نقص و تنزل کا سبب بنے اسے اپنے ذہن سے فراموش کرتا ہے، کیونکہ اس کی یاد اپنے پاس حقیر و پست ہونے کا سبب بنتی ہے اور یہ

انسان کی فطری چاہت کے خلاف ہے، اس نکتہ کے پیش نظر اگر اس دوران ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو انسان کو ان نواقص، کوتاہیوں اور انحرافات کی یا ددہانی کرائیں، تو ایک بُرا انجام اس کے انتظار میں ہے جو اسے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر دے گا، اس لئے، نامناسب کردار کی یاد دہانی اور ان کی تلافی کی تلاش کے لئے عوامل کی منصوبہ بندی کے طور پر روایتوں میں بہترین شیوہ منتخب کیا گیا ہے اور علمائے اخلاق نے ان روایتوں کے پیش نظر اپنی کتابوں جیسے: معراج السعادۃ، جامع السعادات، اور احیا العلوم میں، تہذیب و تزکیہ نفس اور سیر و سلوک کے متلاشیوں کے لئے ''مشارطہ''، ''مراقبہ'' اور ''محاسبہ'' نام کے تین مرحلے بیان کئے ہیں۔

الف) ۔ مشارطہ صبح کے وقت جب انسان نیند سے اٹھتا ہے، اسے توجہ کرنی چاہیے کہ ایک نیا سرمایہ اس کے اختیار میں قرار پایا ہے: اگر ہم نیند سے بیدار نہ ہوتے اور ہماری روح ہمیشہ کے لئے ہمارے بدن سے پرواز کر کے چلی جاتی تو کیا یہ ہماری زندگی کا خاتمہ نہ ہوتا؟ (اللّٰہ یتوفی الا نفس حین موتھا والتی لم تمت فی منا مھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجلٍ مسمی ان فی ذٰلک لآیات لقوم یتفکرون[1]) ''اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کی روحوں کی بھی نیند کے وقت طلب کرلیتا ہے اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کرلیتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک مقررہ مدت کے لئے آزاد کر دیتا ہے، اس بات میں صاحبان فکر و نظر کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں'' پس، نیند سے ہم نے موت کے ایک مرحلہ کو طے کیا ہے اور مردے کے مانند کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے، اب اگر ہم دوبارہ نیند سے اٹھے ہیں، تو ہمیں دوبارہ زندگی عنایت ہوئی ہے اور ایک نیا سرمایہ ہمارے اختیار میں قرار پایا ہے، پس ہمیں اس نئی زندگی کے لئے خدا کا شکر بجالانا چاہیے، اپنے نفس کو مخاطب قرار دے کر اسے کہدیں: اے نفس! خدائے متعال نے اس قیمتی سرمایہ کو تیرے اختیار میں قرار دیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ آخرت کی سعادت حاصل کرو، اگر تم سے لغزش رونما ہوجائے، تو اپنے سرمایہ کو تم نے کھو دیا اور نقصان

---

[1] زمر، ۴۲

سے دوچار ہو جاؤ گے۔ ہمیں اپنے نفس سے شرط کرنی چاہیے اور اس سے عہد و پیمان لینا چاہیے کہ گناہ کے پیچھے نہ پڑے اور اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جائے جو غضب الٰہی کا سبب بنے، ہمیں اس سے عہد و پیمان لینا چاہیے کہ اس گراں بہا سرمایہ کو ایک ایسی راہ میں خرچ کرے جو خدا کی خوشنودی اور انسان کی سعادت کا سبب بنے، کیونکہ خدا کی خوشنودی سے انسان کو سعادت ملتی ہے اور اگر خدا راضی نہ ہو، تو انسان سعادت تک نہیں پہنچ سکتا، ہمیں اپنے نفس سے شرط کرنی چاہیے کہ واجبات اور احکام الٰہی کو انجام دینے میں کوتاہی نہ کریں اور ہر نیک کام جو اس کے لئے ممکن ہے، اسے ترک نہ کریں۔

بہتر ہے یہ 'مشارطہ'' صبح کی نماز اور اس کی تعقیبات کے بعد انجام پائے اور انسان اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہے: اے نفس! میرے پاس ان چند دنوں کی عمر کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں ہے اور اگر یہ میرے ہاتھ سے چلا جائے تو میرا سرمایہ برباد ہوگا، اے نفس! خدائے رحمن نے آج بھی مجھے مہلت دیدی ہے، اگر میں آج مر چکا ہوتا، تو میں آرزو کرتا کہ خدائے متعال مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجدے تاکہ کچھ زادراہ اکٹھا کر لوں پس اے نفس! تصور کرو کہ تم مر چکے تھے اور دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی تمنا کرتے تھے اور تجھے پھر سے دنیا میں بھیجدیا گیا ہے، پس ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کو ضائع کردو، کیونکہ ہر سانس جو لیتے ہو وہ ایک گراں بہا اور بے نظیر گوہر کے مانند ہے اور اس سے ایک ابدی اور ختم نہ ہونے والا خزانہ اخذ کیا جاسکتا ہے جو ہمیشہ کے لئے آرام و آسائش کا سبب بن سکتا ہے۔

ب) ۔ مراقبہ: مرحلہ مشارطہ کے بعد مرحلہ مراقبہ ہے کہ انسان اپنے ساتھ کی ہوئی شرط کے بارے میں پورے دن کے دوران چوکنا رہنا چاہیے، اور اس پر عمل کرنا چاہیے اور ہر لمحہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ گناہ کا مرتکب نہ ہوجائے، اسے نگراں رہنا چاہیے کہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے یا انحراف و لغزش کا شکار ہو رہا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ اسی تقویٰ کی مراقبت ہے، کیونکہ تقویٰ اقدار الٰہی کا تحفظ اور اعمال کی نگہبانی ہے ایک روایات میں آیا ہے کہ تقویٰ اس کے مانند ہے کہ انسان ایک اندھیری رات میں سانپ اور بچھو سے پُر ایک بیابان میں قدم رکھتا ہے اور ہر لمحہ ممکن ہے سانپ پر قدم پڑے اور اس کے ڈسنے سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے، اب

جس طرح وہ انتہائی دوراندیشی اور احتیاط سے کام لیتا ہے تاکہ سانپ اور بچھو سے رو برو نہ ہو اس طرح انسان کو بھی اپنی زندگی میں پوری دقت اور احتیاط کرنی چاہیے تاکہ شیطان کے خطرہ سے بچ جائے اور جہنم کے عذاب میں مبتلا نہ ہوجائے پس تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے کردار کی فکر میں رہے اور اپنے اعمال کے انجام کو مد نظر رکھے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر ایک شخص نے عرض کیا :اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !مجھے کوئی نصیحت فرمائیں!پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا : اگر میں تجھے نصیحت کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے؟ ہر بار اس مرد نے جواب دیا : جی ہاں، اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : میری نصیحت تیرے لئے یہ ہے کہ اگر کسی کام کو بجالانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس کے انجام کے بارے میں فکر کرو۔ پس اگر اس کام کا انجام اچھا ہے تو اسے بجالاؤ اگر اس کام کا انجام اچھا نہیں ہے اس سے پرہیز کرو۔

نفس کی مراقبت، خدا کی معرفت اور اس یقین کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے کہ خدائے متعال انسان کے اندرونی اسرار سے واقف ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے،اس لحاظ سے کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ انسان کے اس بجالانے کے وقت مراقبت کا محتاج نہ ہو، کیونکہ بندہ، یا خدا کی بندگی اور اطاعت کی حالت میں ہے یا معصیت انجام دینے کی حالت میں، یا مباح کام انجام دینے کی حالت میں ہے، اطاعت و بندگی کے دوران اس کی مراقبت عمل کو کمال بخشنے کے لئے اخلاص وکوشش اور عمل کو آفات سے بچانے کے لئے ادب اور حفاظت کی مراعات کرنا ہے، معصیت کے دوران بندہ کی مراقبت، توبہ، ندامت، شرم اور اس معصیت کی تلافی کے لئے اہتمام کرنا ہے،انسان کے مباح کام میں مراقبت یہ ہے کہ آداب کی رعایت کرے اور ہمیشہ نعمتوں سے استفادہ کرتے وقت منعم کو مدِ نظر رکھے اور ان نعمتوں کے لئے اس کا شکر بجالائے اور بلاؤں کے مقابلہ میں صبر کرے۔

ج)۔ محاسبہ: محاسبہ، تیسرا مرحلہ ہے کہ علمائے اخلاق نے تہذیب نفس کے لئے اس کی تاکید کی ہے۔ محاسبہ، یعنی انسان دن کے خاتمہ پر اپنے ایک روز کی رفتار کی جانچ پڑتال کرے اور دیکھ لے کہ جو فرائض الٰہی اور واجبات اس کے ذمہ تھے، ان پر عمل کیا ہے

یا نہیں، اگر تحقیقات کے بعد معلول ہوا کہ اس نے اپنے الٰہی فرائض بجالائے ہیں اور اس کی روزانہ رفتار حکم شرع کے مطابق تھی، تو اسے خدا کا شکر بجالانا چاہیے کہ اس نے اسے فرائض انجام دینے کی توفیق عنایت کی ہے، چونکہ انجام فرائض انہیں توفیق الٰہی پر ہے، اس توفیق کے لئے شکر بجالانا چاہیے، اس طرح کوشش کرنی چاہیے کہ دوسرے دنوں میں بھی اس صحیح وسالم راستہ پر گامزن رہے ،لیکن اگر اس نے الٰہی فرائض پر عمل نہیں کیا ہے یا انہیں ناقص انجام دیا ہے، اور لغزش و انحراف کا شکار ہوا ہے، تو مستحبات اور خاص کر نافلہ نمازیں پڑھ کر نقائص کی تلافی کرنے کی کوشش کرے اور فرائض الٰہی کو ترک کرنے اور معصیت میں آلودہ ہونے کے بارے میں اپنی ملامت کرے اور استغفار کرے تاکہ خدائے متعال اس کے گناہوں کو بخش دے، اس طرح نیک اعمال کو انجام دیکر اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کی کوشش کرے، اس صورت میں سوتے وقت اس نے اپنا حساب چکا دیا ہے اور کوئی گناہ اس کے لئے باقی نہیں رہتا ہے،یہ وہی محاسبہ ہے جس کی اہل بیت اطہار علیہم السلام اپنے اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے اور علمائے اخلاق نے بھی ائمہ اطہار علیہم السلام کے دستورات کی بنیاد پر دوسروں کو اس کی تاکید کی ہے۔

تہذیب نفس میں محاسبہ کی اہمیت کے پیش نظر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں ''لیس منا من لم یحاسب نفسہ فی کل یوم فان عمل حسناً استزاد اللہ وان عمل سیئاً استغفر اللہ منہ وتاب الیہ''[1] ''جو ہر روز اپنا محاسبہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پس اگر نیک عمل انجام دیا ہے، تو خدا سے اعمال نیک کے زیادہ ہونے کی دعا کرے اور اگر کوئی گناہ اور برا کام انجام دیا ہے تو خدا سے توبہ اور استغفار کرے۔'' پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں ''الا انبئکم باکیس الکیسین و احمق الحمقیٰ؟ قالوا: بلی یارسول اللہ، قال: اکیس الکیسین من حاسب نفسہ و عمل لما بعد الموت، و احمق الحمقیٰ من اتبع نفسہ ہواہ و تمنی علی اللہ الامانی۔''[2] ''کیا تمھیں عاقل ترین عاقلوں اور نادان ترین نادانوں کی خبر دیدوں؟ اصحاب نے کہا: جی ہاں، یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عاقل ترین انسان وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اپنے مرنے کے بعد

---

[1] اصول کافی ''باترجمہ'' ج۴ص۱۹۱
[2] بحار الانوار ،ج۷۰ص۶۹

کے لئے عمل کرے اور احمق ترین انسان وہ ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کا غلام ہو اور ہمیشہ اپنی آرزؤں کے بارے میں خدا سے درخواست کرے ۔''حاسبہ نفس کا فائدہ: محاسبہ نفس کے جملہ فوائد میں سے یہ ہے کہ جب انسان اپنی خطاؤں اور لغزشوں کے بارے میں آگاہ ہوجاتا ہے تو فوراً اس کی تلافی کرتا ہے اور اس کے آثار کو اپنی روح میں باقی رہنے نہیں دیتا ۔ اگر انسان اپنا محاسبہ نہ کرے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنے گناہ کئے ہیں اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ صبح سے شام تک کتنے نیک کام اور کتنے بُرے کام انجام دیئے ہیں اور کہاں پر خطا اور لغزش کے مرتکب ہوئے ہیں؟ ہم نہیں جانتے۔ لیکن جب ہم اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کی ہمت کریں، اپنے ایک ایک کام کو یاد کریں تو معلوم ہوتا ہے۔

کہ ہمارے اعمال میں سے کس قدر صحیح تھے اور کس قدر غلط۔ جب انسان اپنے گناہوں کی طرف توجہ نہیں کرتا، تو وہ گناہ اس کی روح میں اثر ڈالتے ہیں اور ہر گناہ کے نتیجہ میں اس کے دل میں ایک سیاہ داغ نمودار ہوتا ہے، یہاں تک گناہوں کی افزائش کی بنا پر یہ سیاہی اس کے پورے دل کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور ممکن ہے اس میں کوئی نور انی نقطہ باقی نہ رہے۔ یہ مطلب بعض روایتوں کا مضمون ہے، من جملہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں'': اذا اذنب الرجل خرج فی قلبہ نکتۃ سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت حتی تغلب علی قلبہ فلا یفلح بعدھا ابدا[۱] '' ''جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے، اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر وہ توبہ کرے تو یہ داغ زائل ہوجاتا ہے اور اگر اس گناہ کے بعد اور بھی گناہ انجام دے تو وہ سیاہ داغ بڑھتا ہے یہاں تک اس کے پورے دل پر پھیلتا ہے اور وہ شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا''۔ بعض اوقات انسان غافل ہوتا ہے، جس وقت متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں نے اس کے دل پر غلبہ کرلیا ہے، اور اس وقت کی اپنی موجودہ حالت کا پچھلے سال کے ساتھ موزانہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوچکی ہے، بعض لوگ جو ایک مدت سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہیں، اپنے ذہن کردار اور اخلاق میں ایجاد شدہ تنزل کے پیش نظر مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے آپ سے کہتے

---

[۱] اصول کافی ''باترجمہ'' ج۳ص۳۷۳

ہیں: اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہم بلند حوصلہ اور نورانی دل کے مالک تھے، یہ کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ہمارے وہ حوصلے کمزور ہوگئے؟ بعض لوگ اس تنزل کو علم کے سر تھو پتے ہیں اور تصور کرتے کہ علم حاصل کرنا ان کے دل کی تاریکی کا سبب بنا ہے۔ ایسے لوگ یہ باور کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ ان کے گناہ ان کے معنوی حوصلوں کے تنزل اور دل کے سیاہ ہونے کا سبب بنے ہیں۔ یقیناً علم حاصل کرنا انسان کے قابل قدر کاموں میں سے ہے، اگر چہ کبھی انسان کے یہی اچھے کام بہت سے عیب کے حامل ہوتے ہیں جن کا سر چشمہ انسان کی کمزوری اور لاپروائی ہوتی ہے۔

یہ ایک قسم کی خود فریبی ہے کہ جب انسان علم حاصل کرتے ہوئے تھک جاتا ہے یا امید نہیں رکھتا ہے کہ وہ کہیں پہنچ پائے گا، یا درس پڑھنے کو اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق نہیں پاتا ہے، بلکہ اسے اپنے تنزل کا حامل تصور کرتا ہے اور کہتا ہے، درس پڑھنا ہی میرے دل کے سیاہ ہونے کا سبب بنا ورنہ جب میں نے درس پڑھنا شروع کیا تھا، اس وقت میرا دل پاک تھا، صحیح ہے کہ ابتدا میں ہمارا دل پاک تھا اور اب تاریک ہوگیا ہے، لیکن کلی علت ہمارا درس پڑھنا نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب صحیح طور پر درس نہ پڑھنا ہے، اس کا سبب گناہ اور تہذیب نفس اور اصلاح کے بغیر علم حاصل کرنا ہے۔

جی ہاں، جب انسان محاسبہ نہیں کرتا ہے، تو گناہ کے واقعی اور تکوینی آثار نابود نہیں ہوتے ہیں اور اس کے دل کو تاریک کر ڈالتے ہیں اور وہ متوجہ نہیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سفید لباس پہنتا ہے اس پر داغ لگ جاتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے یہ نہیں دیکھتا ہے کہ اس کے لباس پر داغ لگ گیا ہے اور وہ لباس گندہ اور کثیف ہوگیا ہے، یقینا، داغ زیادہ ہونے سے وہ لباس اس قدر آلودہ اور نفرت انگیز ہوجاتا ہے کہ ہر دیکھنے والا اس سے متنفر ہوتا ہے، لیکن خود انسان اس سے بے خبر ہوتا ہے، کیونکہ اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں! محاسبہ نفس سے دوری کا سب سے بڑا عیب اور نقصان یہ ہے کہ گناہ کے اثرات دل پر باقی رہتے ہیں اور انسان دن بہ دن آلودہ ہو کر اس کا دل سیاہ اور تاریک ہوجاتا ہے اور خدا سے بیشتر دور ہوتا رہتا ہے، لیکن خود متوجہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ خیال کرتا ہے وہ ایک شائستہ اور اچھا انسان بن گیا ہے اور اپنے آپ پر ناز کرتا ہے کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں، جبکہ ہر روز

تنزل کی منزلیں طے کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں شقاوت و بد بختی سے دو چار ہوتا ہے :(قل ھل ننبئکم بالأ خسرین اعمالاً ۔ الذین ل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً) [۱] ''پیغمبر!کیا ہم آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اطلاع دیں جو اپنے اعمال میں بد ترین خسارہ میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش زندگانی دنیا میں بہک گئی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔ ''علامہ طبا طبائی اس آیۂمبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں '': جو کسب معاش نفع کمانے کے لئے انجام پاتا ہے، اس میں خسارہ و نقصان اس وقت پیش آتا ہے جب کسب معاش کا مقصد حاصل نہ ہو یا سرمایہ کم ہو یا انسان کی کوشش ناکام ہوجائے۔ آیۂ شریفہ میں کوشش کے ضائع ہونے یا سعی کے نابود ہونے کی تعبیر کی گئی ہے، جیسے کہ انسان راستہ کو گم کرکے سفر کو جاری رکھنے کے باوجود مقصد تک نہیں پہنچتا ہے۔

بعض اوقات انسان کا کسب معاش میں نقصان اٹھانا اس کے کام میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوتا ہے یا طریقہ کار سے بے خبری یا دوسرے ناخواستہ عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ نقصان اور ضرر، ممکن ہے دور ہوجائے، کیونکہ امید کی جاتی ہے کہ نقصان اٹھانے والا بیدار ہوجائے اور کام کو پھر سے شروع کرے اور کھوئی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پاکر نقصان کی تلافی کرے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نقصان اٹھاتا ہے اور خود تصور کرتا ہے کہ اسے فائدہ ہوا ہے! وہ ضرر کرتا ہے لیکن معتقد ہے کہ نفع کے علاوہ اسے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ یہ بدترین نقصان و خسارہ ہے جو ناقابل تلافی ہے۔

دنیا میں انسان کا فریضہ، صرف سعادت کے لئے کوشش کرنا ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی اور خواہش نہیں ہونی چاہئے۔ اگر وہ حق کی راہ میں گامزن ہوکر مقصد کو حاصل کرلے تو وہ حقیقی سعادت تک پہنچ گیا ہے، لیکن اگر وہ حق سے منحرف ہوگیا اور اپنی غلطی اور انحراف کی طرف متوجہ نہیں ہوسکا، تو اس نے اپنی سعی و کوشش میں نقصان اٹھایا ہے لیکن اسے نجات کی ایک امید ہے۔ ہاں اگر وہ حق کے راستہ سے منحرف ہوگیا اور باطل کو پاکر اس پر مصر رہا اور اگر حق کی ایک کرن اس کے لئے ظاہر ہوئی، لیکن اس

---

[۱] کہف ۱۰۲و۱۰۳ازز

کے نفس نے اس پر پردہ ڈال دیا اور اسے بزرگ بینی اور جاہلانہ تعصب میں مبتلا کردیا تو اس قسم کا شخص عمل و کوشش میں بدترین نقصان اٹھانے والا ہے، کیونکہ اس کے نقصان و خسارہ کے بر طرف ہونے کی کوئی امید نہیں ہے اور توقع نہیں ہے کہ وہ سعادت حاصل کر سکے۔ یہ وہی نکتہ ہے کہ خدائے متعال اس آیۂ شریفہ میں بیان فرماتا ہے[1]۔ جیسے کہ اس سے پہلے کہا گیا، محاسبہ نفس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ انسان اپنی خطاؤں کے بارے میں متوجہ ہوتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ گناہ کے تکوینی آثار کو اپنی روح میں باقی رہنے نہیں دیتا تاکہ اس کے تنزل کا سبب بنے۔ اس حقیقت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو لازم وملزوم تعبیروں سے بیان فرمایا ہے۔

پہلے فرمایا: ''حاسب نفسک قبل ان تحاسب'' اس کے بعد فرمایا: ''فھوا ھون لحسابک غداً'' اس سے پہلے کہ تمھارا محاسبہ کیا ائے، خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرلو کیونکہ یہ محاسبہ تمھارے قیامت کے حساب کو آسان کر دے گا۔ کیونکہ اگر تم نے خود اپنے اعمال کا محاسبہ کیا تو تم اپنی خطاؤں اور انحرافات کے علاج کے در پے رہو گے اور اس کے نتیجہ میں تمھاری قیامت کا حساب ہلکا ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا تو گناہوں کا انبار لگ جائے گا قیامت میں مشکل زیادہ ہوگی: تم دنیا میں اپنے گناہوں سے بے خبر ہو اور نہیں جانتے ہو کہ کس قدر پستی میں گر چکے ہو، لیکن جب قیامت کے دن اپنے نامہ اعمال کو پاؤگے اور اپنے بے شمار گناہوں کو دیکھو گے تو اس کی حسرت تمھیں جہنم کے عذاب سے زیادہ رنج والم سے دوچار کرے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں '':وزن نفسک قبل ان توزن و تجھز للعرض الاکبر یوم تعرض لا تخفی علی اللہ خافیۃ'' ''اپنے آپ کو جانچ لو، اس سے پہلے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لئے تجھے جانچا جائے، آمادہ رہنا کہ خدائے متعال سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے'' قیامت کے دن جانچ پڑتال کے بارے میں خداوند متعال فرماتا ہے: (والوزن یومئذٍ الحق[2]) ''اس (قیامت) دن اعمال کا وزن ایک برحق شئے ہے۔'' اعمال کا موازنہ اور ناپ تول

[1] المیزان، ج۳ص۴۳۰
[2] اعراف۸

ہمارے اعتقاد میں سے ہے۔ اعمال کی پڑتال، ان کے موازنہ اور کم وزیاد سے مربوط ہے، اب اگر ہم اپنے اعمال کے بارے میں خود جانچ پڑتال کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے گناہ بہت سنگین ہوگئے ہیں تو اپنے بوجھ کو ہلکا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کیا، اپنے گناہوں اور ہماری روح پر ان کے اثرات کے بارے میں توجہ نہ کی، تو ہم الٰہی میزان کے حاضر کئے جانے کے دن رسوا ہوں گے اور کف افسوس ملیں گے۔ پس، جو اپنے اعمال کا محاسبہ کرے گا، جس دن اس کے تمام مخفی و آشکار اعمال خدا کے سامنے پیش کئے جائیں گے تو وہ ہلکا ہو گا، کیونکہ اس نے اپنے گناہ اور اخلاقی کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ لیکن جس نے اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کیا ہے، خدا کے سامنے اس کے اعمال پیش کرنے کے دن جس دن انسان کے تمام چھوٹے بڑے اعمال آشکار ہوں گے حسرت کھائے گا۔

قیامت کے دن حسرت سے دو چار نہ ہونے کے لئے، آج ہی سے کوشش کرنی چاہئے اور اپنے اعمال کو اپنے سامنے ہمہ وقت مجسم رکھنا چاہئے، تصور کیجئے کہ آپ کی زندگی اختتام کو پہنچ چکی ہے چونکہ کوئی مطمئن نہیں ہے کہ وہ کل تک زندہ رہے گا یا نہیں اور تمہارے اعمال خدا کے حضور میں پیش کئے جائیں گے۔ دیکھیے کہ خدائے متعال کو کیا پیش کر رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں کیا حال رکھتے ہیں۔ جب ائمہ اطہار علیہم السلام اپنی مناجات میں ''عرض اکبر'' کے دن جس دن انسان کے اعمال خدا کو پیش کئے جاتے ہیں سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں، مناسب ہے اس دن خطرناک و مہلک ترین عذابوں کا دن ہے کہ حسرت میں مبتلا نہ ہونے کی تلافی کریں تاکہ وہ ہمارے نامۂ اعمال کی کتاب سے مٹ جائیں۔ بُرے اعمال کا نتیجہ، شرمندگی: یقیناً جب خدا کے حضور اعمال کے پیش کئے جانے کی گفتگو کی جاتی ہے تو، خدا سے شرم و حیا کی بحث بھی پیش آتی ہے۔ جب انسان کوئی بُرا کام انجام دے یا کسی ظلم کا مرتکب ہوجائے اور اسے فراموش کردے، اور اس کے یہاں کوئی فرق نہ آئے اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو یہ اس لئے ہے ہم ضعیف ہیں اور حقائق کو صحیح درک نہیں کر سکتے، مزید اس لئے کہ تدریجاً حقائق کو درک کریں، ایک محسوس امر کی مثال پیش کرتے ہیں: فرض کیجئے عرصہ سے دو آدمی آپس میں دوست تھے اور یہ عہد کر چکے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کریں گے۔ اب

اگر ان دو میں سے کسی ایک نے اپنے دوست کے ساتھ ظلم کیا، اگر اس کا دوست اس کے ظلم سے بے خبر تھا یا اسے بھول گیا ہو، جب اپنے دوست سے ملتا ہے تو اس کا برتاؤ بالکل عادی ہے، لیکن اگر وہ دوست ظلم کی اور خیانت کی ویڈیو یا فوٹوگرافی بنا لے، اور ایک مدت کے بعد اسے دکھا کر کہے: تم نے میرے ساتھ عہد وپیمان کیا تھا کہ مجھ پر ظلم نہ کرو گے، اس قدر دوستی کا دم بھرتے تھے، پس کیوں تم نے میرے ساتھ یہ ظلم کیا اور خیانت کی؟ یہاں پر ظالم کے لئے ایک ایسی شرم و حیا پیش آتی ہے، جو تمام عذاب اور جسمانی اذیت سے سخت ہوتی ہے۔

وہ ایک تو ایک ظلم کا مرتکب ہونے کے بعد زمانۂ ظلم کو فراموش کر چکا تھا اور یقین نہیں رکھتا تھا اس کا دوست اس واقعہ سے خبر دار ہوگا، اگر اس کا دوست اس ظلم کے منظر کی تصویر اسے دکھادے، تو اس کا کیا حال ہو گا؟ ہم نے دنیا کے اعمال پیش کرنے کے لئے، ظلم کی تصویروں کی نمائش کی مثال پیش کی، لیکن قیامت کے دن خود اعمال حاضر ہوتے ہیں۔ اگر چہ ہماری عقل حضور اعمال کے مجسم ہونے کی کیفیت کو درک نہیں کر سکتی ہے، لیکن ہمارے مذہبی اعتقادات کی بنا پر، اعمال کا مجسم ہونا ثابت ہو چکا ہے: (....ووجد واما عملوا حاضرا[۱]) ''اور سب لوگ اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے'' اس آیۂ شریفہ میں خدائے متعال صاف الفاظ میں عین عمل کے حاضر ہونے کو بیان فرماتا ہے اور آیت کی دوسری صورت میں تفسیر نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیگر آیات بھی اعمال کے مجسم ہونے کو بیان کرتی ہیں، من جملہ: (یوم تجد کل نفسٍ ماعملت من خیر محضراً وما عملت من سوءٍ[۲]) ''اس دن کو یاد کرو جب ہر نفس اپنے نیک اعمال کو بھی حاضر پائے گا اور اعمال بد کو بھی۔'' حتی اگر قیامت کے دن، انسان کو اس کے اعمال کی تصویریں دکھائیں، تب بھی وہ انکار نہیں کر سکتا ہے۔ چہ جائے کہ اسے عین اعمال یا ان کی تصورت دکھائے جائے گی: فلاں گھڑی یا فلاں رات کو تم نے ایسا کیا ہے، اس وقت جب خدا کے حضور حاضر ہوا ہے، اس پر ایک ایسی شرم طاری ہوگی جو تمام عذاب سے سخت ہے۔ انسان کو محشر کی یاد ذہن میں تازہ کرنے کے لئے اور خدا کے سامنے اس کے اعمال پیش کئے جانے کو اپنے

---

[۱] کہف، ۴۹
[۲] آل عمران، ۳۰

سامنے مجسم کرنا چاہئے، یا اگر اس دنیا میں کسی رسوائی سے روبرو ہوا ہے، تو اسے اپنے سامنے مجسم کرے، مثال کے طور پر کبھی پوشیدہ طور پر ایک بڑا کام انجام دے رہا تھا، اچانک ایک بچہ آکر اسے رنگے ہاتھوں پکڑلے۔ شاید اس قسم کی روداد ہر ایک کے لئے پیش آئی ہوگی کہ دائیں بائیں توجہ کئے بغیر کسی بُرے کام میں مشغول تھا اور اچانک معلوم ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے موقع پر انسان اس قدر شرمندہ ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے لئے زمین دھنس جائے اور زندہ دفن ہوجائے، اب اگر دیکھنے والا بچہ نہ ہو اور عاقل و باشعور ہو یا اس شخص پر کوئی حق رکھتا ہو اور وہ ناپسند کام اس کے حق میں خیانت حساب ہوتا ہو تو اس کی بات ہی جدا گانہ ہے۔اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے وہ خدا کی طرف سے ہے ہر نامناسب عمل خدائے متعال سے خیانت ہے۔

اگر انسان صحیح طور پر سوچ لے، تو اسے معلوم ہوگا کہ صاحب حق کے حضور میں اس کا گناہ انجام دینا اس کے ساتھ خیانت تھی۔ اسے معلوم ہوگا کہ جس کی وہ معصیت اور نافرمانی کرتا ہے، اس گناہ کو انجام دینے میں بھی اس کی ہستی اور قدرت اس کی طرف سے ہے۔ سانس لینے اور بات کرنے کی طاقت جو کچھ ہم رکھتے ہیں، اس کی طرف سے ہے۔ اس نے یہ سب نعمتیں اور توانائیاں ہمیں عطا کی ہیں تاکہ تکامل وترقی کی راہ میں اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان سے استفادہ کریں، کتنی شرم ناک بات ہے کہ ہم خدا کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی، معصیت، اس سے دوری اور اس سے خیانت کے لئے استفادہ کریں!مذکورہ بیان کے پیش نظر، اگر انسان کسی رات کو چند لمحہ اپنے نفس کے محاسبہ کے لئے مخصوص کرلے اور اپنے سامنے مجسم کرے کہ اس نے اس خدا کے سامنے گناہ انجام دیا ہے، جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں۔ یقیناًیہ محاسبہ اور توجہ کہ خدا کے حضور میں گناہ انجام دیا ہے، گناہ میں تخفیف کا سبب بنتا ہے۔ حتی اگر توبہ نصوح بھی نہ کرے جو تمام گناہوں کو نابود کردیتی ہے، یہی شرمندگی کا احساس گناہ کے بوجھ کو تھوڑا سا کم کرتا ہے اور گناہ کے پھیلنے اور اس کے آثار کے باقی رہنے کو روکتا ہے، اور اس کے بعد انسان آسانی کے ساتھ مرتکب گناہ نہیں ہوتا ہے۔ اب اگر یہ تصور کہ وہ ہروقت خدا کے سامنے ہے، تنبیہ و توجہ کی حالت میں اس کے لئے ملکہ اور عادت بن جائے تو پھر وہ کبھی گناہ نہیں

کرے گا۔ شرم و حیا کا مفہوم اور اس کی حد:اعمال کا خدا کے حضور پیش ہونے اور شرم وحیا کے بارے میں مذکورہ بیانات کے ضمن میں حضرت رسول صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کے دوسرے حصہ میں مسئلہ حیا کے بارے میں بیان فرماتے ہیں ''یا اباذر؛ استح من اللّٰہ فانی والذی نفسی بیدہ لا ازال حین اذھب الی الغائط متقنعاً بثوبی استحی من الملکین اللذین معی'' ''اے ابوذر! خدائے متعال سے حیا کرو، اس خدا کی قسم جس کے اختیار میں میری جان ہے، جب میں بیت الخلا میں جاتا ہوں، اپنے ہمراہ دو فرشتوں سے شرم کی وجہ سے اپنے سر اور چہرے کو چھپاتا ہوں ''،شرم و حیا کا مسئلہ انتہائی اہم ہے، افسوس کہ اس کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، دشمنوں کے ثقافتی نفوذ کے نتیجہ میں، شرم و حیا کے بارے میں ہمارے لئے فکری مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔

اس لحاظ سے مناسب ہے اس موضوع پر کچھ تحقیق انجام دی جائے۔ اگر چہ ہم چاہتے ہیں اس فرصت میں موعظوں کے بیان پر اکتفا کریں، شاید ان مباحث کو بیان کرنے کے لئے جلسہ میں آمادگی نہ ہو، لیکن اس مسئلہ کی فکری بنیاد کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں: ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی تہذیب میں، شرم و حیا اقدار میں شمار ہوتی ہے اور گستاخی، بے شرمی نا ہمواری اقدار کے مقابل میں اس کی ضد شمار ہوتی ہے۔ پہلے جب کسی کو بُرا بھلا کہنا چاہتے تھے، تو اسے کہتے تھے: گستاخ، کیونکہ کلمۂ گستاخ گالی محسوب ہوتا تھا۔ اگر اس سے غلیظ اور عظیم گالی دینا چاہتے تو کہتے تھے: بے شرم! بے شرم بہت بڑی گالی تھی، یہ ہماری تہذیب ہے۔ لیکن آج مغربی تہذیب اور کفر کی دنیا شرم و حیا کو عیب جانتے ہیں۔آج جس مسئلہ کا، علم نفسیات، فلسفہ اخلاق اور تعلیم و تربیت میں فراوان استفادہ ہوتا ہے وہ مسئلہ شرم اور بے حیائی ہے، کیا علم نفسیات ، اخلاق اور تربیتی اصول کے نقطہ نظر سے انسان کو باشرم یا بے شرم ہونا چاہیئے؟ البتہ جو ہم کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب میں انسانی تہذیب کے برخلاف بے شرمی کی ترویج کی جاتی ہے، اس معنی میں نہیں ہے کہ شرم و حیا کے بارے میں ہمارا تصور اور شیوہ مکمل طور پر صحیح ہے، اس لحاظ سے یہ موضوع قابل بحث و تحقیق ہے اور مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہم انسان میں شرم و حیا کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:انسان میں موجود ہ فطرت کی بنیاد پر، اگر انسان کوئی ایسا کام انجام دے کہ اسے بُرا جانتا ہو، تو اس میں شرم نام کا ایک مخصوص ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اس روحی

تأثر عمل کی پیدائش دو امر پر منحصر ہے: پہلے یہ کہ انسان اسی کام کو برا جانتا ہو، دوسرے یہ کہ اس کی فطرت پامال نہ ہوئی ہو چونکہ انسان کے فطری حالات بہت ہیں، لیکن جب اس نے اپنی فطرت کو پامال کر دیا، تو اس کے فطرت کمزور پڑ گئی اور آہستہ آہستہ نابود ہونے لگی پس، بُرے کام کے مقابل میں شرم کا احساس، ایک فطری امر ہے، لیکن برائی کی شناخت کبھی، عقل کے توسط سے انجام پاتی ہے اور بعض مواقع پر تعلیم و تربیت کے ذریعہ اور بعض مواقع پر انسان محیط (ماحول و معاشرہ) کے تابع ہوتا ہے کہ کس چیز کو بُرا اور کس چیز کو اچھا سمجھے۔ ابتدا میں ماں باپ اپنے بچے کو یاد دلاتے ہیں کہ کونسی چیز بُری ہے اور کونسی چیز اچھی، اب اگر یہ تلقین اور یاد دلانا صحیح انجام پایا ہے تو جب بچہ کسی بُرے کام کا مرتکب ہوجائے اور اسے معلوم ہوجائے کسی دوسرے نے اسے دیکھ لیا ہے، تو وہ فطری جبلت کی بنا پر شرمندہ ہوتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے اور کبھی پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے۔

اس بچے کی طرف سے برے کام کے مقابل قدرتی امر ہے، کیونکہ اس نے اچھے اور بُرے کو تعلیم و تربیت سے سیکھا ہے۔ غلط رسم ورواج کے فروغ پانے کے عوامل: اخلاقی و اسلامی اقدار کے علاوہ بعض آداب و رسوم، محیط اور سماج کی چاہت کے اثر سے یا قوم پرستی اور دوسری قوم اور نسلی شرائط کی وجہ سے ہم میں رائج ہوگئی ہے کہ جن کی بنیاد پر ہم بعض چیزوں کو نیک وبد جانتے ہیں۔ یہ نظریہ شرع سے مربوط نہیں ہے بلکہ ممکن ہے مخالف شرع بھی ہو، مثلاً ہم بُرا جانتے ہیں کہ بچے بڑوں کے سامنے بات کریں، ہم اسے کہتے ہیں؛ چپ ہوجاؤ بُرا ہے، چونکہ اس بچے نے اچھے اور بُرے کو ماں باپ اور اپنے پاس لوگوں سے سیکھا ہے، تصور کرتا ہے فلاں کام بُرا ہے، یہی کہ وہ دیکھتا ہے دوسرے لوگ اس کے کام کے مقابل میں منفی ردِ عمل دکھاتے ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ناپسند رفتار دکھاتے ہیں تو کام کی برائی کو سمجھتا ہے اور اس کو بجالاتے وقت شرم و حیا کا احساس کرتا ہے، سی لحاظ سے بزرگوں کے سامنے بات کرنے کی جرات نہیں کرتا ہے، کلاس میں استاد سے سوال کرنے میں شرماتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے لئے یہ حالت ملکہ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور جتنا آگے بڑھتا ہے اور اس کی عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے پھر بھی بات کرتے وقت اس میں شرم و حیا کی حالت پیدا ہوتی ہے: جب درس خارج میں اعتراض کرنا چاہتا ہے، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی

ہے اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے۔یقیناً شرع پسند نہیں کرتی ہے کہ انسان اپنی بات نہ کہہ سکے اور اگر سوال کرنا چاہتا یا کوئی سچی بات کرنا چاہتا ہو تو اسے بیان نہ کر سکے۔ اس قسم کا غلط تصور عورتوں کے شرم و حیا میں بھی ہے: ہماری تہذیب میں عورت کا سب سے بڑا سرمایہ، شرم و حیا ہے، لیکن اس قیمتی مفہوم کے مصادیق کے بارے میں ہمارے معاشرے میں کچھ بے جا افراط موجود ہیں۔ ایک باشرم اور باحجاب لڑکی کی ایسی تربیت کرتے ہیں تاکہ کسی نامحرم مرد کے سامنے بات نہ کر سکے اور اسے سمجھاتے ہیں کہ یہ عمل شرم و حیا کا انعکاس ہے!اسلام کے نقطۂ نظر سے،ایک عورت کو دوسرے کے سامنے بولنے کی طاقت کو اپنے اندر اجاگر کرنا چاہئے۔

لیکن یہ امر بہت بجا اور پسندیدہ ہے کہ جہاں پر اسے بات نہیں کرنی چاہئے، وہاں پر بات نہ کرے، یا اس کی آواز اس قدر سریلی نہ ہو کہ دوسروں کے جذبات کے مشتعل ہونے کا سبب بنے، لیکن اسے یہ عادت بھی نہیں بنانی چاہئے کہ کبھی نامحرم اس کی آواز نہ سننے پائے۔ حقیقت میں ہم مسائل اور مختلف جوانب کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے ہیں۔اگر دوسروں کے سامنے عورت کا بولنا ناپسند ہوتا، تو حضرت فاطمۂ زہرا سلام اللہ علیہا کیوں مسجد النبی میں وہ شعلہ بیاں تقریر کرتیں؟ یا حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کیوں ابن زیاد کے دربار میں زبانوں کو کھولتیں؟ جنھیں، شرع کہا جاتا ہے: عورت کو ایسے بات نہیں کرنی چاہئے جو دوسروں کو مشتعل اور منحرف کرنے کا سبب بنے اور اس کے بولنے کا انداز شہوت کو ابھارنے کا سبب بنے، ورنہ شائستہ نہیں ہے کہ عورت بولنے کی جرأت نہ رکھے۔بعض مسائل خاص کر اخلاقی و تربیتی اقدار میں ہم بعض افراط اور تفریط سے کام لیتے ہیں کہ جن کے بہت بُرے اثرات رونما ہوئے ہیں۔ یورپیوں نے جب ہمارے افراط کے بُرے اثرات دیکھے، تو انہوں نے ان منفی آثار کو روکنے کی کوشش کی اور وہ تفریط کے شکار ہوگئے اور خود اقدار کو بالائے طاق رکھدیا: ہم نے اپنے بچوں کو شرمیلا بنا دیا تاکہ بزرگوں کے سامنے بات نہ کر سکیں۔ ہم نے عورتوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ مردوں کے سامنے بول نہ سکیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ ایک نامناسب اور غلط کام ہے، تو کہا: بچہ کو ہر کام میں آزاد ہونا چاہئے، عورت کو آزاد ہونا چاہئے اور کسی چیز کی پروا اور شرم نہیں کرنی چاہئے،

حتیٰ اگر مردوں کے سامنے ننگی بھی ہوجائیں۔ ہمارے شرم و حیا کے اس بے جا تصور کا مغرب میں یہ ردِ عمل ہوا کہ انہوں نے حدود و قیود کو بالکل ہی ہٹا دیا ''الجاھل اما مفرط واما مفرط'' ''نادان اور جاہل یا افراط کرتا ہے یا تفریط'' نہ ہم نے اسلام کو صحیح پہچانا ہے اور نہ وہ صحیح راستہ پر چلے ہیں، نہ ہم نے صحیح معنوں میں اسلامی اقدار کا استفادہ کیا ہے اور نہ انہوں نے الٰہی اقدار پر توجہ کی ہے۔ البتہ ان سے توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان کی فکری بنیاد ہی فاسد ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ وہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یورپ میں حتیٰ کلیسا جانے والے معتقد عیسائی بھی معلوم نہیں دین پر اعتقاد رکھتے ہیںیا نہیں، وہ صرف زبان سے دین اور دینی قدروں کے ساتھ دلچسپی رکھنے کا اظہار کرتے ہیں ورنہ وہ حقیقت میں دین کے بارے میں کوئی میلان نہیں رکھتے ہیں۔

لہذا ان سے کسی قسم کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے کیوں اسلام کے حقائق کو نہیں پہچانا اور ان پر صحیح عمل نہیں کیا ہے، تاکہ ان کا صحیح استعمال کر کے اس سے شائستہ استفادہ کرتے اور دوسروں کی مذمت کا نشانہ نہ بنتے۔ گزشتہ مطالب کے پیش نظر ضروری ہے کہ شرم و حیا کے حدود معین ہوجائیں، یہ کہ حیا کا مفہوم کیا ہے اور کہاں پر حیا کی جانی چاہئے اور کہا ں پر شرم و حیا ناپسند اور قابل مذمت ہے؟ یقیناً احساس شرمندگی ہر موقع پر مطلوب نہیں ہے اور ہر کمزوری جو شرم کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے مطلوب نہیں ہے۔ ہمیں اچھے اور بُرے کو پہچاننا چاہئے اور دونوں کو قوی استدلال اور شرع کے مطابق ایک دوسرے سے ہماہنگی چاہئے۔ ہم کیوں بچے سے کہیں کہ بزرگوں کے سامنے بولنا بُرا ہے؟ کیا یہ حکم خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے؟ کیا ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت یہی تھی؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ جی ہاں چیخ پکار کسی کے لئے مطلوب نہیں ہے، البتہ بچہ تدریجاً اور دوسروں کی صحیح تربیت سے سمجھ سکتا ہے کہ اسے ایسے بولنا چاہئے کہ مخاطب سن پائے اور حد سے زیادہ اس کی آواز بلند نہیں ہونا چاہئے، نہ یہ کہ بالکل بات ہی نہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ عورت میں اس قدر جرأت کم ہو کہ دوسروں کے سامنے بات کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو یا اگر عدالت میں اپنا حق ثابت کرنا چاہے یا کسی جگہ پر نہی از منکر کرنا چاہے، تو اس میں قدرت نہ ہو ؟! لہذا، ہمیں خوب اور بد کو اسلامی معیاروں کے مطابق پہچاننا چاہئے، ہمیں جاننا چاہئے کہ اسلام کی نظر میں حقیقت میں خوب و بد کونسی چیزیں ہیں پھر حقیقی بد

کے مقابل میں شرم و حیا مطلوب ہے، نہ کہ ایک سماج اورقوم و ملت یا کسی نسل یا علاقہ کے پیدا کئے گئے رسم و عادت کے سامنے شرم کرنا، یہ شرم و حیا آداب و رسوم کی پیدا وار ہیں، نہ اخلاقی و معنوی اقدار کی۔ آداب و رسوم اگر اسلامی قدروں کی بنیادوں پر ہوں، تو قابل احترام ہیں اور اگرحق اور الٰہی اقدار کے خلاف ہوں تو کے مخالف ہیں۔ اس لحاظ سے، ہمیں اسلام کے احکام پر صحیح عمل اور پیروی کرنے کے لئے، ابتدا میں حقیقی خوب و بد کو پہچاننا چاہئے تاکہ جان لیں کہ کن اعمال اور رفتاروں کے سامنے شرم و حیا کرنی چاہئے۔

بیان کیا گیا کہ خوب و بد کو غریزہ فطری کی بنیاد پر پرکھنا چاہئے اور انسان کو غلط کام انجام دینے کے بعد شرم محوس کرنا چاہئے اب اگر یہ غریزہ فطرت سے برسرپیکار ہو جائے، تو تدریجاً شرم وحیا کی یہ فطری جبلت ضعیف ہو کر انسان میں بے حیائی کی عادت رسوخکرنے لگتی ہے۔ یہ امر شرم وحیا سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اگر انسان ہر فطری امر کے مقابل میں مقاومت کرے، تو وہ فطری امورفتہ رفتہ ضعیف اور بے اثر ہونے لگتے ہیں، جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے انجام کے بارے میں بے تفاوتی سے کام لیتا ہے توآہستہ آہستہ ان میں گناہ کا ملکہ تقویت پاتا ہے، اور اس کے بعد اگر یہ تصور بھی کرلے کہ خدا کے حضور میں گناہ انجام دے رہا ہے پھر بھی احساس شرمندگی نہیں کرتا، کیونکہ اس کی فطرت مردہ چکی ہے۔

بیشک، محاسبہ نفس کا فقدان اور مسلسل پے در پے گناہ کا مرتکب ہونا فطرت کو رفتہ رفتہ بے اثر کر دیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر انسان ہر قسم کے گناہ کو انجام دینے میں کوئی پروا نہیں کرتا اور اس کا ضمیر اس کی سرزنش نہیں کرتا، جو انسان ہر بُرے کام کو انجام دینے پر شرمندہ ہوتا تھا، اب شرمندگی کا احساس نہیں کرتا ہے،البتہ دوسرے عوامل بھی موجود ہیں جو احساس شرمندگی کو نابود کرنے کا سبب بنتے ہیں اور روایتوں میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن بے شرمی اور بے حیائی کا اصل عامل، شرم و حیا کے فطری ہونے کے مقابلے میں مقاومت اور اس کی بے اعتنائی ہے۔ اس کے مقابل میں اس فطرت کی تقویت کے لئے بعض نکات کی رعایت کی جانی چاہئے کہ من جملہ ان میں ایک نکتہ یہ ہے جس کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے: پیغمبر اسلام ﷺ اس

روایت میں جناب ابوذرؓ کو خدا سے شرم کرنے کی نصیحت فرماتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں: ''جب میں بیت الخلا میں جاتا ہوں، اپنے سر اور چہرے کو چھپا لیتا ہوں، اور اپنے ہمراہ موجودہ فرشتوں سے حیا کرتا ہوں'' یہ رفتار، شرم کی جبلت کو تقویت بخشنے کے لئے ہے۔ ابو سعید خدری نے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے انتہا شرم و حیا کے بارے میں کہا ہے '': کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؛ اشد حیاء من العذراء فی خدرھا وکان اذاکرہ شیئاً عرفناہ فی وجھہ[1]''؛ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجلہ عروسی کی دلہن سے زیادہ باحیا تھے، جب آپؐ کسی چیز سے رنجیدہ ہوتے تھے اس کو (زبان پر نہیں لاتے تھے) ہم آپؐ کے چہرہ سے سمجھ لیتے تھے''

معروف ہے کہ جناب سلمانؓ نے فرمایا ہے: ''میں نے عمر بھر میں اپنی شرم گاہ پر نظر نہیں ڈالی ہے''! جناب سلمانؓ بوڑھے تھے۔ وہ طولانی عمر کے مالک تھے۔ یقیناً جس کا ایسا جذبہ ہو، وہ کبھی زنا نہیں کرتا۔ لیکن اگر انسان لاپروا ہو، خوب و بد میں فرق نہ کرتا ہو، رفتہ رفتہ اس کی فطری شرم و حیا نا بود جا ہوتی ہے اور گناہ کے عامل و محرک اسے معصیت و لغزش کی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نابودی کے دہانے پر قرار پاتا ہے اور منتظر ہوتا ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا آئے اور وہ گر جائے۔ لیکن اگر ابتدا سے اپنی رفتار کے بارے میں ہوشیار رہے اور فطرت کو تقویت بخشنے والے عوامل کو اپنے اندر اجاگر کرے، تو شرم و حیا کا جذبہ اس میں تقویت پائے گا اور وہ گناہ سے آلودہ نہیں ہوگا۔

[1] بحار الانوار ، ج١٦،ص٢٣٠

تیسرا درس

بہشت تک پہنچنے کا راستہ اور حیائے الٰہی کے جلوے

''یا اباذر؛ اتحب ان تدخل الجنۃ؟ قلت: نعم فداک ابی قال: فاقصر من الامل واجعل الموت نصب عینیک واستح من اللہ حق الحیاء قال قلت: یا رسول اللہ کلنا نستحیی من اللہ قال: لیس ذلک الحیاء ولکن الحیاء من اللہ ان لاتنسی المقابر والبلیٰ' والجوف وماوعی' والراس وما من حوی ومن اراد کرامۃ الآخرۃ فلیدع زینۃ الدنیا فاذا کنت کذٰلک' اصبت ولایۃ اللہ'' گزشتہ درس میں ہم نے پیغمبر اسلام ﷺ کے موعظہ کے ایک حصہ پر بحث و تحقیق کی جس میں خدائے متعال سے شرم و حیا کی نصیحت کی گئی تھی۔ حدیث مبارک کے اس حصہ میں بھی رسول خداؐ دوسری نصیحتوں کے ضمن میں، خدائے متعال سے شرم و حیا کے بارے میں دوبارہ یاددہانی فرماتے ہیں اور جناب ابوذرؓ سے فرماتے ہیں:یا اباذر؛ اتحب ان تدخل الجنۃ؟

''اے ابوذر!پسند کرتے ہو کہ تم بہشت میں داخل ہو؟''جناب ابوذرؓ جواب میں عرض کرتے ہیں:نعم فداک ابی۔ ''جی ہاں، میرے باپ آپ پر قربان ہوں۔' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر سے بہشت اور ابدی سعادت کے بارے میں تین بنیادی شرائط بیان فرماتے ہیں:۱۔ فاقصر من الامل، دور ودراز آرزؤں کو اپنے دماغ سے نکال دو

۲۔ واجعل الموت نصب عینیک، موت کو ہمیشہ اپنے نزدیک تصور کرو

۳۔ واستح من اللہ حق الحیاء۔ خدا سے اسی طرح شرم و حیا کرو جس کا وہ مستحق ہےطولانی آرزوں کی مذمت اورامید سے اس کا فرق:روایتوں میں جن موضوعات کے بارے میں فراوان تاکید کی گئی ہے، ان میں مومن کا طولانی آرزوؤں سے فرار کرنا بھی ہے،طولانی آرزوئیں اس امر کا سبب بنتی ہیں کہ انسان الٰہی فرائض اور معنوی مقاصد میں پیچھے رہے اور ان آرزوؤں تک پہنچنے کے لئے فرائض الٰہی سے پہلو تہی کرے، ہمیشہ اپنے حال پر نظر نہ رکھے اور فرصتوں سے استفادہ نہ کرے اور کل کی فکر میں قابل قدر

فرصتوں کو کھودے، انسان کو کمال اور آخرت کی ابدی سعادت سے محروم کرنے کے لئے ناشائستہ طولانی آرزوؤں کو شیطان ایک کار آمد سہارے کے طورپر استعمال کرتا ہے تاکہ بندگانِ خدا کو گمراہ کرے :جب خدائے متعال نے شیطان کو اپنی بارگاہ سے نکال باہر کیا ، شیطان نے کہا : (...لأتخذن من عبادک نصیباً مفروضاً ولأ ضلنهم ولأ منینهم "[1]) میں تیرے بندوں میں سے ایک گروہ کو اپنے ماتحت قرار دوں گا اور انہیں گمراہ کروں گا ۔ امیدیں دلاؤں گا ۔ ''طولانی آرزوؤں کے خطرات کے بارے میں ان کے ذریعہ انسان کے شبہات سے دوچار ہونے پھر چھوٹے گناہ انجام دینے اور اس کے بعد بڑے گناہوں اور گوناگوں کلمہ کے مرتکب ہونے کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام احساس خطر کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' :ایھا الناس ان اخوف مااخاف علیکم اثنان: اتباع الھویٰ وطول الامل فاما اتباع الھویٰ فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الآخرة...''[2]

اے لوگو!مجھے تم لوگوں کے بارے میں سب سے زیادہ خوف دو چیزوں سے ہے:ایک ہوائے نفس کی پیروی اور دوسرے طولانی خواہشات،لیکن نفسانی خواہشات کی پیروی انسان کو حق کے راستہ سے روکتی ہے اور طولانی آرزوئیں انسانکے دل سے و آخرت کی یاد کو فراموش کرا دیتی ہے ۔امید اور طولانی آرزوؤں میں فرق کو سمجھنے کے لئے، طولانی آرزو کے مفہوم کی وضاحت ضروری ہے، خاص کر اس کے پیش نظر کہ آرزو کے مفہوم سے امید کے معنی بھی نکلتے ہیں، اور حیات اور کوشش کا سرمایہ، خواہ مادی امور میں یا معنوی امور میں امید ہے، اگر کوئی شخص اپنی حالت کی بہتری اور نیک عمال سے نکلنے والے بہتر نتائج کی امید نہ رکھتا ہو، تو وہ نہ دنیا کے لئے کوئی کام بجالائے گا اور نہ آخرت کے لئے قرآن مجید کے فرمان کے مطابق :(من کان یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والآخرة فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ[3]) ''جس شخص کا خیال یہ ہے کہ اللہ دنیا اور آخرتمیں اس کی مدد نہیں کرے گا اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعہ آسمان کی طرف بڑھے اور پھر اس رسی کو کاٹ دے پھر دیکھے کہ اس کی ترکیب اس چیز کو دور کر سکتی ہے یا نہیں جس کے غصہ میں وہ مبتلا تھا ۔ ''اس تشریح کے پیش نظر، اگر انسان خدا کی مدد کے لئے

[1] نساء، ١١٨و ١١٩
[2] نہج البلاغۃ (ترجمۃ فیض الاسلام)خطبہ،٤٢،ص، ١٢٧
[3] حج ، ١٥

کوئی امید نہ رکھتا ہو، تو وہ ہمیشہ خشم، غضب، تزلزل اور نا اُمیدی کے دام میں گرفتار رہے گا اور ہمیشہ پریشان اور مضطرب ہوگا اور فرط نااُمیدی کی وجہ سے اپنی یا دوسروں کی سعادت کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھائے گا پس امید طولانی آرزو سے متفاوت ہے اور امید انسان کو حرکت میں لانے والا انجن ہے۔ خدا سے امید، اخروی ثواب اور عنایات الٰہی کی امید کا شمار فضائل اخلاق میں ہوتا ہے۔ اسی روایت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ سے فرماتے ہیں: کیا بہشت میں جانا پسند کرتے ہو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امید پسندیدہ اور شائستہ چیز ہے۔ جو ناپسند اور ناشائستہ ہے وہ طولانی آرزوئیں اور دنیوی خیال اور تمنائیں ہیں جو مطلوب نہیں ہیں۔

پس مومن ایسا نہیں ہے کہ نا امید ہو بلکہ وہ دنیوی پست اور حقیر آرزوؤں کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتا، کیونکہ اس کا دماغ اس سے زیادہ محترم ہے کہ دنیا کی حقیر اور پست آرزوؤں کے بارے میں سوچے، لیکن وہ مکمل طور پر خدا اور اس کے تقرب کی امید میں ہوتا ہے۔ دنیا، وسیلہ یا ہدف و مقصد: دنیا ذاتی طور پر مطلوب نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلوب ہونا وسیلہ کی حد تک ہے۔ یعنی انسان کو دنیا کے لئے کوشش کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس کا مقصد دنیا ہو، دنیا کی تلاش اخروی سعادت کا وسیلہ ہونا چاہیے ورنہ توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے انسان کی طولانی آرزوؤں کے لئے کوشش کی بات ہی نہیں!دنیا میں انسان کی کوشش فریضہ کو انجام دینے کے لئے ہونی چاہیے اور اس کی فعالیت، خواہ انفرادی مسائل کے بارے میں ہو یا اجتماعی مسائل کے بارے میں خدا کی خوشنودی اور اخروی سعادت حاصل کرنے کے لئے ہونی چاہیے، ورنہ اسلام کی نظر میں۔

اس کی تلاش و کوشش مطلوب نہیں ہوگی بلکہ قابل مذمت ہوگی،دنیا سے اُمید باندھنا آخرت کے لئے ہونا چاہیے۔ اگر انسان چاہتا ہو کہ اس کے دنیوی امور اور فعالیتیں آخرت کے لئے وسیلہ قرار پائیں، تو اسے توجہ کرنی چاہیے کہ وہ دنیوی فعالیتیں جو آخرت تک پہنچنے کے لئے وسیلہ ہیں وہ معنوی امور کے لئے رکاوٹ کا سبب نہ بنیں کیونکہ انسان کی فکر،اس کا ذہن اور قدرت تخیل کی ظرفیت محدود ہے، جب انسان کسی موضوع کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے، تو وہ دوسرے مسائل سے باز رہتا ہے۔ جب اس کی توجہ ایک چیز پر متمرکز ہوتی ہے تو وہ دوسرے مسائل میں پیچھے رہتا ہے۔ اگر انسان شب روز اکثر دنیوی امور کی فکر میں ہو گھر، بیوی، خوراک

لباس اور اپنی اجتماعی حیثیت کے بارے میں خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ دنیا کے بارے میں ہو، اس کی فکر میں اپنے ذہن کو مشغول کرے تو آخرت کے بارے میں فکر کرنے کی اسے فرصت نہیں ہوتی حتی وہ خواب میں بھی ان امور کو دیکھتا ہے۔ اگر انسان اہل کسب ومعاش ہو تو، خواب میں چیک اور بینک ڈرافٹ دیکھتا ہے۔ یا اگر معمار ہے تو خواب میں تعمیراتی وسائل اور مسائل کے بارے میں سوچتا اور غور کرتا ہے جس نے شادی نہیں کی ہو وہ خواب میں اپنی شریک حیات کے انتخاب کی فکر میں ہوتا ہے یا اگر شادی کی ہے اور صاحب اولاد نہیں ہوا ہے تو خواب میں صاحب اولاد ہونے کی فکر میں ہوتا ہے، انسان ان فکری مشغلوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے، آخرت، معنویات، اپنی خلقت کے مقصد کے بارے میں اور اپنے دور و دراز مستقبل کے بارے میں غور و فکر نہیں کرپاتا ہے۔

یہی روزمرہ کے امور انسان کے ذہن کو ایسا مشغول کر لیتے ہیں کہ وہ واجب فرائض کو انجام نہیں دے سکتا اور اگر وہ اپنے روزانہ کے مسائل سے فارغ ہوتا ہے تو آئندہ کے سوسال کی فکر میں پڑجاتا ہے کہ اس کے نواسوں اور آئندہ نسل کا کیا ہوگا؟ اس کی اولاد کس طرح کے وسائل حیات فراہم کریں گی؟ ان کے لئے کس طرح بیوی کا انتخاب کرے اور بیٹیوں کے لئے کیسے شوہر کا انتظام کرے یقیناً ایسا ذہن اور ایسا دل خوشنودی خدا کیلئے معنوی مسائل، اخروی درد، روحی و معنوی بیماریوں اور اجتماعی مصلحتوں کی طرف توجہ نہیں کرسکتا ۔ بصد افسوس کہ بعض اوقات حتی معنوی امور بھی دنیا کے لئے آلہ کار بن جاتے ہیں! یہ انسان کے لئے سب سے بڑا انقصان اور بدبختی ہے۔

اگر کسی اہل کسب و معاش نے اپنے کسب ومعاش کو دنیوی خواہشات پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیا، تو کوئی تعجب نہیں ہے، تعجب اس بات پر ہے کہ دین کو دنیا کے لئے وسیلہ قرار دیا جاتاہے۔ دین کو دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے دوکان قرار دیتا ہے ،ایسا شخص دین فروش ہے اور روایت کی تعبیر میں، دین کی راستہ سے رزق کھاتا ہے۔ زہے افسوس! کیا بدبختی ہے انسان کو کتنا بدبخت ہونا چاہئے کہ دینی امور کو دنیا اور دنیوی آرزؤں کو پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ معصوم ؑنے فرمایا ہے،

ایسے شخص کے دین کی جزا، وہی آمدنی ہے جو دین کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور وہی رزق ہے جسے دین کے وسیلہ سے کھاتا ہے، وہ دین سے اس کے علاوہ کوئی اور فائدہ حاصل نہیں کرتا ہے''؛المستاکل بدینہ حظہ من دینہ مایا کلہ''[1]غنی مطلق کی طرف توجہ، غیر خدا سے بے نیازی کا سبب:اگر مومن معرفت الٰہی اور فرائض الٰہی پر عمل کرنے کی راہ میں گامزن ہو، تو وہ پھر اپنے دنیوی امور کے بارے میں نہیں سوچتا، کیونکہ خدا اس کی کفالت کرنے والا ہے ۔

اور اس کی دنیوی ضروریات کو پورا کرتا ہے، البتہ نہ اس معنی میں کہ وہ کوئی کام انجام نہ دے، بلکہ وہ اپنے ذہن کو دنیوی امور میں مشغول نہیں کرتا ہے، حتی تاجر، کسان اور صنعت کار، جو اپنے کسب معاش کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور اپنا فرض نبھانا ہوتا ہے، نہ صرف دنیوی ضروریات کو پورا کرنا ۔ مبارک ہو اس تاجر کے لئے جو دنیا کو آخرت کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے اور افسوس ہو اس شخص کے حال پر جو آخرت کو دنیا کے لئے وسیلہ قرار دیتا ہے،یقیناً ایسا شخص زندگی میں ناکام رہتا ہے اور ہمیشہ اس کا دل مضطرب اور بیقرار رہے گا، کیونکہ باوجود اس کے کہ خود کو دین سے وابستہ اور اس سے آشنا جانتا ہے، دینی اور الٰہی اقدار کو باور نہیں کرتا اور اپنے علم کو عمل کے مطابق قرار نہیں دیتا اور جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے، ایسا انسان خدا کے غیظ و غضب کا مستحق قرارپا تا ہے اور خدائے متعال اس کی دنیا کو پانے والے وسائل کو اس کے سامنے سے ہٹا لیتا ہے، اس لحاظ سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنی زندگی میں ہمیشہ شکست اور ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں، نہ دنیا ان کے ہاتھ آتی ہے اور نہ ہی آخرت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس جب شخص مومن ،ایمان ، اعتقاد معرفت الٰہی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، تو خدائے متعال اس کی دنیوی زندگی کے بارے میں بھی اس کی رہنمائی فرماتا ہے اور اس کی زندگی کے مسائل کو ایسے حل کرتا ہے کہ وہ دنیا کی طرف فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں تھوڑی سی بھی پریشانی نہیں رکھتا ہے، چنانچہ شب معراج خدائے متعال نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے فرمایا۔۔''؛وانہ لیتقرب الی بالنافلۃ حتی أحبۃ فاذا احببتہ کنت

[1] بحار الانوار :ج۷۸،ص۶۳

سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ ولسانہ الذی ینطق بہ ویدہ التی یبطش بھا۔۔۔"[1] "بندہ نماز نافلہ (مستحبات انجام دیکر) کے وسیلہ سے مجھ سے تقرب پیدا کرتا ہے تاکہ میں اس سے محبت کروں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاؤں گا جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہون گا جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاؤں کا جس سے وہ حملہ اور دفاع کرتا ہے۔"

اس روایت کی سند معتبر ہے، کافی جیسی کتابوں میں درج ہوئی ہے، اس کے مضامین دوسری روایتوں میں بھی آئے ہیں۔ اس روایت میں بیان کی گئی تعبیروں کے بارے میں من جملہ یہ کہ خدائے متعال فرماتا ہے: میں اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ بن جاتا ہوں بعض بزرگوں، جیسے شیخ بہائیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں نیز امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ امام خمینیؒ کے بیان کا مضمون کتاب چہل حدیث میںیوں ہے: جس قدر دل غیر حق کی طرف متوجہ ہوجائے اور دنیوی امور کی طرف توجہ کرے اس کی ضرورتیں اور احتیاجات روز بروز بڑھتی جائیں گی۔ لیکن معنوی اور قلبی حاجتیں واضح اور روشن ہیں، کیونکہ دنیا سے اس کی وابستگی اور دلبستگی نے اسکے دل کے تمام زاویے پُر کئے ہیں۔

لیکن خارجی ضرورتیں بھی فطری ہیں جو پھیلتی ہیں، کیونکہ کوئی شخص تنہا اپنے تمام امور کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا، اگر چہ دولت مند افراد ظاہر میں بے نیاز دکھائی دیتے ہیں، لیکن وقت گزرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دولت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں، پس دولتمند حقیقت میں امیروں کے روپ میں فقیر اور بے نیازوں کے لباس میں حاجتمند ہیں۔ جس قدر انسان کے دل کی توجہ دنیاوی اور دنیا کو آباد کرنے کے امور کی تدبیر کی طرف زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی زیادہ ذلت و خواری کی گرد اس کے اوپر بیٹھتی جائے گی اور رسوائی کی تاریکی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ اس کے برعکس اگر کوئی دنیا کی طرف پشت کرے اور اپنے قلب کو غنی مطلق کی طرف متوجہ کرے اور تمام مخلوقات کے ذاتی فقیر ہونے پر ایمان لائے اور جان لے کہ کوئی

---

[1] اصول کافی (باترجمہ) ج۴، ص۵۴

مخلوق اپنی طرف سے کسی چیز کی مالک نہیں ہے اور کوئی بھی طاقت، عزت و سلطنت خدا کے علاوہ کسی کے لئے نہیں ہے، تو وہ دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے اور دل میں ایسی بے نیازی کا احساس کرتا ہے کہ اس کی نظر میں ملک سلیمان کی قدر و قیمت ایک ذرہ کے برابر نہیں ہوتی۔ اگر زمین کے تمام خزانوں کی کنجی بھی اسے دے دی جائے، اعتنا نہیں کرتا، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جبرئیلؑ امین خدا کی طرف سے خزانوں کی کنجی حضرت خاتم الانبیاءؐ کے لئے لے آئے تو آنحضرتؐ نے تواضع میں اسے قبول نہیں کیا اور فقر کو اپنے لئے فخر جانا[1]۔

''فقال: یا محمد ، ان ربک یقرئک السلام و یقول هذه مفاتیح خزائن الارض: فان شئت فکن نبیا عبداً وان شئت فکن نبیا ملکا فاشار الیه جبریلؑ: ان تواضع یا محمد ، فقال: بل اکون نبیا اور حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباس سے فرمایا: یہ تمھاری دنیا میری نظروں میں اس پیوند لگی جوتی سے پست تر ہے[2]۔

وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے خزانوں اور اس کے مال و دولت کی طرف توجہ کرنا اور اہل دنیا و اور اہل ثروت کی ہم نشینی دل میں کدورت اور تاریکی پیدا کرتی ہے اور انسان کے ارادہ کو سست کر دیتی ہے اور دل کو محتاج اور نیاز مند بنا کر خد کی طرف توجہ کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ لیکن جب دل کو صاحب دل اور گھر کو گھر کے مالک کے حوالہ کر دیا ا ور غاصب کے ہاتھ میں جانے نہیں دیا تو اس دل میں خود اس کا مالک ظہور پیدا کرتا ہے۔ البتہ غنی مطلق کا ظہور بے نیازی مطلق کو لے کر آتا ہے اور دل کو عزت و بے نیازی کے پر تلاطم دریا میں غرق کردیتا ہے: (وللہ العزة ولرسولہ وللمؤمنین[3]) ''ساری عزت اللہ، اس کے رسول اور صاحبان ایمان کے لئے ہے۔ ''فطری بات ہے جب دل کے امور کو دل کا مالک انجام دے گا، تو انسان کو یوں ہی نہیں چھوڑتا

---

[1] ...وهبط مع جبریل ملک لم یطاء الارض قط' معہ مفاتیح خزائن الارض۔

[2] قال عبداللّٰہ ابن العباس: دخلت علی امیر المومنین ؑ بذی قار وهو یخصف نعلہ: فقال لی: ماقیمۃ هذه النعل؟ فقلت: لا قیمہ لها' فقال ؑ واللّٰہ لهی احب الی من امرتکم الا ان اقیم حقاً اوادفع باطلاً...'' (امالی صدوق' مجلسہ ۹' ص ۳،:حہ ۰۲)

''ابن عباس نے کہا: میں ذی قار کے مقام پر امیر المؤمنین علیہ اسلام سے ملا، وہ اپنے جوتیوں کے ٹانکنے میں مشغول تھے، انھوں نیمجھ سے کہا: اس جوتی کی قیمت کتنی ہوگی؟ میں نے کہا: اس کی قیمت نہیں ہے! فرمایا: خدا کی قسم یہ جوتی میرے لئے آپ لوگوں پر حکومت کرنے سے زیادہ غریز ہے: مگر یہ کہ حق کو قائم کروں اور باطل کو دور کروں'' (نہج البلدغہ (ترجمہ فیض الاسلام) خ ۳۳' ص۱۱۱)

[3] منافقون۸،

دیگا ۱۔عبداً ثم صعد الی السماء''''...خدا کا ایک فرشتہ، جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، جبرئیل کے ہمراہ زمین پر آیا اور اس کے ہاتھ میں زمین کے خزانوں کی کنجیاں تھیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !پروردگار نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور فرمایا: یہ زمین کے خزانوں کی کنجیاں ہیں، اگر چاہتے ہیں تو ایک بندہ کی حیثیت سے پیغمبر رہیں یا ملک سلطنت کی حیثیت سے پیغمبر رہیں۔ اس کے بعد جبرئیل نے اشارہ کیا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !انکساری سے کام لینا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں بندہ کی حیثیت سے پیغمبر رہوں گا۔ اس کے بعد وہ فرشتہ آسمان کی طرف واپس ہو گیا '' ''...اور بندہ کے تمام امور میں خود دخل دیگا بلکہ خود اس کیلئے کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں بن جائیگا....اس صورت میں بندہ کی محتاجی اور اس کا فقر مکمل طور سے بر طرف ہوجائیگا اور وہ دونوں جہاں سے بے نیاز ہوجائے گا۔

البتہ حق کے اس ظہور میں تمام مخلوقات کا خوف اس سے دور ہو کر اس کی جگہ پر خدائے متعال کا خوف جانشین ہوگااور حق کی عظمت و حشمت پورے دل پر سایہ فگن۔ غیر حق کے لئے کسی قسم کی عظمت، حشمت نیز تصرف کی گنجائش نہیں ہوگی اور '' لاَ مؤثرفي الوجود اِلاّ اللّٰہ '' کی حقیقت کو پالے گا۔ روایت ''۔ وانہ لیتقرب الیّ۔ '' کے لئے جو سادہ ترین تفسیر کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ خدائے متعال فرماتا ہے: جو کام انسان کے لئے اس کی آنکھ اور کان انجام دیتے ہیں، میں انجام دیتا ہوں۔ جو کام اس کے ہاتھ اس کے لئے انجام دیتے ہیں، میں انجام دیتا ہوں۔ اسے اپنی مادی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیے تاکہ اپنی حاجتوں کو بر طرف کر سکے، لیکن میں کام کو ایسے مرتب کرتا ہوں کہ کام خود بخود انجام پاتے رہیں تاکہ اسے ذہن پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہ پڑے کہ کل کیا کروں!، جب وہ گھر سے باہر آتا ہے، خدائے متعال کے ارادہ سے اور اس کے فراہم کردہ اسباب سے، شاید بندگان خدا میں سے کسی بندہ کے توسط سے اس کا کام انجام پا جائے اسے مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور خدائے متعال اسے غیبی طور پر مدد پہنچاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عالم غیب سے براہ راست اور بلا واسطہ اس کے کام انجام پاتے ہیں بلکہ مفہوم یہ ہے کہ

[1] امام خمینی " چہل حدیث" ص۴۴۴۔۴۴۵

تمام امور کی تدبیر اور تمام کاموں کی مہارت اس کے ہاتھ میں ہے، وہ عوامل اور وسائل کو ایسے منظم کرتا ہے کہ کام بخوبی آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ انسان زیادہ فکر کرنے اور منصوبہ بندی کی ضرورت کا احساس کرے۔ مومن کو اپنے امور اور کی ترقی کیلئے لئے شیطانی منصوبے اور خاکے کھینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جب وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی مختصر ضرورتوں کو خدائے متعال پورا کرے گا، تو وہ طولانی آرزؤں کو اپنے ذہن میں پلنے نہیں دیتا اس کا کام صرف فریضہ انجام دینے کے لئے ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اگر انسان صرف مال و دولت کو جمع کرنے اور کسب معاش اور آمدنی کو اضافہ کرنے کی فکر میں پڑے تاکہ دنیا کی رونق اور اس کی چمک دمک میں اضافہ کرے۔ مسلسل گھر کے ڈیکوریشن کو تبدیل کرتا رہے اور نئے ماڈل کی گاڑی خریدے چونکہ یہ سلسلہ طولانی ہے، کسی جگہ پر ختم نہیں ہوتا ہے اور امام خمینیؒ کی فرمائش کے مطابق اگر تمام کرۂ ارض کو بھی اس کے اختیار میں دیدیا جائے، وہ مطمئن نہیں ہوگا بلکہ وہ اس فکر میں ہوگا کہ کسی اور کرہ کو بھی اس کے اختیار میں دیا جائے!موت کی یاد اور حیائے الٰہی کے جلوے:جو کچھ بیان ہوا اور جس کے بارے میں ہم نے پہلے بھی یاد دہانی کی، اس کے پیش نظر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہشت میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ذکر فرمائی ہیں:پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی آرزوؤں کو مختصر کرے، دنیا سے دلبستگی نہ رکھے، آئندہ کے بارے میں فکر مند نہ رہے، صرف آخرت کی فکر میں رہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیشہ موت کی یاد میں رہے۔

پہلی شرط کے بعد اس شرط کا ذکر ان دونوں کے درمیان قریبی رابطہ کی دلیل ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی طولانی آرزؤں کو اپنی فکر کے دائرہ سے دور کرنا چاہے، تو اسے مسلسل موت کی فکر میں رہنا چاہیے، چونکہ جب انسان موت کو مد نظر رکھتا ہے تو دنیوی آرزوؤں کا انجام اور ان کا لغو و بیہودہ ہونا بھی اس کی نظروں کے سامنے مجسم ہوجاتا ہے۔

اس لحاظ سے طولانی آرزوؤں اور موت کے بارے میں سوچنے کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔آرزو کرنا اور آرزو رکھنا مکمل طور پر انسان کے اختیار میں نہیں ہے، جب انسان ایک ایسے ماحول میں تربیت پائے جس پر مادیات کی تہذیب حاکم ہو، تو دیکھنے اور سننے

کی چیزیں اس پر اثر ڈالتی ہیں اور اس کی آنکھیں اور کان کو دنیا کی طرف متوجہ کر کے خواہ نخواہ اس کے دل میں دنیوی آرزوئیں پیدا کرتی ہیں۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ دنیا کی چمک دمک ہمیں فریب نہ دے اور ہم طولانی آرزوؤں کو اپنے ذہن میں نہ پالیں، اسی اہمیت کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ سے تاکید فرماتے ہیں کہ موت کو ہمیشہ اپنے سامنے مجسم تصویر کرو، اگر کوئی ہمیشہ توجہ رکھے کہ اس کی زندگی کا انجام موت ہے تو وہ اس حقیقت کو درک کرلے گا کہ اس دنیا سے دلبستگی کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے، وہ چیز دلبستگی کے لئے لائق و سزاوار ہے کہ جو ختم ہونے والی نہ ہو، اس سے کوئی چیز کم نہ ہو اور وہ آخرت کی حیات طیبہ ہے۔

اگر انسان مسلسل موت کی فکر میں رہے، تو وہ طولانی آرزوؤں، حرص و طمع اور بہت سی دوسری بری عادتوں میں مبتلا نہیں ہوگا۔ پس موت کی یاد آفتوں اور معنوی و روحانی بیماریوں کے لئے ایک موثر دوا ہے۔ فطری طور پر موت کی طرف توجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے، انسان اپنے گردو نواح میں موت کی طرف توجہ کے لئے کچھ مظاہر کا اضافہ کر سکتا ہے، اپنے کمرے یا آفس میں موت کے بارے میں کچھ مطالب لکھ کر سائن بورڈ کے عنوان سے آویزاں کر دے، حتی کتاب کے اندر موت کے بارے میں کچھ کلمات تحریر کردے تاکہ اس کو دیکھ کر اسے موت کی یاد آتی رہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روایت میں فرماتے ہیں ''؛اکیس الناس من کان اشد ذکراً للموت''[1] ''لوگوں میں چالاک ترین شخص وہ ہے جو موت کو زیادہ یاد کرے۔''یقیناً چالاک انسان دھوکہ نہیں کھاتا اور دنیا و آخرت میں سے بہترین کو منتخب کرتا ہے۔

جب چالاک انسان جان لے کہ دنیا ختم اور نابود ہونے والی ہے تو اس کے لئے اہمیت اور قدر و قیمت کا قائل نہیں ہوتا ہے۔ بہ ہر صورت موت کو یاد رکھنے کی مشق، دنیا پرستی اور طولانی آرزؤں میں مبتلا ہونے سے بچنے کی ایک مؤثر دوا ہے۔ بہشت میں داخل ہونے کی تیسری شرط خدا سے حیا ہے اس کے بارے میں گزشتہ جلسہ میں بھی دوسرے انداز سے اس کی طرف اشارہ ہوا تھا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سے حیا کرنے کی ضرورت کے بارے میں دوبارہ یاد دہانی کراتے ہیں جس کی وجہ سے، جناب ابوذرؓ

---

[1] بحار الانوار :ج۶،ص۱۳۰

یہ محسوس کرتے ہیں کہ حیا کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑی ہی دیر بعد پھر سے اس پر تاکید فرمائی جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مسئلہ پر اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں اور اس کے بارے میں تاکید کیوں کررہے ہیں۔ اور یہ احتمال دے رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی خاص مقصد رکھتے ہیں، اس لئے پوچھتے ہیں ''یا رسول اللہ کلنا نستحی من اللہ '''' اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم سب خدائے متعال سے حیا کرتے ہیں''، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حیا کی اس حد کو کافی نہ جانتے ہوئے، خدا کی حیا کے تین جلوے بیان فرماتے ہیں۔ ''لیس ذلک الحیاء ولکن الحیاء من اللہ ان لا تنسی المقابر والبلی '''' خدا سے حیا ایسی نہیں ہے جو دکھائی دے بلکہ خدا سے حیا یہ ہے کہ قبروں اور ویرانوں کو فراموش نہ کرو'' حیائے الٰہی کا پہلا عکس اور الٰہی جلوہ یہ ہے کہ انسان قبرستانوں اور ویرانوں میں تبدیل ہوئی عمارتوں کو فراموش نہ کرے۔ البتہ وہ قبریں جو شاہی محلوں کے مانند مزین کی گئی ہوں اور ان کو دیکھنا انسان کو آخرت کی یاد نہیں دلاتا، بلکہ مراد وہ قبریں ہیں جو ویران ہوگئی ہوں اور ان کی طرف لوگ توجہ کم دیتے ہو۔ اس سے پہلے بھی ہم نے یاد دہانی کرائی کہ انسان کا ذہن محدود ہے، اور اگر انسان مسائل کے ایک سلسلہ کی طرف توجہ دے تو دوسرے مسائل سے باز رہ جاتا ہے اور ان کی طرف جانے کے لئے اس کے ذہن میں ظرفیت باقی نہیں رہتی۔

اگر انسان چاہتا ہے کہ بعض مطلوب حالات اور مطلوب نفسانی تأثرات جیسے: حیا، خوف، شوق الٰہی کہ جو اسلام کی قدر و منزلت کے نظام میں شناختہ شدہ ہیں اور اخلاق میں ان کی تاکید کی گئی ہے، اپنے اندر پیدا کرے، تو اسے ان کے لئے مقدمات فراہم کرنا چاہیے، اگر انسان چاہتا ہو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان شدہ مطلوب حیا کے مرتبہ کو اپنے اندر پیدا کرے، تو اسے دنیا کی رعنائیوں اور آشائیوں کو ترک کرنا ہوگا۔ اسے پرانی اور ویران شدہ عمارتوں سے انس پیدا کرنا ہوگا۔ جب انسان کی توجہ ہمیشہ بڑی بڑی اور مجلل عمارتوں پر رہے گی، اس کا دھیان زیبا اور قابل توجہ کاشانوں پر ہوگا، ہر روز اس کی نظر نئے نئے ڈیکوریشوں، رنگارنگ پردوں پر پڑے گی تو دنیا اس کی نظر میں بیشتر جلوہ پیدا کرے گی۔ اگر وہ ان فریب دینے والے دنیوی مظاہر سے اپنی توجہ کو ہٹانا

چاہے تو اسے قبرستان کا رخ کرنا چاہئے اور انسانوں اور زیر خاک سوئے ہوئے مردوں کے انجام پر غور کرنا چاہئے! ویران جگہوں اور کھنڈرات میں جا کر سوچنا ہئے یہ پتھر، لوہا اور سیمنٹ جو استعمال ہوئے ہیں، ان کا انجام کیا ہے؟ !غلط فہمی نہ ہو، مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے گھروں کو خام اینٹوں اور ایسی کمزور بنیادوں پر تعمیر کریں کہ بارش سے خراب ہوجائیں۔ بلکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ انسان ہر کام کو صحیح انجام دے، اگر گھر تعمیر کر رہا ہے تو اسے مضبوط اور پائدار صورت میں تعمیر کرے۔ بات یہ ہے دنیاوی زرق وبرق انسان کے دل پر اثر نہ کرے اور وہ دنیا کا شیدائی نہو نہ یہ کہ کام کو صحیح طور پر انجام نہ دے۔ انسان کا فرض ہے اپنے کام میں سنجیدہ ہو لیکن دنیا سے وابستہ نہ ہوجائے۔

جب انسان دنیا کی عیاشیوں کو دیکھتا ہے، فطری بات ہے کہ اس کا دل ان کی طرف مجذوب ہوجاتا ہے، یہ حالت اختیاری نہیں ہے، جب دیکھتا ہے کہ اس کے ہمسایہ کے پاس گاڑی ہے اور وہ چند مدت کے بعد اس گاڑی کو ایک نئی اور اعلی قسم کی گاڑی میں تبدیل کرتا ہے، اس کے دل میں بھی ہوس پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے: کیوں فلاں شخص مسلسل اپنی گاڑی بدلتا رہتا ہے اور ہم ایک فرسودہ گاڑی کے بھی مالک نہیں ہیں؟ جب وہ گاڑی خریدتا ہے تو دوسرے دن بہتر گاڑی کی آرزو کرتا ہے اور اسی طرح روز بروز، لہذا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید یہ ہے انسان کبھی کبھی قبرستانوں ویرانوں اور کھنڈرات کی طرف بھی جا کر جھانکے۔ علمائے اخلاق بھی اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے تھے کہ ہر روز قبرستان جائیں، کم از کم ہفتہ میں ایک بار مستحب ہے قبرستان جائیں تاکہ ان کے دل دنیا کی محبت اور مادی توجہات سے صاف اور فلٹر ہوجائیں کم از کم دنیا و آخرت کے درمیان ایک توازن پیدا ہوجائے۔

ایسا نہیں ہے کہ انسان دنیوی امور کا شیدائی ہو اور دنیا کی محبت اس کے دل پر سایہ کئے ہو اور اسی حالت میں چاہتا ہو کہ خدائے متعال کا خوف بھی رکھے، سحر خیز بھی ہو اور جب امام حُسین علیہ السلام کا نام سنے تو آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہوجائیں،یا جب بہشت کا نام اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے، تو اس کے دل میں ان کے بارے میں ولولہ پیدا ہوتا ہے، فطری بات ہے دنیا اور

اس کی طرف توجہ نے اس کے دل میں ان امور کے لئے جگہ ہی نہیں چھوڑڑ ہے، جو دل دنیا کی محبت سے لبریز ہو، اس میں امام حُسین علیہ السلام اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، البتہ یہ معصومین اس قدر نورانی ہیں کہ جب ہمارے مردہ دلوں میں بھی ان کی یاد آتی ہے تو، اثر کرتی ہے، لیکن ان کی یاد آلودہ دلوں پر شائستہ و کما حقہ اثر نہیں کرتی۔ ''وا لجوف و ماوعی'' ''اور یہ کہ شکم اور جو کچھ اس میں ہے، اسے نہ بھولو'' دوسرا ردعمل اور حیائے الٰہی کا جلوہ، یہ ہے کہ انسان دیکھ لے کہ وہ کیا کھتا ہے۔ اگر انسان نے جو کچھ اسے ہاتھ آیا اس سے استفادہ کیا اور لقمہ حرام کھانے میں کوئی دریغ نہیں کی تووہ رفتہ رفتہ قساوت سے دو چار ہوتا ہے اور اس کا دل نور الٰہی سے خالی ہوجاتا ہے۔

انسان کو اپنی غذا دیکھنی چاہئے اور اسے توجہ رکھنی چاہیے کہ شبہ والی غذائیں یا خدا نخواستہ حرام غذائیں، شقاوت قلب کا سبب بنتی ہیں اور اس کے بعد انسان کے دل میں عبادت کی رغبت، خوف خدا، شوق بہشت اور لقاء اللہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، پس خدا کی حیا کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے شکم اور اس میں موجودہ غذا کے بارے میں توجہ کرے۔ قرآن مجید انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنی غذا کے بارے میں ہوشیار رہو :(فلینظر الا نسان الیٰ طعامہ [1]) ''ذرا انسان اپنے کھانے کی طرف تونگاہ کرے''انسان کو تمام جوانب کی رعایت کرنی چاہیے اور اپنی غذا کو تمام پہلوؤں سے جانچ لینا چاہیے اسے ہوشیار رہنا چاہئے کہ اس کی غذا سالم، حفظان صحت کے مطابق، حلال اور پاکیزہ ہو۔ اصحاب کہف جنھوں نے برترین بندگان خدا کی حیثیت سے شرک و بت پرستی کے نظام کو چھوڑ کر عہد دقیانوسی کے کفر آمیز اعتقادات کے دام سے اپنے آپ کو آزاد کیا، قرآن مجید کی فرمائش کے مطابق غذاؤں میں سے پاکیزہ ترین اور حلال ترین غذاؤں کو منتخب کرتے تھے، قرآن مجید اصحاب کہف کے غار میں سونے کے بعد نیند سے بیدار ہونے کی روداد کو بیان کرنے کے بعد ان کی گفتگو کے بارے میں فرماتا ہے :(فابعثوا احد کم بورقکم ھٰذہ الی المدینۃ فلینظر ایّھا ازکیٰ طعاماً فلیأتکم برزقٍ منہ [2]) ''اب تم اپنے سکّے دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو تاکہ وہ دیکھیں کہ کون سا کھانا بہتر اور پاکیزہ تر

---

[1] عبس، ۲۴
[2] کہف، ۱۹

ہے اور اس سے تمہارے لئے رزق فراہم کرے۔ ''انسان کے انحراف، حق سے کنارہ گیری اور خدا و اولیائے الٰہی کے سامنے گناہ کے مرتکب ہونے میں مال حرام کے اثرات کے پیش نظر امام حسینؑ کے کلام کا اثر لشکر اہل کفر پر نہ ہوا تو فرمایا '': وکلکم عاص لامری غیر مستمع قولی فقد ملئت بطونکم من الحرام وطبع علی قلوبکم[1] ''تم سب گناہگار ہو اور بغاوت کر رہے ہو اور میرے حکم کی نافرمانی کر رہے ہو، میری بات پر کان نہیں دھرتے ہو، بیشک تمارے شکم حرام غذا سے بھر گئے ہیں اور تمہارے دلوں پر مہر لگی ہے'' بیشک حرام لقمہ انسان کو اس قدر قساوت اور سنگ دل بناتا ہے، کہ یہاں تک وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسہ پر تلوار کھینچنے میں بھی پرواہ نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سے شرم کرنے کے لئے یہ شرط ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان توجہ کرے کہ وہ کونسی غذا کھاتا ہے۔ ''والرأس ومن حوی[2] '' یہ کہ سر اور جوکچھ اس احاطہ میں ہے، یعنی آنکھ، کان اور زبان کو کنٹرول کرو۔ تیسرا عکس العمل اور حیائے الٰہی کا جلوہ یہ ہے کہ انسان دیکھ لے کہ وہ اپنے سر میں کن فکروں اور خیالات کی پرورش کرتا ہے اور کونسی آرزوئیں اور خواہشیں رکھتا ہے۔

اگر وہ اپنے خیالات کا تصفیہ کرے، باطل افکار کو اپنے سر سے نکال باہر کرے، اور اپنا اندرونی تصفیہ کرے تو مطلوب حیا کو اپنے اندر جگہ دے سکتا ہے۔ تزئین و آرائش، اولیاء دین کی سیرت: حدیث مبارک کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '': ومن اراد کرامۃ الاخرۃ فلیدع زینۃ الدنیا فاذا کنت کذلک اصبت ولایۃ اللہ '''' جو بھی آخرت کی عظمت و بزرگی چاہتا ہے، وہ دنیا کی زینت کو چھوڑدے، جب ایسا کروگے تو خدائے متعال کی دوستی کے مقام تک پہنچے ہو۔ '' جب انسان دنیا سے کٹ کر اس کی نسبت بے اعتنائی برتتا ہے تو وہ آخرت، اس کی پائدار نعمتوں اور قرب الٰہی پیدا کرتا ہے اور آخرت میں عزیز، محترم اور با عظمت بن جاتا ہے۔

[1] بحار الانوار ج۴۵ص۸
[2] دوسرے نسخہ میں ''وماحوی'' ہے اور شاید یہی صحیح ہو۔

اس کے برعکس اگر انسان کی نظر میں دنیا بڑی دکھائی دے تو اس کی نظر میں آخرت چھوٹی ہوتی ہے۔ البتہ آخرت اور موت کے بارے میں فکر کرنا اور قبرستان میں جانا مؤثر ہے، لیکن انسان کو اپنے عمل کے بارے میں بھی نئے سرے سے سوچنا چاہیے۔ دنیا کے پھندے میں نہ پھنسنے کے لئے اسے دنیوی زینتوں اور آرائشوں سے پرہیز کرنا چاہئے، اس صورت میں وہ آخرت میں عزیز اور با عظمت ہوگا۔یہاں پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض تزئین و آرائش مستحب ہیں، اب اگر انسان انہیں استحباب اور شرعی مطلوبیت کی نیت سے انجام دے، تو نہ صرف وہ دنیا طلب نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت طلب ہے، مستحب ہے کہ عورت اپنے شوہر کے لئے اور شوہر اپنی بیوی کے لئے زینت اور آرائش کرے، یا مستحب ہے کہ مؤمن جب ایک اجتماع میں جائے، تو پاک و صاف لباس پہنے اور عطر لگائے اس کے علاوہ مسواک کرنا، بالوں کی کنگھی کرنا اور بالوں میں تیل لگانا بھی مستحب ہے مؤمن ایسا صاف و شفاف ہونا چاہئے کہ لوگ اس سے ملنے کے لئے رغبت پیدا کریں اور اس سے انس پیدا کریں۔

یقیناًاگر یہ امور قصد قربت کے طور پر انجام دئے جائیں تو عبادت ہیں اور دنیوی زینت شمار نہیں ہوتے ہیں۔ دنیوی زینت اس جگہ پر ہے کہ انسان نفسانی خواہشات اور لذت پانے کے لئے زینت کرے نہ کہ خدا اور آخرت کے لئے۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ صاف ستھرا اور نفیسلباس پہنے، لذیذ اور متنوع کھانا کھائے اور خوشنما اور شاندار گھر کا مالک ہو،لیکن اگر زینت آخرت اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے ہو تو مطلوب ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہمیشہ اپنے آپ کو صاف ستھرا اور معطر رکھتے تھے:مکارم اخلاق میں، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں آیا ہے کہ ''کان ینظر فی المراۃ ویرجل جمتہ ویمتشط وربما نظر فی الماء وسوّی جمتہ فیہ ولقد کان یتجمّل لأصحابہ فضلاً علی تجملہ لأھلہ وقال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اللہ یحب من عبدہ اذا خرج الیٰ اخوانہ ان یتھیا لھم ویتجمل[1]'' ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ آئینہ دیکھتے تھے اور اپنے سر اور داڑھی میں کنگھی کرتے تھے، بعض اوقات یہ کام پانی میں دیکھ کر انجام دیتے تھے، اہل خانہ

[1] المیزان ،ج۶،ص۳۳۰

کے علاوہ اپنے اصحاب کے لئے بھی زینت کرتے تھے اور فرماتے تھے: خدائے متعال اس بندے کو دوست رکھتا ہے جو اپنے بھائیوں کو دیکھنے کے لئے گھر سے باہر جاتے وقت اپنے کوآراستہ کرے۔''مومن کو ہمیشہ آراستہ اور ظاہراً صاف ستھرا ہونا چاہئے نہ یہ کہ بکھرے بال اور عجیب و غریب صورت بنائے ہو کہ جو دوسروں کی نفرت کا سبب بنے۔ گزشتہ زمانے میں بعض مسجدوں کے فرش میلے اور گندے ہوا کرتا تھا اور بعض لوگ گندے کپڑے اور بد بودار بدن کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے تھے اس کے مقابل میں فاسقوں کی جگہیں صاف ستھری ہوتی تھیں، لہٰذا مومنوں کی مجلسیں، بہترین، صاف ستھری اور معطر ہونی چاہئے۔

ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت کو نمونہ بنانا چاہئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ عطر پر خرچ ہوتا تھا۔ ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ یہ زینتیں آرائشیں نا مطلوب نہیں ہیں، کیونکہ شرع مقدس کا حکم ہے کہ اگر قصد قربت کی نیت سے انجام دی جائیں تو یہ بذات خود عبادت شمار ہوتی ہیں اور اس کا فلسفہ یہ ہے کہ مومنین آپس میں مانوس ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مصاحبت سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے نور سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

چوتھا درس

مخلصانہ دعا اور شائستہ عمل کا نقش اوراثر

''یا اباذر: یکفی من الدعاء مع البر ما یکفی الطعام من الملح یا اباذر؛ مثل الذی یدعو بغیر عمل کمثل الذی یرمی بغیر وتر۔ یا اباذر؛ ان اللہ یصلح بصلاح العبد ولدہ وولد ولدہ ویحفظہ فی دویرتہ والدور حولہ مادام فیھم۔'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موعظہ کا یہ حصہ دعا اور خدائے متعال سے درخواست اور دعا کی عمل صالح کے ساتھ ضرورت اور صالح انسان کا گھر اور معاشرے میں قابل اہم نقش سے مربوط ہے۔ بیشک دعا اور خدائے متعال سے درخواست، بندگی و عبودیت کا ایک مظہر ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی آیات و روایات وار دہوئی ہیں اور اس موضوع پر مفصل بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

دعا کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ مرحوم راغب اصفہانی دعا کے بارے مین کہتے ہیں: ''دعا'' مانند ''نداء'' ہے، اس فرق کے ساتھ کہ نداء میں کبھی ''یا'' اس کے علاوہ (الفاظ) سے استفادہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی نام نہیں آتا ہے، لیکن لفظ ''دعا'' ایسی جگہ پر استعمال ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ نام آئے، مثال کے طورپر: اے فلاں البتہ دعا و ندا کبھی کبھی ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔[1] علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں: خدائے متعال کی دعا کی دو قسمیں ہیں: تکوینی و تشریعی۔ تکوینی کسی چیز کے کی ایجاد کے معنی میں ہے کہ خدائے متعال نے اس کا ارادہ کیا ہے، گویا اس چیز کو اپنے ارادہ کے مطابق بلاتا ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (یوم یدعوکم فتستجیبون بحمدہ[2]...) ''جس دن وہ تمہیں (آخرت کی ابدی زندگی کی طرف) بلائے گا اور تم سب (قبروں سے باہر آجاؤ گے) اور اس کی تعریف کرتے ہوئے لبیک کہو گے۔''، لیکن خدا کی تشریعی دعا اس معنی میں ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے لوگوں کو دین قبول کرنے کے لئے مکلف قرار دیتا ہے۔ لیکن بندے کی پروردگار سے دعا، اس معنی میں ہے کہ بندہ خدا کی بندگی اور

---

[1] راغب اصفہانی، مفردات، مادہ " عود"
[2] اسراء، ۵۲

خدا کے سامنے اپنیغلامی کا کے احساس دلا کر، خدا کی رحمت و عنایت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس لحاظ سے حقیقت میں عبادت وہی دعا ہے، جسے بندہ اپنی دعا سے (خدا وند متعال سے وابستگی اور ذلت کے احساس سے) غلامی کے مرحلہ میں رہ کر اپنے مولا سے ارتباط برقرار کرتا ہے، تاکہ خدائے متعال کو اس کی سرداری اور ربوبیت کا واسطہ دیکر اپنی طرف متوجہ کرے اور یہ وہی دعا ہے اور اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدائے متعال فرماتا ہے :(وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سید خلون جھنم داخرین[1]) ''اور تمہارے پرور دگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔ ''اس آیت میں خدائے متعال نے پہلے تعبیر ''دعا'' سے استفادہ کیا ہے اس کے بعد تعبیر ''عبادت'' سے[2]۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ درخواست کرنے والے کی دعا کے قبول ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی بھی وہ درخواست کرے اور جس وقت بھی وہ چاہے اس کی حاجت پوری ہوگی۔ دعا کے قبول ہونے کے بارے میں اس قسم کی تفسیر دینی بیانات سے سازگار نہیں ہے۔ ممکن ہے جس چیز کے متعلق دعا کرنے والا درخواست کررہا ہے وہ اس کی مصلحت میں نہ ہو اور درخواست کا قبول ہونا اس کے نقصان میں ہو، کیونکہ وہ اپنی مصلحت سے آگاہ نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے بیٹے سے وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں... ''ثم جعل فی یدیک مفاتیح خزائنہ ' بما اذن لک فیہ من مسالتہ ' فمتی شئت استفتحت بالدعاء ابواب نعمتہ واستمطرت شاپیب رحمتہ فلا یقنطنک ابطاء اجابتہ فان العطیۃ علی قدر النیۃ وربما اخرت عنک الاجابۃ لیکون ذلک اعظم لأجر السائل واجزل لعطاء الأمل وربما سالت الشئی فلاتوتاہ واوتیت خیراً منہ عاجلاً او آجلاً ' او صرف عنک لما ھو خیر لک'' ،فلرب امر قد طلبتہ فیہ ہلاک دینک لو اوتیتہ فلتکن مسالتک فیما یبقی لک جمالہ وینفی عنک وبالہ فالمال لایبقی لک

---

[1] غافر، ۶۰

[2] المیزان :ج،۱۰، ص، ۳۶

ولا تبقی لہ۔[1] ''تیرے دونوں ہاتھوں میں جس تجھے درخواست کی اجازت دی ہے، خزانوں کی کنجیاں رکھی ہیں۔ پس اگر دعا سے نعمتوں کے دروازوں کو کھولنا چاہوتو مسلسل رحمت کی بارش کے لئے دعا کرو۔ تیری درخواست کے قبول ہونے میں تاخیر تجھے نا اُمید نہ کرے، کیونکہ بخشش نیت اور مہم ارادہ کے مطابق ہوتی ہے (دعا کا قبول ہونا خلوص نیت اور پائداری پر منحصر ہے) ممکن ہے تیری درخواست کو قبول ہونے میں تاخیر ہوجائے تاکہ درخواست کرنے والے کی پاداش میں اضافہ ہو اور کامیابی کے لئے بخشش زیادتی ہو۔ ممکن ہے کسی چیز کی درخواست کرو اور وہ شی تجھے عطا نہ کی جائے اور آخرت یا دنیا میں اس سے بہتر شی تجھے دی جائے یا تمھاری مصلحت میں یہی ہو کہ تمھاری درخواست قبول نہ ہو ممکن ہے کہ ایسی چیز کی درخواست کرو کہ اگر تجھے عطا کردی جائے تو تمھارا دین خراب ہوجائے۔ پس تجھے ایسی چیز کی درخواست کرنی چاہئے جس کی نیکی تیرے لئے باقی رہے اور اس کی ناگوار تم سے دور ہوجائے۔ مال تمھارے لئے باقی نہیں رہے گا اور تم بھی اس کے لئے نہیں رہو گے''

دعا و درخواست میں انسانوں کے مراتب میں فرق:اس بارے میں کہ دعا میں انسان کا محرک کیا ہے اور دعا کی اتنی تاکید کیوں کی گئی ہے، مختصریہ کہ انسان اپنی حاجت کو صرف بارگاہ الٰہی میں پیش کرے اور اس سے حاجت روائی چاہیے۔ بندگی اور اس کے مقامات کے بارے میں لوگ مختلف ہیں ان کی حاجتیں بھی مختلف ہیں، جو لوگ معرفت و ایمان کے ادنی درجہ اور خدا کی بندگی وعبودیت کے تکامل وترقی کے راستہ کی ابتدا میں قرار دیتے ہیں، ان کی حاجتیں عام اور دنیوی ہوتی ہیں، مثال کے طور پر وسعت رزق، شائستہ فرزند، اچھی شریک حیات، اچھے گھر اور زندگی کے وسائل کو پورا کرنے کی درخواست وغیرہ۔

البتہ جو ایمان کے ادنی درجہ پر ہے اور معرفت الٰہی کے اعلی درجات پر فائز نہیں ہوا ہے،کہ خدا سے بالاتر حاجتوں کی درخواست کرے، بجا ہے کہ خدا سے ان ہی مادی حاجتوں کی درخواست کرے، حقیقت میں خدا سے اس کی درخواست اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اسے اپنی حاجتوں کو پوا کرنے کا قادر جانتا ہے، اس لحاظ سے وہ بندگان خدا کی طرف دست

[1] نہج البلاغہ (ترجمہ فیض الاسلام)نامہ۳۱، ص ۹۲۵و۹۲۴

سوال دراز نہیں کرتا ہے، فطری بات ہے کہ اگر ان ہی مادی حاجتوں کو خدا سے چاہے، تو خدائے متعال اس کی حاجتوں کو پورا کرے گا، کیونکہ اس نے خود موسیٰ سے فرمایا ''یا موسیٰ سلنی کل ماتحتاج الیہ حتی علف شاتک وملح عجینک[1]'' 'اے موسیٰ! اپنی تمام حاجتوں کو مجھ سے مانگو، یہاں تک بھیڑ کے چارہ اور خمیر کے نمک کو''انسان کا کمال اس میں ہے کہ ہر قسم کی حاجت خواہ مادی ہویا معنوی پوری کرنے کے لئے خدائے متعال سے رجوع کرے اور اس کے علاوہ کسی سے رجوع نہ کرے اور غیر خدا کو بلا واسطہ مؤثر نہ جانے اگر غیر خدا سے رجوع کیا تو خدائے متعال اسے نا اُمید کرتا ہے ''ان اللہ تبارک و تعالیٰ یقول: وعزتی وجلالی ومجدی وارتفاعی علی عرشی لأ قطعن امل کل مومل غیری بالیاس ولأ کسونہ ثوب المذلۃ عند الناس ولا نحینہ من قربی ولأبعدنہ من فضلی' ایومل غیری فی الشدائد والشدائد بیدی ویرجو غیری ویقرع بالفکر باب غیری؟ وبیدی مفاتیح الابواب وھی مغلقہ وبابی مفتوح لمن دعانی...[2]'' خدائے متعال فرماتا ہے:مجھے اپنی عزت و جلال، بزرگواری اور عرش پر عظمت کی قسم ہے جو کوئی میرے علاوہ کسی اور سے اُمید باندھے اس کی آرزوؤں کو نا اُمیدی میں تبدیل کر دوں گا اور لوگوں کے پاس اسے ذلیل و خوار کر کے رکھدوں گا اور اسے اپنے تقریب سے دور رکھوں گا اور اپنے فضل و کرم سے محروم کردونگا۔

وہ مشکلات میں دوسروں سے اُمید رکھتا ہے جبکہ مشکلات (کا حل) میرے ہاتھوں میں ہے ۔ میرے علاوہ غیروں سے امید رکھتا ہے اور اپنی فکر میں میرے علاوہ کسی اور کے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے، جبکہ تمام بند دروازوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں اور میرے چاہنے والوں کے لئے میرا دروازہ کھلا ہے۔افسوس کہ ہماری بہت سی دعائیں اور درخواستیں حقیقی نہیں ہیں،یعنی ہم خدا سے درخواست نہیں کرتے،چونکہ حقیقی مؤثر خدائے متعال ہے اور مناسب ہے کہ انسان صرف اسی سے درخواست کرے، اگر چہ انسان حاجت کے وقت اسی کے پیچھے دوڑتا ہے جو اس کی حاجت کو پورا کرے اور اگر روپیہ وپیسہ چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ اسی کے سامنے پھیلاتا ہے کہ جو اس کی مدد کرے یا کسب معاش کے پیچھے جاتا ہے تاکہ پیسے کما سکے، لیکن مومن شروع میں اپنے دل کو

---

[1] بحار الانوار ،ج۹۳،ص۳۰۳

[2] اصول کافی(باترجمہ)ج۳،ص۱۰۷

خدا سے وابستہ کرتا ہے اور اس سے طلب کرتا ہے چوں کہ اس نے دنیوی اسباب کو حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے وسیلہ قرار دیا ہے،لہٰذا ان کا سہارا چاہتا ہے، نہ اس لئے کہ وہ آزادو مستقل ہیں۔بہر حال جس قدر انسان کا دل خدا کی طرف متوجہ ہوجائے اور بارگاہ رب العزت سے اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے درخواست کرے،انسان کے کمال اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور خدا کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ خدا کی طرف توجہ کرنا کونسی گراں قدر کیمیا ہے، حتی کہ خدائے متعال سے مادی اور دنیوی حاجتوں کی درخواست بھی انسان کی روحانی تکامل و ترقی میں کس قدر مؤثر ہے: علامہ طبا طبائی اپنے استاد مرحوم آیت اللہ میرزا علی آقا قاضیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: بعض اوقات انسان خدا کی توجہ سے غافل ہوتا ہے اور خدائے متعال ایک مدت تک اپنے اس بندہ کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ ایک ''یا اللہ کہے، کیونکہ یہ ''یااللہ'' کہنا اور خدا کی طرف توجہ کرنا روح پر زیادہ اثر ڈالتا ہے اور اس کے دل کے نورانی ہونے کا سبب بنتا ہے۔

گزشتہ بیانات کے پیش نظر واضح ہوتا ہے کہ خدا کی طرف توجہ کس قدر روح کی ارتقاکے لئے مؤثر ہے حتی انسان عادی حالات میں جب ضرورت کازیادہ احساس نہ کرے خدا کی طرف متوجہ ہوجائے تو کس قدر اپنے کمال کی راہ میں آگے بڑھ سکتا ہے،البتہ وہ نہیں سمجھتا ہے اور صحیح طور پر سمجھنا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور اگر ہر چیز کے آثار مکمل طور پر آشکار ہو جائیں تو امتحان کما حقہ انجام نہیں پائے گا۔ بہت سی چیزیں مخفی اور پوشیدہ رہنی چاہئے تاکہ امتحان صحیح معنوں میں انجام پائے۔اس لئے انسان کو ہر گز خدائے متعال کو فراموش نہیں کرنا چاہئے اور اسے ہر چیز، یہاں تک اپنی مادی حاجتوں کو بھی خدا سے مانگنا چاہئے۔اسے توجہ کرنی چاہئے کہ اس کی دعا۔ حتی مادی حاجتوں کے لئے۔

اور خدا کی طرف توجہ خدا کی ربوبیت اور اس کی بندگی کا اقرار ہے اور اسی قدر توجہ بھی، اپنی مادی حاجتوں کے لئے درخواست،اس کی روح کے کمال کے لئے مؤثر ہے،اگر اس کی معرفت نشوونما پا کر اس کا ایمان قوی ہوجائے اور مادی امور کے علاوہ معنوی امور کے لئے بھی دعا کرے تو کیا بات ہے! دعا کرے کہ خدا اسے عبادت کی توفیق عنایت کرے، علم حاصل کرنے، لوگوں کی خدمت

کرنے اور گناہ سے پرہیز کرنے کی توفیق مرحمت کرے ۔ اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کیلئے، دوستوں، ہمسایوں، ہم کلاسوں، مومنوں، ان کے لئے جن کا اس پر حق ہے من جملہ اپنے استادوں کے لئے دعا کرے ۔اس سے عالی ترین گروہ، وہ لوگ ہیں کہ جب دعایا درخواست کرنا چاہتے ہیں، تو ان کی حمد و تسبیح الٰہی میں مشغولیت ان کے لئے دعا اور درخواست کرنے سے مانع ہوتی ہے جب وہ دعا کرنا چاہتے تو وہ خدا کے جلال و جمال کی صفات کی یاد میں پڑجاتے ہیں اور پروردگار کی مدح وثنا کرنے لگتے ہیں جس قدر اس کی ستائش کرتے ہیں سیر نہیں ہوتے ہیں۔

اس لئے ان کے لئے کوئی فرصت باقی نہیں بچتی تاکہ اپنے لئے کسی چیز کا مطالبہ کریں۔ جس عاشق کی نظر اس کے معشوق کے جمال پر پڑتی ہے، وہ خود کو نہیں دیکھتا ہے تاکہ اپنے معشوق سے اپنے لئے کوئی چیز مانگے۔ حتیٰ جو لوگ معرفت کے اس مرحلہ پر پہنچے ہیں، وہ پھر بھی احساس کرتے ہیں کہ خدائے متعال چاہتا ہے کہ عبودیت و بندگی کے آثار ان کے تمام اعضاو جوارح اور اس کے وجود کے تمام زاویوں سے ظاہر ہوں، جس طرح عبودیت و بندگی کے آثار یہ ہیں کہ انسان اپنی پیشانی کو مٹی پر رکھے، ذلت اور پستی کے عنوان سے بارگاہ الٰہی میں اپنے رخ کو خاک پر قرار دے، اس کی آنکھوں سے جمال الٰہی کے شوق کے آنسو یا عظمت الٰہی کے خوف کے آنسو جاری ہوجائیں اور دل کانپ اٹھے، اس طرح تمام اعضا و جوارح کے علاوہ زبان پر ذلت کے آثار رونما ہونے چاہئے اور زبان پر جاری ہونے والے عبودیت و بندگی کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ اپنے مولا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا ہے۔

بارگاہ الٰہی میں فقر و ناتوانی کے اظہار کی اہمیت: جب انسان کو معلوم ہوا کہ خدائے متعال اسے چاہتا ہے کہ اپنے پورے وجود اور اپنی پوری ظاہری اور باطنی طاقت کے ساتھ بندگی کا اظہار کرے، تو اسے جاننا چاہئے کہ وہ زبان سے بھی عاجزی، ذلت اور گدائی کا اظہار کرے اور یہ درخواست اور گدائی پرور دگار کی بارگاہ میں ذلت کی علامت ہے اور جنہوں نے اس کا مزہ چکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ گدائی کس عظمت و عزت کا سبب بنتی ہے۔ جو لوگ معرفت کے عالی مقامات تک پہنچے ہیں، وہ پھر بھی احساس کرتے ہیں کہ انہیں دعا کرنی چاہئے اور آثار بندگی کو زبان پر جاری کرنا چاہئے، یہ اظہار بندگی عبادت ہے اور موضوعیت رکھتا ہے۔ خدائے متعال

انسان سے چاہتا ہے کہ اس کی بارگاہ میں فقر و محتاجی کا اظہار کرے اور فطری بات ہے کہ جب انسان کے تمام اعضاو جوارح خدا کی بندگی کی راہ میں شائستہ اعمال انجام دینے کے لئے ہماہنگ ہوں اور من جملہ آثار بندگی، اظہار عجز و ناداری اور خدا سے درخواست زبان پر جاری ہو، تو انسان مطلوب نتیجہ تک پہنچتا ہے، کیونکہ انسان کے تمام قویٰ (طاقتیں) اور اعضاء و جوارح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ جب وہ دعا کرتا ہے، گویا اپنے تمام وجود سے بارگاہ رب العزت سے درخواست اور سوال کرتا ہے، تو فطری طور پر خدائے تبارکؑ و تعالیٰ کی وسیع رحمت اسے اپنے دامن میں لے لیگی۔ (واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃَ الداع اذا دعان...[1]) ''اور اے پیغمبر! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب ہوں پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں، جب بھی وہ پکارتا ہے۔ ''دعا میں انسان خدا سے کوئی چیز مانگتا ہے اور وہ بھی اسے عطا کرتا ہے۔ لیکن جس نے خدا ئے متعال کی مناجات اور اس کی محبت کا مزہ چکھا ہے، اس کے لئے سب سے بڑی لذت یہ ہے کہ جب وہ ''یا اللہ'' کہتا ہے تو اسے جواب میں ''لبیک'' کہا جائے۔

لیکن اگر کسی کا دل صرف خدا کی طرف متوجہ ہو اور دوسروں پر نظر نہ رکھتا ہو، تو درخواست کرتے وقت خدا وند متعال اسے عطا کرتا ہے۔ انسان کو ہر چیز خدائے متعال سے مانگنی چاہئے، اگر بھوکا ہے تو روٹی خدا سے مانگے اور اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں فقر و محتاجی کا اظہار کرے اور حضرت موسیٰؑ کی طرح کہے :(...رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر[2]) ''پرور دگارا! یقیناً میں اس خیر کا محتاج ہوں جس کو تونے میری طرف بھیجا ہے۔ ''حضرت موسیٰؑ نے اس بات کو اپنی زبان پر اس وقت جاری کیا، جب مصر سے بھاگ کر مدین روانہ ہونے اس وقت آپ کے پاس نہ غذا تھی اور نہ سونے کے لئے گھر۔ راتوں کو بیابانوں میں بغیر کچھ بچھائے ہوئے زمین پر سوتے تھے اور بھوک کی شدت کی وجہ سے بیابان کی گھاس کھاتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں... '':واللّٰہ ماسألہ اِلاخبزاً یاکلہ لأنہّ کان یاکل بقلۃ الارض ولقد کانت خضرۃ البقل تری من شفیف صفاق بطنہ لھزالہ

---

[1] بقرہ ۱۸۶
[2] قصص،۲۴

وتشذب لحمہ[1] خدا کی قسم، موسیٰ نے خدائے متعال سے کھانے کے لئے روٹی کے علاوہ کچھ نہیں مانگا تھا کیونکہ وہ زمین کی گھاس کھاتے تھے اور بے حد نحیف ولاغراور بدن پرگوشت کی کمی کی وجہ سے ان کے پیٹ کی نازک کھال کے نیچے سے گھاس کی سبزی دکھائی دیتی تھی۔ حضرت موسیٰ، مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک دن مدین میں دیکھا کہ کچھ لوگ کنویں سے پانی کھینچنے میں مشغول ہیں،اور دولڑکیوں کو دیکھا کہ ایک گوشے میں بیٹھے انتظار کر رہی ہیں تاکہ مرد چلے جائیں تو وہ اپنی بھیڑ بکریوں کے لئے کنویں سے پانی کھینچ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان دو لڑکیوں کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا: کس لئے یہاں آئی ہیں؟ جب حضرت موسیٰ ان کے مقصود سے آگاہ ہوئے، تو ہمدردی کی بنا پر کنویں سے پانی کھینچ کر ان کی بھیڑ بکریوں کو سیراب کیا۔ اس کے بعد یہ لڑکیاں اپنی بھیڑ بکریوں کے ہمراہ دور چلی گئیں اور زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے واپس آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرے باپ نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ ان کے پاس آجائیں تا کہ وہ آپ کو ہماری کمک کرنے کی اجرت دیں۔ جب موسیٰ ان لڑکیوں کے باپ، حضرت شعیبؑ کے پاس گئے تو انھوں نے اپنی بیٹیوں میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عقد میں قرار دیا اور اس کے بعد حضرت موسیٰ کی مادی زندگی،بیوی بچے اور آرام آسائشکا اہتمام ہوگیا۔

ی ہاں، اگر انسان دل کی گہرائی سے خدا سے کوئی چیز مانگے وہ اسے عنایت کرتا ہے۔ پھر ضروری نہیں ہے مفصل اور طولانی دعائیں پڑھے اور دعاؤں پر زیادہ وقت صرف کرے، کافی ہے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا سے درخواست کرے تاکہ اس کی درخواست قبول ہوجائے۔ لیکن جب انسان دعا پڑہتا ہے، حتی لمبی چوڑی اور مفصل دعائیں، لیکن غیر خدا سے بھی دلی توجہ رکھتا ہے، تو وہ دعا اثر نہیں رکھتی۔ اگر انسان روحی آمادگی کے علاوہ شائستہ اعمال بھی انجام دے تو اس کی دعا جلدی اثر کرتی ہے۔ شائستہ اعمال کے ساتھ دعا کی ضرورت:شاید ناشائستہ اعمال انجام دینے والوں کی دعا قبول نہ ہونے اور ان کے خدا سے درخواست

[1] نہج البلاغہ " ترجمہ فیض اسلام" خطبہ ١٥٩،ص٥٠٧

کرنے میں کامیاب نہ ہونے کی علت یہ ہو کہ وہ خدا کی طرف مکمل توجہ نہیں رکھتے ہیں۔ کیونکہ ناپسند اعمال غیر خدا سے دلبستگی حتی کسی ایسی چیز سے دلبستگی کا سبب بن جاتے ہیں کہ جو خدا کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ اس صورت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں حاضری دے؟ وہ لوگ خدائے متعال کی طرف خالصۃً اور مکمل توجہ کرتے ہیں، جن کے اعمال صالح وشائستہ اور آلودگی سے پاک ہوں۔ اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں "یا اباذر؛ یکفی من الدعاء مع البر ما یکفی الطعام من الملح" "اے ابوذر! شائستہ اور نیک اعمال کے ساتھ دعا کرنا ایسے کافی ہے جیسے غذا کے لئے نمک کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

جس طرح غذا کے لئے ایک خاص مقدار میں نمک ضروری اور کافی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح جو پسندیدہ اعمال بجالاتا ہے، جس مقدار میں غذا کے لئے نمک کا ہونا ضروری ہے، اسی مقدار میں اس کے لئے دعا کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور حقیقت میں انسان کی زندگی کے لئے دعا نمک کے مانند سعادت ہے پس ضروری نہیں ہے کہ انسان مسلسل دعا و درخواست کرتا رہے اور خدا سے درخواست و دعا کرنے کے فوراً بعد خدائے متعال اس کی درخواست کا جواب بھی دے، لیکن جن کے اعمال شائستہ نہیں ہیں اور دوسروں کی خدمت نہیں کرتے ہیں وہ اگر فراوان دعا بھی کریں تو معلوم نہیں ان کے لئے فائدہ مند ہویا نہ۔ اس مطلب کی بیشتر وضاحت کے لئے پیغمبر اسلام فرماتے ہیں "یا اباذر: مثل الذی یدعو بغیر عمل کمثل الذی یرمی بغیر وترٍ" "اے ابوذر! جو شخص عملِ شائستہ کے بغیر دعا کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جو کمان کے بغیر تیر چلاتا ہے"

جو دعا کرتا ہے، لیکن اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا وہ دعا کی اہمیت سے تو واقف ہے اور دعا میں سچا بھی ہے نیز در حقیقت خدائے متعال سے درخواست بھی کرتا ہے ہاں جو چیز اس میں ہے وہ یہ ہے کہ تمام امور میں اپنے فریضہ پر عمل نہیں کرتا ہے اور اس کی رفتار میں بندگی کے آثار نہیں پائے جاتے، کان، آنکھ وغیرہ۔ کے بارے میں کوتاہی برتتا ہے اور حقیقت میں وہ نفس کی بندگی کرتا ہے۔ ایسے شخص کو بھی خدا سے نا اُمید نہیں ہونا چاہئے، خدائے متعال اس سے کہیں زیادہ کریم ہے کہ جو اس کے در پر آئے اور وہ، اسے نکال باہر کرے اور کوئی جواب نہ دے۔ لیکن ایسے شخص کی حالت اس انسان سے بہت ہی متفاوت ہے کہ

جس کی تمام سرگرمیوں اور رفتاروں میں خدا کی بندگی کے آثار و جلوے نمایاں ہوں اور وہ تمام وجود کے ساتھ اپنے معبود کی بندگی کے راستہ پر گامزن ہو اور انجام فرائض اور خلق و خالق کی خدمت میں ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہ کرتا ہو۔ ان دو شخصوں کی درخواست اور دعا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چاہتا ہو کہ ایک تیر کو نشانہ پر چلائے مگر وہ تیر کو ہاتھ سے پھینکتا ہے، تو اس کی مسافت بہت کم ہوتی ہے اور تیر کما حقہ نشانہ پر نہیں لگتا ہے، لیکن اگر اسی تیر کو چلۂ کمان میں رکھ کر چلایا جائے تو اس کی مسافت کئی گنا زیادہ ہو گی اور تیر نشانہ پر بھی لگے گا۔ شائستہ عمل کے بغیر دعا کرنے والے کی مثال اس شخص کی جیسی ہے کہ کمان کے بغیر تیر چلاتا ہے، یقیناً اس کے تیر کی مسافت اور دوری بہت کم ہوگی۔ مذکورہ گفتگو کے پیش نظر انسان کی زندگی میں دعا کا نقش اور اثر واضح اور روشن ہو گیا کہ دعا اس نمک کے مانند ہے جسے غذا میں ڈالا جاتا ہے، انسان کی زندگی سرا سر خدا کی بندگی اور عبادت ہونی چاہئے۔

خواہ انفرادی حیثیت میں یا خاندانی روابط کے بارے میں، ہمسایوں کے بارے میں یا سماج اور خدا کے بندوں کے بارے میں، انسان کے رفتار و اعمال سے بندگی کے اثرات ظاہر ہونا چاہئے، ضمناً دعا بھی کرے۔ کیونکہ یہی دعا خدا کی بندگی کا اثر ہے جو زبان سے ظاہر ہوتا ہے (اور یقیناً وہ درخواست اور دعا اور توجہ صمیم قلب سے ہونی چاہیے۔)

دوسرا نکتہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان سے واضح ہے، وہ یہ ہے کہ انسان نیک اور شائستہ اعمال سے اپنے مقاصد تک بہت جلد پہنچتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کے مانند ہوتی ہے جو کمان سے تیر چلاتا ہے اور اس کا تیر فوری طور پر نشانہ پر لگ جاتا ہے۔ وہ اس شخص کے مانند ہے جس کی غذا آمادہ ہے اور اس میں صرف تھوڑا سا نمک ملانا باقی ہے تاکہ کھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ پس نیک اور شائستہ اعمال انسان کو اپنی خواہشات تک پہنچاتے ہیں۔

البتہ افراد کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں وہ لوگ جو خدا کی بندگی کے اعلی ترین درجہ تک جا پہنچے ہیں، ان کی خواہشات بہت بلند ہیں، ان کی خواہشات جیسے: قرب الٰہی، لوگوں سے بے نیازی اور دنیا و آخرت کی سعادت کو حاصل کرنا نیز خدا کی عنایت کردہ نعمتوں کا ہمیشہ

ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ وہ معتقد ہیں کہ صرف خدائے متعال ان کی خواہشات کو پورا کرتا ہے نہ کہ کوئی اور۔ لیکن جو لوگ بندگی اور خدا کی معرفت کے ادنی درجہ پر فائز ہیں، وہ اپنے شکم، گھر اور لباس کی فکر میں ہیں اور ان کی خواہشات بھی انہیں چیزوں سے مربوط ہوتی ہیں، البتہ خدائے متعال ان کی حاجتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ حقیقت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان انسان کے اپنے نفس کی اصلاح کرنے اور فرائض انجام دینے کے لئے ایک تشویق ہے تاکہ وہ جلدی اپنے مقاصد تک پہنچ جائے اور خدائے متعال اس کی دعا کو قبول کرے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس کی دعا اپنے بارے میں ہویا دوسروں کے بارے میں، اس کی خواہشات دنیوی ہوں یا معنوی و اخروی پس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کو نیک اعمال انجام دینے کی تشویق فرماتے ہیں، اگر چہ نیک اعمال کے حقیقی آثار اور شائستہ پاداش اور حقیقی اعمالِ خیر آخرت میں ظاہر ہوں گے اور یہ دنیا صرف کام کرنے کی جگہ ہے اور اعمال کی پاداش آخرت میں انسان کو ملے گی۔

''ان الیوم عمل ولا حساب وغداً حساب ولا عمل[1]...'' ''بیشک آج کام کا دن ہے اور حساب کا دن نہیں ہے اور کل حساب کا دن ہے اور کسی کو کام کرنے کی مہلت نہیں ہوگی''ایک دوسری حدیث میں آیا ہے'':الدنیا مزرعۃ الآخرۃ[2]''''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

''یہاں پر بیج بویا جاتا ہے اور آخرت میں فصل کاٹی جاتی ہے، لیکن خدائے متعال اپنی بے انتہا مہربانیوں کی بنا پر کبھی بعض اعمال کے آثار اور ان کے نمونے اسی دنیا میں نیک افراد کو عنایت فرماتا ہے تاکہ عمل خیر کی انجام دہی میں رغبت پیدا ہو اور انجام وظیفہ کے بلند عہدہ پر فائز ہوں۔ اگر چہ کمال کے عالی مقامات پر فائز ہوئے افراد اس طرح کی توفیق کے محتاج ہی نہیں ہوتے چاہے جس قدر بھی وہ ان آثار کو دیکھیں ان کے یقین میں اضافہ نہیں ہوتا ہے'':لوکشف الغطاء لم ازادت یقینا[3]...''''اگر پردے ہٹا دیئے جائیں

---

[1] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۴۲، ص ۴۰
[2] بحار الانوار ج ۷۰، ص ۲۲۵
[3] بحار الانوار ج ۴۰، ص ۱۵۳

تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا ۔ ''جن کے سامنے سے تمام پردے نہیں ہٹائے گئے ہیں، وہ ہمت افزائی کے مستحق ہیں تاکہ وہ خدا کی بندگی اور تکامل وترقی کی راہ میں آگے بڑھیں۔ ان تشویقوں میں سے ایک یہ ہے کہ خدائے متعال اسی دنیا میں خیر و برکت کے آثار ان پرنازل فرماتا ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے :(ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکاتٍ من السمآء والارض[1]) ''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔''

شائستہ اورصالح انسان کے وجود کی برکتیں:مذکورہ بیانات سے بالاتر،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد والے جملہ میں نیک اور شائستہ اعمال کے لئے کچھ ایسے آثار بیان فرماتے ہیں جو ناقابل تصور ہیں اور انسان توقع نہیں رکھتا کہ اس کے نیک اعمال ایسے شائستہ آثار رکھتے ہوں گے۔ ''یا اباذر؛ ان اللہ یصلح بصلاح العبد ولدہ وولد ولدہ ویحفظہ فی دویرتہ والدور حولہ مادام فیھم''''اے ابوذر!خدائے متعال شخص کے صالح ہونے پر اس کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں کی اصلاح فرماتا ہےاور اسے اپنے گھر میں نیزاور اس کے ہمسایہ کے گھروں میں ان کے زندہ رہنے تک ان کی حفاظت کرتا ہے ''

جو لوگ خدا کی بندگی کے مالک ہیں،خدائے متعال انہیں اس دنیا میں خطرات سے بچاتا ہے اور ان کے وجود کی برکت سے ان کی اولاد کو پشت درپشت تحفظ بخشتا ہے، حتیٰ اہل محلہ اور اس شہر کے باشندوں کی بلاؤں سے حفاظت کرتا ہے جس میں صالح و شائستہ انسان زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح ایسے افراد کے وجود کی شعائیں اور معنوی برکتیں گرد و نواح کے لوگوں کو بھی شامل ہوتی ہیں۔ مومنوں کی وجودی شعاعیں یکساں نہیں ہوتیں، بعض صرف اپنے اہل وعیال سے رابطہ رکھتے ہیں، کچھ اپنے ہمسایوں اور اہل محلہ سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور کچھ اس سے بڑھ کر ایک شہر حتی ملک کے لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ ایران کے تمام لوگوں،بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں بلکہ اس سے بڑھ کر تمام مستضعفان عالم سے رابطہ رکھتے تھے۔

---

[1] اعراف۹۶

ان کی وجودی شعاعیں ایک شہر اور ایک ملک سے بڑھ کر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ خدائے متعال نے اس شائستہ و برگزیدہ انسان کی برکت سے لاکھوں انسانوں کو اپنی عنایتوں سے نوازا۔ یقیناً خدا وند متعال نہ صرف صالح وشائستہ انسان کی حفاظت کرتا ہے، اسے برکتیں عطا کرتا ہے، اس کی دعائیں قبول کرتا ہے اور بلاؤں کو اس سے دور کرتا ہے، بلکہ اس کے وجود کی خیر و برکت دوسروں، اس کی اولاد، محلہ والوں حتی ملک بھر کے لوگوں تک پہنچتی ہے اور اس کے قابل قدر وجود کی برکت سے بلائیں دور ہوتی ہیں۔ شائستہ اور صالح بندہ کا یہ قابل قدر نقش اور اثر، انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ خدا کی راہ میں قدم اٹھانے اور اس کے فرمان کی اطاعت میں نہ جانے کونسا گراں بہا کیمیا ہے کہ اس کے آثار انسان کے وجود کے حدود سے بڑھ کر دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کیا مناسب نہیں ہے کہ انسان ان کاموں کو انجام دینے کے بجائے کہ امید وار ہو کہ نتیجہ خیز ہوگا، لیکن معلوم نہیں کہ خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوگا یا نہیں، ان ساری دنیوی زحمتوں کی اٹھانے کے بجائے اس امید میں کہ ان کا کوئی ثمرہ ہوگا، اپنی عمر کے لمحوں کو فرائض کے انجام دینے اور حکم خدا کو بجالانے میں صرف کرے تاکہ اس کی دنیوی خواہشات بھی پوری ہوجائیں اور اخروی خواہشات بھی، خدا کی برکتیں خود اس کو بھی ملیں اور اس کے اہل و عیال، آئندہ نسل حتی ہمسایوں، شہر اور ملک کے لوگوں تک پہنچیں، اس سے بڑھ کر کونسا فائدہ مند اور مفید کام ہو سکتا ہے؟

کیا تجارت اور کسب معاش کرنے والے اپنے مطلوبہ تمام دنیوی نتائج کو اخذ کرتے ہیں؟ کبھی ان کا فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ ہاں، اگر وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں تو ان کو کیا ملتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خوشی کے کچھ دن گزارتے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا، کہ کبھی ایک صالح وشائستہ بندے کی دعا ایک شہر کے لوگوں کو بلاؤں سے بچاتی ہے اور لوگوں کے لئے برکتیں نازل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یقینا، اولیائے الٰہی اور شائستہ انسانوں کے وجود کی وجہ سے ہم سے بہت ساری بلائیں دور ہوتی ہیں اور ان کی دعاؤں کی بدولت بے شمار توفیقات ہمیں نصیب ہوتی ہے، ممکن ہے ہم انہیں نہ پہچانتے ہوں۔ ممکن ہے ہمارے آباء و اجداد نے نیک کام انجام دیئے ہوں جن کی وجہ سے خدا نے اس وقت ہمیں توفیقات عنایت کی ہے۔ ممکن ہے ہمارے اساتذہ اور بزرگوں

نے ہمارے حق میں دعائیں کی ہوں یا ہمسائے اور مومنین نصف شب ہمارے لئے دعا کرتے ہوں اور انہی دعاؤں کے اثر سے خدائے متعال نے اپنی توفیقات سے ہمیں نوازا ہو،اور ہم سے بلائیں دور کی ہوں۔ ہمیں کیا پتہ ہے کہ یہ برکتیں اور نعمتیں کہاں سے آئی ہیں اور کس کے ذریعہ یہ بلائیں ہم سے دور ہوئی ہیں؟اور ہم کیا جانتے ہیں کہ ایک بندہ صالح کی نصف شب کو خدا سے اس کے حق میں کی جانے والی دعا کی کیا برکتیں ہوں گی؟ لیکن خدائے متعال نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اور روایتوں میں بھی آیا ہے کہ خدائے متعال شائستہ انسانوں کی برکتوں سے دوسروں کو نعمتیں عطا کرتا ہے، اور لوگوں سے بعض بلاؤں کو دور کرتا ہے:اس سلسلہ میں قرآن مجید کے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۱ کو شاہد کے عنوان سے پیش کیا جاسکتا ہے:(...ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعضٍ لفسدت الارض ولٰکن اللہ ذو فضلٍ علی العالمین) ''اور اگر اسی طرح خدا بعض کو بعض کے ذریعہ سے نہ روکتا رہتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن خدا عالمین پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

''یونس بن ظبیان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے حسب ذیل ہے'':ان اللہ یدفع بمن یصلّٰی من شیعتنا عمن لا یصلّٰی من شیعتنا ولو اجمعوا علی ترک الصلاۃ لھلکوا ، و ان اللہ یدفع بمن یصوم منھم عمن لا یصوم من شیعتنا ولو اجمعوا علی ترک الصیام لھلکوا وان اللہ یدفع بمن یزکی من شیعتنا عمن لایزکی منھم ولواجتمعوا علی ترک الزکاۃ لھلکوا وان اللہ لیدفع بمن یحج من شیعتنا عمن لایحج منھم ولوا جتمعوا علی ترک الحج لھلکوا ' ھو قول اللہ تعالیٰ: ''ولولا دفع اللہ الناس... ''فو اللہ ما انزلت الافیکم ولا عنی بھا غیرکم[۱] ''خدائے متعال نماز پڑھنے والے ہمارے شیعوں کے طفیل سے نماز نہ پڑھنے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے اور اگر سب نماز نہ پڑھیں تو ہلاک ہوجائیں گے۔ خدائے متعال ہمارے روزہ رکھنے والے شیعوں کے وجود کی برکت سے روزہ نہ رکھنے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے اور اگر سب روزہ کو ترک کردیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ خدائے متعال ہمارے زکوٰۃ دینے والے شیعوں کے طفیل سے زکوٰۃ نہ دینے والے شیعوں سے بلا کو دور کرتا ہے،اور اگر اجتماعی طور پر سب زکوٰۃ دینا ترک کردیں تو ہلاک ہوجائیں گے۔

---

[۱] تفسیر عیاشی ،ج۱،ص۱۳۵

خدائے متعال حج کو بجا لانے والے ہمارے شیعوں کے طفیل سے حج بجانہ لانے والوں سے بلا دور کرتا ہے اور اگر سب حج کو بجالا ناترک کردیں تو ہلاک ہوجائیں گے۔ یہ (مطلب) خدا کا فرمان ہے: ''اگر خدائے متعال بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے وسیلہ سے نہ روکتا۔'' خدا کی قسم یہ آیت نازل نہیں ہوئی مگر آپ کے حق میں اور اس سے آپ (شیعوں) کے علاوہ کسی کا قصد نہیں ہوا ہے۔ ''صالح انسانوں کا معاشرے میں نقش، ان کی وجہ سے لوگوں کو نصیب ہونے والی برکتوں اور ان کی وجہ سے خدائے متعال کا لوگوں کی بلاؤں کو دور کرنے کے پیش نظر توجہ کرنی چاہئے کہ انسانوں اور انبیاء میں برترین، یعنی خاتم الانبیاء حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کہ صاحب علم اولین و آخرین ہیں اور تمام عالی انسانی صفات و بلند معنوی کمالات آپ کے وجود میں اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے وجود میں جمع ہیں اور ہر قسم کی خطا اور گناہ سے معصوم ہیں، وہ تمام برکات الٰہی کے سرچشمہ ہیں اور کائنات ان کے وجود کے طفیل سے ہے۔

چنانچہ ذات مقدس الٰہی نے فرمایا ہے۔'' :وعزتي وجلالي لولاك لما خلقت الافلاك[1]'' مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے کہ اگر تم نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہیں کرتا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ائمہ اطہار علیہم السلام کا وجود مقدس سبب بنا ہے کہ پرور دگار عالم نے کائنات کو باقی رکھا ہے اور اپنی مخلوقات پر مسلسل برکتیں اور نعمتیں نازل کی ہیں حجت خدا کے وجود مقدس کی برکت سے بہت سی بلائیں دور ہوتی ہیں، کیونکہ اگر دنیا حجت خدا سے ایک لمحہ کے لئے محروم ہوتی، تونا بود ہوجاتی۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں'': نحن ائمۃ المسلمین وحجج اللہ علی العالمین.ولولا مافی الارض منالساخت بأھلھا، ثم قال علیہ السلام: ولم تخل الارض منذ خلق اللہ آدم من حجۃ للہ فیھا ظاہرٍ مشھودٍ اوغائبٍ مستورٍ ولا تخلوُ الی ان تقوم الساعۃ من حجۃ للہ فیھا ولولا ذلک لم یعبد اللہ قال سلیمان فقلت للصادق علیہ السلام فکیف ینتفع الناس بالحجۃ الغائب المستور؟ قال علیہ السلام، کما ینتفعون بالشمس اذا سترھا السحاب[2]'' ''ہم مسلمانوں کے پیشوا اور عالمین پر خدا کی حجت ہیں۔ اور اگر زمین ہم سے خالی ہو جائے تو

[1] بحار الانوار ،ج۲۳ص۵
[2] بحار الانوار ،ج۲۳ص۵

وہ باشندوں کو نگل لے گی۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا: جب سے پروردگار عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے، زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہی ہے اور وہ حجت خدا یا ظاہر بظاہر شناختہ شدہ ہے یا غائب اور دوسروں کے لئے ناشناس، اور قیامت تک زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہے گی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی عبادت نہیں کی جا سکتی (یعنی کوئی باقی نہ رہتا جو خدا کی عبادت کرتا) سلیمان راوی نے سوال کیا: لوگ کیسے غائب حجت خدا سے استفادہ کر سکتے ہیں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: جس طرح ابر کے پیچھے پوشیدہ سورج سے استفادہ کرتے ہیں''

پانچواں درس

خداوند متعال کے نزدیک مخلص بندے کی قدر و منزلت

یا اباذر ، ان ربک عزوجل یباهی الملائکة بثلاثة نفر: رجل فی ارض قفر فیوذن ثم یقیم ثم یصلی ، فیقول ربک للملائکة: انظرو الی عبدی یصلی ولایراه احد غیری فینزل سبعون الف ملک یصلون وراء ه ویستغفرون له الی الغد من ذلک الیوم ورجل قام من اللیل فصلی وحده فسجد و نام وهو ساجد ، فیقول تعالیٰ: انظروالی عبدی ، روحه عندی وجسده ساجد ؛ ورجل فی زحفٍ فر اصحابه وثبت هو ویقاتل حتی یقتل ،،

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کے اس حصہ کا مضمون یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بندوں میں سے تین گروہ کے بارے میں فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے ۔ البتہ خدا وند متعال کے فخر و مباہات کا کیا معنی ہے اور وہ اپنے فرشتوں پر کیسے فخر کرتا ہے، یہ صحیح طور پر ہمیں معلوم نہیں ہے ۔ اس روایت کے اس حصہ سے جو کچھ استفادہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ بندگان خدا کے تین گروہوں کا مقام فرشتوں سے برتر ہے اور خدائے متعال ان کے بلند مقامات اپنے فرشتوں کو دکھلاتا ہے ۔

انسان کی بلندی اور برتری کا معیار :اس میں کوئی شک نہیں ہے خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں، انسان کو بعض امتیازات اور خصوصیات سے بہرہ مند فرمایا ہے کہ جوباقی تمام مخلوقات میں نہیں پائی جاتی ہیں ۔ مادی مخلوقات میں اسے عقل و فہم اور آگاہی عطا کی ہے، یہاں تک اسے کرامت بخشی اور خشکی اور دریاؤں کو اس کے لئے مسخر کردیا :(ولقد کرّمنابنی آدم وحملنا هم فی البر و البحرورزقنا هم من الطیبات وفضّلنا هم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً[١]) ''اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے ۔ ''اس کے علاوہ خدائے متعال نے انسان کو ایک صاحب اختیار اور انتخاب کرنے والی مخلوق پیدا کیا ہے، تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق سعادت یاشقاوت کے راستہ کا انتخاب کرے ۔ اور اسے فطرت الٰہی عطا کی تاکہ اس کیذریعے سے تمام اقدار، خوبیوں اور الٰہی، فضائل

---

[١] اسراء، ٧٠

کی طرف رجحان پیدا کرے اور اسے راہ سعادت بھی دکھایا۔ لیکن نہ تو وہ تکوینی کرامت انسان کے لئے فرشتوں پر برتری کا باعث ہے اور نہ ہی انتخاب اور اختیار کا عنصر، کیونکہ ممکن ہے انسان اختیار و انتخاب کے اسی گراں بہا عامل کے ذریعہ خوش بختی اور عادت کی راہ کے بجائے بغاوت اور شقاوت کا راستہ اختیار کرے اور حق کی ڈگر سے منحرف ہوجائے اور گمراہی میں گر کر ذلیل ترین مخلوقات میں شمار ہوجائے :(ان شرّ الدواب عند اللّٰہ الذین کفروا فھم لا یؤمنون[1]) ''زمین پر چلنے والوں میں بدترین افراد وہ ہیں جنھوں نے کفر اختیار کرلیا اور اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

جو چیز انسان کے مقام کو فرشتوں کے مقام سے بڑھا کر برتری اور فضیلت کا سبب بنتی ہے وہ دستورات الٰہی پر عمل کرنا، انسان کے معنوی تکامل و ترقی کے لئے کوشش اور مطلوبہ کمال تک پہنچنا ہے۔ یعنی انسان اپنی الٰہی فطرت کی بنیاد پر سعادت کے راستہ کا انتخاب کرے اپنی اور نفسانی خواہشات کو کچل دے اور اپنی مادی جبلتوں کی اصلاح کرے۔ جو انسان حیوانی اور مادی کشش کی توانائیاں رکھتا ہے، وہ انھیں کسی بھی وقت اس مادیات اور حیوانی لذتوں کی طرف کھینچ سکتی ہے، جب وہ حیوانی توانائی پر کنٹرول حاصل کرے اور حق وباطل سے رو برو ہوتے وقت حق کو انتخاب کرے اور فطرت کی بنیادوں پر عمل کرے، تو وہ مسجود ملائکہ بن جاتا ہے اور اس کا مقام ملائکہ کے مقام سے برتر ہوتا ہے۔

اسی لئے حدیث کے اس حصہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں''یا اباذر' ان ربک عزوجل یباھی الملائکة بثلاثة نفر: رجل فی ارض قفرٍ فیوذن ثم یقیم ثم یصلی، فیقول ربک للملائکة: انظروا الی عبدی یصلی ولایراہ احد غیری فینزل سبعون الف ملک یصلون وراءہ ویستغفرون لہ الی الغد من ذٰلک الیوم'''' اے ابوذر! تیرا پروردگار تین افراد کے بارے میں فرشتوں پر فخر کرتا ہے: پہلا شخص جس کے بارے میں خدا وند متعال فرشتوں پر افتخار کرتا ہے وہ ہے کہ جو کسی بیابان میں اذان واقامت کہے اور نماز قائم کرے۔ پروردگار فرشتوں سے کہتا ہے: میرے اس بندے کو دیکھو جو اس حالت میں نماز پڑھ رہا ہے جبکہ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا ہے، اس

[1] انفال،۵۵

وقت ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور اس کی اقتدا کرتے ہیں اور دوسرے دن تک اس کے لئے استغفار کرتے ہیں ''دوسرا شخص جس کے لئے خدائے متعال فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے'':ورجل قام من اللیل فصلّٰی وحدہ فسجد ونام وھوساجد فیقول تعالی: انظروا الی عبدی، روحہ عندی وجسدہ ساجد''''اور وہ شخص جو رات کو نیند سے بیدار ہوتا ہے اور تنہائی میں نماز پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے اور سجدہ میں سوجاتا ہے، تو خدائے متعال فرماتا ہے: (اے فرشتو!) میرے بندے کو دیکھو اس کی روح میرے پاس ہے اور اس کا بدن سجدے میں۔''جو شخص نصف شب کو آرام دہ اور گرم بستر سے اٹھتا ہے، میٹھی نیند کو چھوڑتا ہے اور اپنے پروردگار سے عبادات و مناجات میں مشغول ہوتا ہے۔

اور وہ اپنے معبود کی مناجات میں اس قدر غرق ہوجاتا ہے کہ سجدہ سے سر نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ اسے نیند آتی ہے، تو خدائے متعال اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: دیکھ لو، میرا بندہ نصف شب کو آرام و آسائش کے بستر سے اٹھا ہے اور لوگوں کی نظروں سے دور میری مناجات اور عبادت میں مشغول ہے۔ وہ اپنی عبادت میں اس قدر طول دیتا ہے کہ تھک کر سجدہ میں سوجاتا ہے۔ اس کی روح میرے پاس ہے لیکن اس کا جسم سجدہ میں پڑا ہے۔

خدا وند متعال فرماتا ہے: اس کی روح میرے پاس ہے، کیونکہ نیند کی حالت میں انسان کی روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے، اور یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے: (اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضیٰ علیھا الموت ویرسلُ الاخری الی اجلٍ مسمی[1]) ''اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلالیتا ہے اور جو نہیں مرتے ان کی روحوں کو بھی نیند کے وقت طلب کرلیتا ہے اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کرلیتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسرے کی روحوں کو ایک مقررہ مدت کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔''قرآن مجید کی نظر میں حقیقی مومن وہ ہے جو اپنے پرور دگار کی بندگی اور عبادت کے لئے نصف شب کو بستر سے اٹھے اور نیند کو اپنے لئے حرام قرار دے: (تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم وفاوطمعاً[2]...) ''ان

---

[1] زمر، ۴۲
[2] سجدہ، ۱۶

کے پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پرور دگار کو خوف اور طمع کی بنیاد پر پکار تے رہتے ہیں۔ ''جی ہاں، دوسروں کی نظروں سے دور نماز شب قائم کرنا اور طولانی سجدے انجام دینا اور خدا کے حضور میں تعظیم بجالا نا خدا کے لئے فخر و مباہات کا سبب بن جاتا ہے۔ تیسرا شخص کہ جس کے ذریعے خدائے متعال فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے'' :ورجل فی زحف فرا صحابہ وثبت ھو ویقاتل حتی یقتل'''' اور وہ شخص جو میدان جہاد میں ہو، اس کے دوستوں نے فرار کی ہو اور وہ ثابت قدمی کے ساتھ جہاد کو جاری رکھے یہاں تک قتل ہو جائے۔ ''خدائے متعال اس مجاہد سورما پر فخر و مباہات کرتا ہے، کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد دوسرے لوگ دشمنی کے مقابلہ میں تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ گئے ہوں اور وہ اکیلا ہی دشمن کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک لڑتا رہے، باوجود اس کے کہ دوسروں کی طرح بھاگ کر وہ بھی اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن وہ خدا کی راہ میں شہید ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔

جی ہاں، خدائے متعال اس شخص پر فخر کرتا ہے، جو یار و یاور کے بغیر دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے، جبکہ ایسی حالت میں استقامت کرنا واجب نہیں ہے: صدر اسلام میں ابتدا میں ایک آدمی کا دس افراد کے مقابلے میں مقاوت کرنا واجب تھا اس کے بعد تخفیف دیدی گئی اور ایک آدمی کا دو افراد کے مقابلہ میں مقاومت کرنا واجب ہوا، لیکن اگر سب چلے گئے اور وہ تنہا رہ گیا، تو اس کے لئے واجب نہیں ہے۔ بیشک، دشمن کے مقابلہ میں مقاومت کرنے کی توانائی رکھنے کی صورت میں جنگ سے فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے اور قرآن مجید نے واضح طور پر جنگ سے فرار کرنے کو منع کیا ہے اور اس عمل کو خدا کے غضب کا سبب بیان کیا ہے اور جنگ سے بھاگنے والے کی جگہ جہنم بتائی ہے :(یا ایھا الذین آمنوا اذا لقیتم الذین کفرو ازحفاً فلا تولوھم الأدبار ومن یولھم یومئذٍ دبرہ الا متحرفاً لقتالٍ او متحیزاً الی فءۃٍ فقد باء بغضبٍ من اللّٰہ وماواہ جہنم وبئس المصیر[1]۔) ''اے ایمان والو! جب کفار سے میدان جنگ میں ملاقات کرو تو خبر دار انہیں پیٹھ نہ دکھانا۔ اور جو آج کے دن پیٹھ دکھائے گا وہ غضب الٰہی کا

[1] انفال،۱۵و ۱۶

حق دار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جو بدترین انجام ہے علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کے پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیں''روایت کے اس حصہ سے بہت سے درس حاصل کئے جا سکتے ہیں: خدائے متعال کا اپنے بعض بندوں کے وجود کا ملائکہ پر فخر کرنا، اس معنی میں ہے کہ وہ ایسی اقدار کے مالک ہیں جن کی خدا کے پاس بہت اہمیت ہے، اگر دوسری خصوصیات ہوتیں جو انسان کے لئے بیشتر کمال کا سبب بنتیں اور خدا کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہوتیں، تو خدائے متعال ان کا ذکر کرتا۔ جب خدائے متعال اپنے بعض بندوں کے بلند مقامات کو فرشتوں کے سامنے تعارف کرانا چاہتا ہے اور ان پر فخر کرتا ہے، تو حقیقت میں ان کے بہترین اقدار کو بیان کرتا ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ خدا کے بندوں کے وہ تین گروہ جو ایک بیابان میں لوگوں کی نظروں سے دور، آداب و مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھتا ہے اور جو نصف شب آرام و آسائش کے وقت بستر سے اٹھ کر خدا کی عبادت و مناجات میں مشغول ہوجاتا ہے اور وہ جو میدان کار زار میں دشمنوں کی بڑی تعداد کے سامنے اکیلا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک جام شہادت نوش کرتا ہے کن خصوصیات کے حامل ہیں اور کن پہلوؤں میں مشترک ہیں کہ خدائے متعال انہیں اس حد تک مقام و منزلت بخشتا ہے؟

یقیناً خدا کی راہ میں مال کے انفاق یا حسب ضرورت ایثار و قربانی یا عبادتیں اور دوسرے نیک اعمال، کہ جن کی شرع مقدس میں تاکید کی گئی ہے، سب قابل قدر و اہمیت اور انسان کے کمال کے سبب ہیں، لیکن دیکھنا چاہئے وہ تین گروہ کن خصوصیتوں کے حامل ہیں اور ان میں کون سے مشترک عناصر پائے جاتے ہیں کہ اس حد تک ان کی تاکید کی گئی ہے؟ان تین گروہوں میں خصوصیت اور مشترک عنصر تنہا ہوناہے پہلا شخص دوسروں کی نظروں سے دور تنہائی میں عبادت کرتا ہے اور دوسرا شخص نصف شب کو نیند سے اٹھ کر تنہائی میں مناجات کرتا ہے اور تیسرا شخص بھی دشمن کے سامنے تنہا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ خدائے متعال اس شخص کے ثواب پر فخر و مباہات نہیں کرتا ہے جو محلہ کی مسجد میں یا جامع مسجد میں نماز پڑھتا ہے بلکہ اس پر فخر کرتا ہے جو بیابان میں تنہائی میں عبادت کرتا ہے یا اس کے سب دوست محاذ جنگ سے بھاگ گئے ہیں اور وہ تن تنہا دشمن سے مقابلہ کر رہا ہے۔ ممکن ہے کسی

شخص نے دسیوں حملوں اور جنگی معرکوں میں حصہ لیا ہو اور بہت سی شجاعتوں کا مظاہرہ کیا ہو متعدد فتح و کامرانیاں بھی حاصل کر چکا ہو، لیکن اس کے باوجود تاکید اس شخص پر ہے جو محاذ جنگ میں تنہا رہ گیا ہے پھر بھی اپنا فریضہ انجام دینے میں مشغول ہے۔آزادی و اخلاص کا اثر:الف: عامل استقلالدو مہم عامل ،استقلال یعنی دوسروں کا اثر قبول نہ کرنا اور اخلاص، ان تین اشخاص کے انفرادی اقدام کی عظیم اہمیت کا سبب واقع ہوئے ہیں: پہلے عامل کی وضاحت،یعنی استقلال کی وضاحت میں یہ کہنا بہتر ہے کہ: اکثر لوگ دوسروں کے الہامات اور رفتار سے متأثر ہوتے ہیں انسان کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ ایک راہ پر جارہے ہیں اور ایک رفتار انجام دے رہے ہیں، وہ بھی اسی راہ پر چلنا چاہتا ہے اور اس رفتار کی طرف میلان پیدا کرتا ہے۔

گویا دوسروں کا اقدام اور ان کی روش انسان کے لئے راستہ کے انتخاب کرنے اور اس پر چلنے کا ایک ایسا عامل ہے جو اس کی مدد کرتا ہے: جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ خیر و صلاح کی راہ پر گامزن ہیں، تو وہ بھی ان کی پیروی کرتا ہے۔ البتہ یہ انسان کے لئے ضعف و کمزوری کی علامت ہے اور خدائے متعال نے انسان میں یہ عنصر قرار دیا ہے تاکہ جو لوگ ضعیف ہیں، صالح افراد کی پیروی کرکے صحیح راستہ کا انتخاب کریں۔

اگر چہ ایسے افراد غلط اور برے ماحول سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ممکن ہے دوسروں سے وابستگی اس امر کا سبب بنے کہ انسان دوسروں کی پیروی میں باطل راستہ کو پسند کرے اور حالات اور شرائط کے بدلنے کے ساتھ وہ بھی تبدیل ہو جائے اور رسوائی سے بچنے کے لئے وہ بھی انھیں کے رنگ میں ڈھل جائے۔ خدائے متعال ایسے ضعیف انسانوں کے انجام کے بارے میں کہ جو سوچے سمجھے بغیر اہل باطل کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اپنے اختیار کی لگام دوسروں کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں والوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:(واذا قیل لھم اتبعو امانزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا اولو کان آباوھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون[1]۔ "'' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں ہم اس کا اتباع کریں گے جس

---

[1] بقرہ ۱۷۰

پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں"؛ البتہ احکام الٰہی اور شرعی فرائض کے بارے میں، جو شخص آگاہی اور پہچان نہ رکھتا ہو، اس پر فرض ہے کہ عالم سے پوچھ لے، خواہ وہ حکم خدا کے بارے میں جاہل ہو یا حکم خدا کے موضوع کے بارے میں (یہ دین میں فقیہ اور مجتہد کی تقلید کرنے کے معنی میں ہے) البتہ یہ شخص جو تقلید کے ذریعہ احکام خدا سے آگاہ ہوتا ہے اس شخص کے برابر نہیں ہے جو محنت و مشقت کر کے احکام دین کو خود استنباط کرتا ہے، کیونکہ مجتہد اور عالم کی معرفت استقلالی ہے اور جاہل کی معرفت تقلیدی، اور یہ دونوں یکساں نہیں ہیں اور یقیناً معرفت استقلالی برتر ہے۔

اسی طرح موضوعات کے بارے میں، خاص کر اجتماعی مسائل کے بارے میں اکثر لوگ بہ حد کافی آگاہی نہیں رکھتے ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ ایسے افراد کی پیروی کریں کہ جو ان موضوعات کے بارے میں علم و آگاہی رکھتا ہے ان کی یہ پیروی اگر راہ حق سے انحراف کا باعث نہیں ہے تو موجب سرزنش نہیں ہوگی، لیکن ایسا شخص کہ جو عالم ہے اور جس کے ہاتھ میں چراغ ہدایت ہے کہ جس سے وہ دوسروں کی ہدایت و رہنمائی کرتا ہے، بلند ترین مقام و منزلت پر فائز ہے۔ شناخت استقلالی کے علاوہ اس سے اہم مرحلہ انسان کے لئے اس کے ارادہ اور عمل میں استقلال ہے: کبھی انسان اجتہاد یا تقلید کے ذریعہ موضوع کو پہچانتا ہے، لیکن عمل کے مقام پر اگر تنہا ہے تو معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ جانتا ہو اس پر عمل کریگا۔ جی ہاں، اگر وہ ایک جماعت کے ساتھ ہے اور خاص کر اس جماعت کے افراد بہت زیادہ ہیں تو وہ اقدام کرتا ہے، لیکن تنہائی میں سستی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر ایک اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت ساری مثالیں رکھتا ہے: مثال کے طور پر ایک مدرسہ میں جہاں طلاب کی ایک تعداد رہائش پذیر ہے، اگر شب جمعہ دعائے کمیل کی مجلس منعقد ہوجائے، جب انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ طلاب گروہ گروہ اس مجلس میں حاضر ہو رہے ہیں تو اس میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے کہ اس جلسہ میں شرکت کرے۔ لیکن ایک چھٹی کی شب کو، جب سب طلاب مسافرت پر گئے ہوں، اس کے لئے مشکل ہے کہ تنہا دعائے کمیل پڑھے۔ اسی طرح دوسرے نیک کام انجام دینے میں، جب انسان دیکھتا ہے کہ دوسرے اس کام کو انجام دے

رہے ہیں، وہ بھی جوش میں اس کام کو کرتا ہے، لیکن جب تنہا ہوتا ہے تو بہانے تلاش کرتا ہے، اس کے اندر اتنی کشش نہیں ہے کہ اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔ بالآخر جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس کام سے پہلوتہی کرتا ہے۔ یا جب رات کو دیکھتا ہے کہ کمروں کے لیمپ روشن ہیں اور دوسرے لوگ رات گئے تک مطالعہ میں مشغول ہیں، اس میں بھی مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی رات گئے تک مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن جب مدرسہ میں چھٹی ہوتی ہے اور مدرسہ میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا ہے، اس کے اندر پھر وہ کشش نہیں ہوتی ہے اور مطالعہ کی رغبت نہیں رکھتا ہے۔یہاں جو کچھ بیان ہوا وہ ہماری اجتماعی اور سیاسی رفتاروں کا ایک نمونہ تھا، اس سلسلہ میں مزید اور مثالیں بھی ممکن ہیں۔

اس سستی اور دوسروں سے وابستگی کی علت ارادہ اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کیا جب دوسرے کسی کام کو انجام دیتے ہیں تو اس کام کی قدر و منزلت ہوتی ہے اور وہ انجام نہ دیں تو اس کی قدر و منزلت ختم ہوجاتی ہے؟ اگر دعائے کمیل کی فضیلت اور قدر و منزلت ہے تو ہمیں اسے تنہائی اور خلوت میں پڑھنے کے لئے بھی اہمیت دینی چاہئے، نہ یہ کہ جب اس کے لئے کوئی اجتماع منعقد ہو تو ہم بھی پڑھیں۔ یہ انسان کی کمزوری کی علامت ہے کہ جب دوسروں کو دعائے کمیل پڑھتے دیکھتا ہے یا دیکھتا ہے کہ دوسرے لوگ گروہ در گروہ نماز جمعہ کی طرف جا رہے ہیں، اس میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے، یہ انسان کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔

اس کا عمل اسی وقت فخر کا سبب ہے کہ جب تنہا ہو کوئی اس کے ساتھ نہ ہو اور وہ جس چیز کو تشخیص دے اس پر عمل کرے اور انتظار نہ کرے دوسرے افراد اس کا ساتھ دیں گے۔ جب میں جانتا ہوں کہ خدائے متعال مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو مجھے اس کام کو انجام دینا چاہئے اور مجھے اس سے سروکار نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی میرا ساتھ دیتا ہے یا نہیں، کیونکہ دوسروں کی عدم ہمراہی اور تنہا ہونے سے اس کام کی قدر و منزلت میں کسی بھی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے اس سے انسان کے اندر قوت ارادی پیدا ہوتی ہے اور اپنے قوی اور بلندی ایمان سے اپنے فرائض پر یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے اس کام کو انجام دینے میں بلاواسطہ فیصلہ کرتا ہے، خواہ دوسرے اس کا ساتھ دیں یا نہ۔ یقیناً فیصلہ کرنے میں استقلال کافی اہمیت رکھتا ہے، کہ انسان فیصلہ کرتے وقت اس کا انتظار

نہ کرے کہ دوسرے لوگ کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اسی راستہ پر چلے۔ وہ تو خود قوی ارادہ و ایمان کا مالک ہے، اگر کسی کام کو اپنا فرض سمجھ لیا اور دیکھتا کہ اس میں خدا کی مرضی ہے تو اس کام کو انجام دیتا ہے اور دوسروں کے انتظار میں نہیں رہتا۔ جابربن یزید جعفی، ائمہ اطہار علیہم السلام کے ہم اسرار اصحاب میں سے تھے، انہوں نے امام جعفر محمد باقر علیہ السلام سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ بہت سی روایتیں جو امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر کو نقل فرمائی تھیں، اسرار تھیں اور جابر کو اجازت نہیں تھی کہ انہیں دوسروں کے پاس نقل کریں۔

چونکہ وہ ان خالص معارف الٰہی کے جام کو تشنگان معرفت تک نہیں پہنچا سکتے تھے، اس کی وجہ سے وہ اپنے سینہ میں تنگی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ''جو اسرار آپ نے مجھ سے بیان فرمائے ہیں اور حکم دیا ہے کہ کسی سے نہیں نقل نہ کروں، یہ میرے کندھوں پر ایک بار گراں ہے جس نے میرے سینہ میں اتنا دباؤ پیدا کردیا ہے، کہ میں دیوانہ ہو رہا ہوں! امام علیہ السلام نے فرمایا: اے جابر! اگر تمھاری یہ کیفیت ہو رہی ہے تو بیابان میں جا کر ایک گڑھا کھود کر اپنے سر کو اس گڑھے میں ڈال کر کہو: ''محمد بن علی علیہ السلام نے فلاں حدیث مجھے روایت کی ہے[1]۔'' اس کے بعد جابر کنویں میں سرڈال کر امام محمد باقر علیہ السلام کی روایتیں بیان کرتے تھے تاکہ تھوڑا سا (دل) ہلکا ہوجائے۔

من جملہ روایتوں میں سے جنہیں جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے، یہ روایت ہے کہ امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا... ''واعلم بانک لاتکون لناولیاً حتی لو اجتمع علیک اھل مصرک وقالوا: انک رجل سوء لم یحزنک ذلک ولوقالوا: انک رجل صالح لم یسرک ذلک ولکن اعرض نفسک علی کتاب اللہ فان کنت سالکاً سبیلہ' زاھداً فی تزھیدہ' راغباً فی ترغیبہ خائفاً من تخویفہ فاثبت وابشر فانہ لا یضرک ماقیل فیک[2]'' ''جان لو ہمارے محب دوستدار نہیں بن سکتے، مگر یہ کہ تمھارے شہر کے لوگ متفقہ طور پر تمھارے

[1] بحار الانوار ،ج۲ص۶۹ حدیث۲۴۹۲۲
[2] بحار الانوار ،ج۷۸ص۱۶۲ح۱

خلاف ہوجائیں اور کہیں : تم ایک بُرے انسان ہو، تو تم غمگین اور بے چین نہیں ہونا اور اگر وہ سب کہیں ۔ تم ایک شائستہ انسان ہو، تو خوشحال نہ ہونا لیکن خود کوکتاب خدا کے حوالہ کردو اگر دیکھو کہ تم اس کتاب کے راستہ پر چل رہے ہو جن مواقع پر یہ کتاب زہد کی دعوت دے، تو زہد کو اپنا شیوہ قرار دو اور جس چیز کی تاکید اور ترغیب دے، اس کی رغبت پیدا کرو اور جس چیز سے ڈراتی ہے، اس سے خوف کھاؤ، تم اپنی جگہ پر مستحکم اور خوش رہو پھر، لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ۔''

امام محمد باقر علیہ السلام جابر کو اعتماد اور خدا پر توکل کی دعوت دیتے ہیں کہ اس قدر خدا پر اعتماد کرے کہ لوگوں کا مردہ باد! یا زندہ باد! کہنا تم پر کسی قسم کا اثر نہ کرے اور اپنی رفتار وگفتار کو قرآن مجید کے مطابق قرار دے ۔ اب اگر اس نے دیکھا کہ اس کی رفتار حکم الٰہی کے مطابق ہے ۔ تو چاہئے کہ وہ خوشحال ہو اور اس توفیق کے حاصل ہونے کے لئے خدا کا شکر بجالائے ۔ اور اگر دیکھے کہ اس کی رفتار قرآن مجید کے مطابق نہیں ہے، تو بے چین ہو اس بات پر کہ خدائے متعال اس سے راضی نہیں ہے ۔ پس انسان کے خوش ہونے یا ناخوش ہونے کا معیار خدائے متعال اور قرآن مجید کے احکام ہونا چاہئے، نہ لوگوں کا راضی یا ناراض ہونا ۔

اگر انسان فیصلہ کرتے وقت کافی علمی توانائی رکھتا ہے، تو اسے فریضہ کی تشخیص کے وقت مستقل ہونا چاہئے اور دوسروں کا تابع نہیں ہونا چاہئے ۔ جو عقل خدانے اسے دی ہے اسی سے فکر کرے اور قرآن مجید اور روایات کے مطابق اپنے فریضہ کو تشخیص دے اور اس کی پروا نہ کرے کہ لوگ کیا کہتے ہیں ۔ اس کے بعد ، جو اپنا فریضہ تشخیص دیا ہو اس پر عمل پیرا رہے اور دوسروں کی ہمراہی اور مدد کے انتظار میں نہ رہے حتی اگر دشمن سے مقابلہ میں تنہا رہ جائے، اگرچہ ہمارے لئے اس صورت میں لڑنا واجب نہیں ہے، لیکن چونکہ اس نے دیکھا کہ دشمن کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں خدائے متعال کی رضامندی ہے تو تن تنہا مقابلہ و مبارزہ کو جاری رکھے، خواہ اسے شہید ہونا بھی پڑے ۔ یقیناً ایسی بہادری اور شجاعت کہ شخص تنہائی میں بھی اپنے مقصد اور راہ کی حفاظت میں آرام سے نہ بیٹھے اور مبارزہ کرتا رہے تو اس کا یہ عمل انتہائی گراں بہا اور خدا کے فخر و مباہات کا سبب ہوگا ۔ اس مبارزہ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں '':واللّٰہ لو تظاہرت العرب علی قتالی لما ولیت عنھا ولو امکنت الفرص من رقابھا لسارعت

ایسا!'' ''خدا کی قسم اگر عرب میرے ساتھ لڑنے میں سب مل کر مقابلے میں آئیں تو بھی میں ان کی طرف پیٹھ نہیں پھیروں گا اور فرصت ہاتھ آئے تو ان پر تابڑتوڑ حملہ کروں گا ۔''[1] لہذا، پہلا عامل یہ ہے کہ خدا وند پسند فرماتا ہے کہ مومن تشخیص اور فریضہ کی پہچان میں نیز اپنی رفتار اور علم میں مستقل ہو اور دوسروں کا منتظر نہ رہے اور دوسروں کے جیسا نہ ہو ۔ البتہ جیسا کہ کہا گیا کہ اس سے یہ غلط مطلب نہ لیا جائے کہ انسان کو خود سر اور ضدی بن کر ہمیشہ دوسروں کے برخلاف عمل کرنا چاہیئے، یعنی اگر اس نے دیکھا کہ دوسروں نے کوئی کام انجام دیا ہے تو اس کو قطعاً اس کے برعکس کام انجام دینا چاہیئے یہ تو ایک ناپسند، ناشائستہ اور بہت احمقانہ صفت ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان فیصلہ کرتے وقت اور فریضہ کی تشخیص اور ان پر عمل کرنے میں آزاد ہونا چاہیئے اور دوسروں کی تشویق، ہمراہی اور ہم فکری کا منتظر نہ رہے ۔ پس، اگر اس نے اپنے فریضہ کو تشخیص دیا اور دیکھا کہ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں تو بہت اچھا ہے ۔

انسان کو ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر کسی چیز کو فریضہ کے طور پر تشخیص دیدیا اور بعد میں سمجھ لے کہ اس نے غلطی کی تھی، پھر بھی اپنی بات پر ہٹ دھرمی کرے تو یہ اچھی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ناپسندیدہ خصلت ہے ۔ انسان کو ہمیشہ اپنے اخلاق، رفتار اور تفکر میں نظر ثانی کرنی چاہیئے اور اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے، تو اسے کمال شجاعت سے اعتراف کرنا چاہیئے اور ہٹ دھرمی نہ کرے اور اپنی بات پر ضد نہیں کرنی چاہیئے ۔ مومن کی جب حق کی طرف ہدایت ہوتی ہے تو اسی کو انجام دیتا ہے ۔

ب ۔ اخلاص کا عامل: دوسرا عامل جو خدا کے لئے ان تین گروہوں پر فخر و مباہات کرنے کا سبب بنا، اخلاص ہے ۔ بیابان میں تنہائی کے عالم میں نماز پڑھنے والے کی نماز میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تاکہ اس کے حالات کا مشاہدہ کرے اور پھر دوسروں کے لئے اسے نقل کرے ۔ یقیناً ایسے عمل کا اخلاص، اس عمل سے بیشتر ہے جو دوسروں کے سامنے

---

[1] نہج البلاغہ ترجمہ فیض الاسلام مکتوب ۳۵ص ۹۷۱

انجام پاتا ہے۔ اگر انسان لوگوں کے سامنے پورے آداب کے ساتھ نماز پڑھے، تو بھی اس بات کا امکان ہے شیطان اسے وسوسہ میں مبتلا کردے، چونکہ شیطان مکار ہے انسان نے جس قدر بھی وارستہ اور تہذیب یافتہ ہو ہو ممکن ہے شیطان کے ہاتھوں شکست کھاجائے، جب وہ دوسروں کے سامنے نماز پڑھتا ہے اس کے دل میں ریا پیدا ہوجاتی ہے، اسے یہ چیز پسند ہے کہ دوسرے اس کے عمل کو دیکھ لیں یا اس کی آواز سن لیں۔ لیکن جب ایک بیابان میں تنہا ہے اور اذان و اقامت کے ساتھ کر نماز پڑھتا ہے، ممکن نہیں ہے ریا کرے۔ یا جو نصف شب کو، دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہے اور خدا کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور سجدہ میں اتنا طول دیتا ہے کہ اسے نیند آجاتی ہے، یہاں پر ریا کا تصور ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہاں پر کوئی نہیں ہے جو اس کی حالت کا مشاہدہ کرے۔

جو میدان کار زار میں میں اکیلا رہ گیا ہے اور تن تنہا جہاد کر رہا ہے، ممکن نہیں ہے ریا کرے، کیونکہ وہاں پر اس کے دوست واحباب نہیں ہیں جو یہ کہیں: کیا شجاعت کے جوہر دکھا رہا ہے! اور اس کی شہادت کے بعد اس کی بہادری کے بارے میں لوگوں کو بتائیں۔ دشمن تو اس کی فضیلتوں کو نقل نہیں کرے گا۔ لہذا ایسے افراد کے لئے ریاکاری اور خود نمائی کے قصد کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس بنا پر جو دوسری مشترک خصوصیت ان تین گروہوں میں پائی جاتی ہے اور خدا کے لئے فخر و مباہات کا سبب ہے وہ انتہائی خلوص ہے جو ان میں پایا جاتا ہے اور انہیں ریا اور خود نمائی میں آلودہ ہونے سے پاک و صاف کرتا ہے۔

جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا کہ ان تین گروہوں کے عمل کی ساخت اور شکل ممکن ہے دوسرے لوگوں کے عمل کے مانند ہی ہو، پس جوچیز ان کے اس عمل کو ممتاز بناتی ہے اور اسے ایسا گراں بہا گوہر میں تبدیل کرتی ہے کہ خدائے متعال اپنے فرشتوں پر فخر کرتا ہے وہ اخلاص ہے، جو اس عمل کو صرف خدا کے لئے انجام دینے کا سبب ہے، اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور روایتوں میں آیا ہے کہ اخلاص عمل کی بلندی اور اس کے قبول ہونے کا سبب ہے :(انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللّٰہ مخلصاً لہ الدین الا للّٰہ الدین الخالص[1]'' (...ہم نے آپ کی طرف اس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا، لہذا آپ مکمل اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں، آگاہ

[1] بحار الانوار ،ج۶۷،ص۲۴۲

ہوجاؤ خالص بندگی صرف اللہ کے لئے ہے۔ ۔ ۔ ''ایک حدیث میں آیا ہے '': من اخلص لنا اربعین صباحاً جرت ینابیع الحکمہ من قلبہ علی لسانہ ''جو چالیس دن تک خدا کے لئے اخلاص سے کام لے، حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں''، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ : (لیبلوکم ایکم احسن ''[1] (تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔ ''کے بارے میں فرمایا... '': لیس یعنی اکثر عملاً ولکن اصوبکم عملاً وانما الاصابۃ خشیۃ اللہ والنیۃ الصادقۃ والحسنۃ ثم قال: الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل، والعمل الخالص الذی لا ترید ان یحمدک علیہ احد الا اللہ عزوجل والنیۃ افضل من العمل[2]...'' ''خدا کا مقصود زیادہ عمل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود درست اور صحیح عمل کرنا ہے اور بیشک یہ وہی خدا کا خوف اور سچی اور نیک نیت ہے، اس کے بعد فرمایا: عمل کو خالص بنانے میں پائداری، خود عمل سے سخت تر ہے اور خالص عمل وہ ہے کہ تم اس عمل کے بارے میں خدا کے علاوہ کسی سے ستائش کے خواہاں نہ ہو اور نیت عمل سے بہتر ہے''

لہذا جو کچھ بیان ہوا اس کے پیش نظر، ممکن ہے ہمارا کوئی ایسا عمل ہو جو با فضیلت اور اس کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہو، جیسے باجماعت نماز پڑھنا، کہ روایتوں کے مطابق اس کے ثواب کو ملائکہ بھی گن نہیں سکتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں ہے اس قسم کی نماز کا خلوص اس نماز کے خلوص کے برابر ہو کہ جسے ایک بندہ تنہا بیابان میں انجام دیتا ہے۔ بہر صورت شیطان وسوسہ کرتا ہے اور انسان تنہا ہوتا ہے اس کے لئے مشکل ہے عبادت میں خلوص پیدا کرنا وہ بھی آداب کے ساتھ، کیونکہ اس کا اندرونی ارادہ اور شوق اتنا قوی نہیں ہے، لیکن اگر دوسرے اس کے ہمراہ ہوں خارجی مدد اس کے ہمراہ ہو تو، عبادت کو بہتر صورت میں انجام دیسکتا ہے۔

---

[1] ملک۲

[2] اصول کافی (باترجمہ)ج۳،ص۲۶

چھٹا سبق

عبادت و بندگی کی عظمت اوراس کے تکوینی اثرات

عبادت و بندگی کی عظمت اور اس کے تکوینی اثرات

یا اباذر: مامن رجلِ یجعل جبھتہ فی بقعۃ من بقاع الارض الا شھدت لہ بھا یوم القیامۃ وما من منزل ینزلہ قوم الا واصبح ذلک المنزل یصلی علیھم اویلعنھم یا اباذر: ما من صباح ولا رواح الا وبقاع الارض تنادی بعضھا بعضاً یا جارھل مربک ذاکر للہ تعالیٰ او عبد وضع جبھتہ علیک ساجد اللہ؟ فمن قائلۃ لا ومن قائلہ نعم ، فاذا قالت نعم اھتزت انشرحت وتری ان لھا الفضل علی جارتھا ''حدیث کے اس حصہ میں خدائے متعال کی عبادت و بندگی کی عظمت اور بلندی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ انسان کا عمل خواہ پسندیدہ ہویانا پسندیدہ گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے دور نہیں رہتا، یہاں تک زمین بھی جس پر ہم عبادت یا برے کام انجام دیتے ہیں قیامت کے دن ہمارے نفع یا نقصان میں گواہی دے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے اعمال وکردار ردّعمل اور نتیجہ نہ ہو،بلکہ دنیوی رد عمل اور نتیجہ کے علاوہ ہمارے اعمال و کردار کا قیامت میں بھی نتیجہ ظاہر ہوگا۔

قیامت کے دن، وہ زمین جس پر ہم عبادت کرتے ہیں، اس عبادت کے انجام کے بارے میں شہادت دے گی، یا اگر اس پر ہم کوئی برا کام انجام دیں تو قیامت کے دن ہمارے خلاف شہادت دے گی اور ہم پر لعنت کرے گی۔ انسان کے اعمال کے بارے میں زمین کی گواہی '' :یا اباذر؛ ما من رجلِ یجعل جبھتہ فی بقعۃ من بقاع الارض الا شھدت لہ بھا یوم القیامۃ وما من منزل ینزلہ قوم الاواصبح ذالک المنزل یصلی علیھم اویلعنھم ''، '' اے ابوذر! کوئی شخص اپنی پیشانی کو زمین کے کسی نقطہ پر نہیں رکھتا ہے، مگر یہ کہ وہ نقطہ قیامت کے دن اس کی گواہی دے گا اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ ایک گروہ وہاں پر قدم رکھے، مگر یہ کہ وہ جگہ ان پر درود یا لعنت بھیجے گی ''،بعض بزرگ یہ کوشش کرتے تھے کہ مسجد کی مختلف جگہوں پر نماز پڑھیں اور ہمیشہ ایک ہی جگہ پر نماز نہیں پڑھتے تھے، یا اگر کسی گھر

یا کسی دوسری جگہ داخل ہوتے تھے، پہلے دو رکعت نماز پڑھتے تھے تاکہ قیامت کے دن اپنے لئے زیادہ سے زیادہ گواہ بنائیں۔ یہ بذات خود ایک ہوشیاری ہے جو مؤمن کے لئے مفید و مطلوب ہے۔اسی روایت اور دوسری روایتوں میں عبادت کے لئے جو بلندی و قدر و منزلت بیان ہوئی ہے اس کے پیش نظر ہماری اس امر کی تاکید کہ عبادت کو مختلف جگہوں پر انجام دینا چاہئے، اس معنی میں ہے کہ ہم نے پیغمبر اسلام ﷺ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات پر اعتماد کیا ہے۔چنانچہ مذکورہ روایت کے اس حصہ اور دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے زمین، درخت اور تمام بے جان مخلوقات، کہ جنھیں ہم انہیں فاقد درک و شعور جانتے ہیں، حقیقت میں درک وشعور کے حامل ہیں اور ہمارے اعمال کو درک کرتے ہیں اور ہمارے نیک کام انجام دینے پر ہمارے لئے دعا کرتے ہیں اور ہمارے بُرے کاموں کی وجہ سے ہم پر لعنت بھیجتے ہیں، اس کے علاوہ قیامت کے دن بھی ہمارے نفع یا نقصان میں گواہی دیتے ہیں۔

زمین اور بے جان مخلوقات کی ستائش کی کیفیت:روایت کے اس حصہ کے مضمون جس میں زمین اور بے جان مخلوقات کے شعور و درک کی تصویر کشی کی گئی ہے نیز دوسری آیات اور وایات، جو اسی مضمون پر مشتمل ہیں، کے بارے میں بزرگ علمانے تین نظریہ پیش کئے ہیں: پہلا نظریہ: بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ تعبیریں کنا یہ ہیں اور ان کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے اور ہر مورد کے لئے مناسب تاویل ذکر کرتے ہیں۔ شاید اکثر مفسرین نے اس قسم کی آیات و روایات کی تفسیر میں اسی شیوہ کو اپنایا ہے۔

دوسرا نظریہ: عرفا اور عارف مزاج فلاسفہ، جیسے صدر المتاہین اور ان کے شاگرد یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ مخلوقات واقعاً ادراک و شعور رکھتی ہیں اور خدائے تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں، لیکن ہم اس حقیقت کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔ شاعر کہتا ہے:ما سمیعیم و بصیریم و ہُشیم باشانا محرمان ما خامشیم ''ہم سنتے، دیکھتے اور باہوش ہیں، لیکن تم نامحرموں کے سامنے خاموش ہیں'' یہ لوگ ان آیات و روایات کے حقیقی معنی اخذ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:درخت، زمین اور کنکریاں وغیرہ شعور رکھتی ہیں اور خدائے

متعال کی تسبیح کرتے ہیں" :تسبح لہ السمٰوات والارض ومن فیھن وان من شئ الا یسبح (بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم[1] "ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کونہیں سمجھتے ہو" مذکورہ آیت کی تفسیر میں علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں" :آیت عالم مادی کے اجزا کی تسبیح کوثابت کرتی ہے اور یہ کہ وہ خدائے متعال کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے (ہر) شریک سے منزہ اور پاک جانتے ہیں، تسبیح کے معنی کلام و سخن کے ذریعہ تنزیہ ہے اور کلام کی حقیقت اندرونی مقصود سے اس کے اشارہ اور رہنمائی سے پردہ اٹھانا ہے۔ چونکہ انسان کے پاس اپنے مقصد کی طرف اشارہ کرنے اور اسے پیش کرنے کے لئے کوئی تکوینی راستہ نہیں ہے لہذا مجبور ہے ایسے آواز والے کلمہ سے استفادہ کرے جو بہت سے معنی کے لئے وضع ہوئے ہیں، اور ان کے ذریعہ اپنا مقصود واضح کرے ،اس کے بعد تفہیم و تفہم کا طریقہ اسی صورت میں رائج ہوا۔ اس کے علاوہ ممکن ہے اپنا مقصود بیان کرنے کے لئے انسان ہاتھ یا سر کے اشارہ سے مدد لے اور کبھی لکھنے یا علامتوں کے ذریعہمد د حاصل کرے ۔

مختصر یہ کہ جو مقصد سے پردہ اٹھاتا ہے وہ کلام ہے اور اپنے مقصود اور منظور کو بیان کرنے کے لئے ہر چیز اور ہر مخلوق سے استفادہ کرنا، اس کا قول و کلام ہے، اگر چہ وہ مقصود باطنی آواز اور کلمہ سے ہا ھنگ نہ ہو۔ اس نکتہ کی دلیل، بعض کلمات جیسے کلام، قول، امر و نہی ہیں کہ قرآن مجید میں خدائے متعال کی طرف ان کی نسبت دی گئی ہے اور یقیناًوہ ہم سے صادر ہونے والی بات اور گفتار جیسی نہیں ہیں۔ یقیناآسمان و زمین اور جو کچھ ان میں موجود ہے، ایک ایسی چیز ہے جو خدائے متعال کی وحدانیت اور یکتائی کو بیان کرتی ہے اور اسے ہر عیب و نقص سے منزہ جانتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ ساری مخلوقات نیازمند اور محتاج ہیں اور احتیاج اس امر کا واضح ترین گواہ ہے کہ کوئی ایسا موجود ہے جس کی طرف سب نیاز مند اور محتاج ہیں اور اس سے کوئی بھی بے نیاز نہیں ہے۔ پس مخلوقات میں ہر ایک مخلوق، اپنے احتیاج وجودی اور ذاتی نقص کی بنا پر خالق غنی کے بارے میں خبر دیتی ہے۔

---

[1] اسراء،۴۴

بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں ''خدائے متعال کا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ مخلوقات کی پیدائش کے ساتھ علم و آگاہی بھی ان میں پھیلی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے وجود و ہستی سے بہرہ مند ہونے کی حد میں، علم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ سب ایک ہی حداور دائرہ میں علم رکھتے ہوں اور سبھی کا علم و اور ان کی معلومات ایک ہی قسم کا ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ'' تمام مخلوقات کا علم انسان کے جیسا ہو یا انسان تمام مخلوقات کے علم و آگاہی سے واقف ہو۔ اس بنا پر ہر مخلوق کسی نہ کسی صورت میں اپنے وجود کا علم رکھتی ہے اور اپنی ہستی اور وجود سے اپنی محتاجی اور نقصان کا کہ جس کا خدائے بے نیاز میں احاطہ ہے اظہار کرتی ہے اور یہ کہ خدائے متعال صاحب کمال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ہے۔ پس ہر مخلوق اپنے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے اور اسے شریک اور ہر نقص سے پاک و منزہ جانتی ہے[1]''

تیسرا نظریہ: اس دنیا میں موجود تمام مخلوقات کے علاوہ مادی صورت کے ساتھ ملکوتی صورت بھی ہے اور حقیقت میں ان کی یہی ملکوتی اور باطنی صورت درک و شعور رکھتی ہے اور وہی ملکوتی صورت قیامت کے دن ظاہر ہوگی اور شہادت دے گی، ہم اس دنیا میں اس ملکوتی صورت کو درک نہیں کرتے ہیں، اس لئے اشیا کی تسبیح کو نہیں سنتے نہیں سمجھتے ہیں اور ان میں شعور و آگاہی کے آثار کو نہیں دیکھتے، لیکن یہ صورت موجود ہے اور قیامت کے دن ظاہر ہوگی اور جن حقائق کو ادراک کرتی ہے انہیں ظاہر کر کے شہادت دے گی۔ قرآن مجید کے واضح بیان کے مطابق، قیامت کے دن حتی انسان کی کھال بھی اس کے خلاف گواہی دے گی، اس کی زبان اور ہاتھ پاؤں بھی اس کے خلاف گواہی دیں گے، اگر یہ اعضا شعور نہ رکھتے ہوں تو ان کی گواہی بے معنی ہے۔ قرآن مجید انسان کے بدن کے اعضا کی گواہی کے بارے میں فرماتا ہے: (وقالوا لجلودهم لم شهدتم علینا قالوا انطقنا الله الذی انطق کل شیٔ[2]'' ''(اور وہ اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دی تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے سب کو گویائی عطا کی ہے۔'' اگر انسان کی کھال کسی قسم کا شعور نہ رکھتی ہوتی کہ معصیت کے وقت جس کو درک کر سکے، تو کیسے ممکن

---

[1] االمیزان ج۳، ص۱۱۴۔ ۱۱۶
[2] فصلت۲۱

ہے وہ قیامت کے دن اس کی معصیت کے بارے میں گواہی دے جبکہ اسے درک نہیں کر سکتی تھی؟ شہادت کا اس وقت معنی درست ہوں گے جب شاہد معصیت کے منظر کو درک اور احساس کرے ورنہ شہادت کا کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے اعضا اس کی معصیت کے بارے میں درک نہ رکھنے کے باوجود، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں بات کرنے پر مجبور کردے گا، تو کہنا چاہئے کہ اس صورت میں شہادت کا کوئی معنی و مفہوم ہی نہیں ہے اور شہادت کا اطلاق ایسے مورد پر بے معنی ہے۔ اس بنا پر اعضا کا گواہی دینا درک و احساس اور عمل کے بارے میں ایک قسم کے علم کے بعد انجام پاتی ہے اس کے بغیر شہادت ہی انجام نہیں پا سکتی ہے۔

پس دوسرے اور تیسرے نظریہ کے مطابق، بنیادی طور پر تمام مخلوقات میں شعور، احساس اور ایک قسم کی آگاہی و علم کے موجود ہونے میں کس قسم کا شک و شبہ نہیں ہے، بلکہ ان کی کیفیت میں اختلاف ہے کہ کیا یہ علم اشیا کی ملکوتی روح کے ساتھ ہے، یا یہ کہ بذات خود درک و شعور کے حامل ہیں۔ البتہ پہلے نظریہ کے قائل کہتے ہیں: جب انسان کے اعضا و جوارح قیامت کے دن ظاہر ہوں گے، جو انسان کی رفتار کے آثار ان میں باقی رہے ہیں وہ ان کی شہادت کے درجہ پر ہیں۔

مخلوقات کا شعور و آگاہی اور ان کا اثر قبول کرنا :شاید مذکورہ تینوں نظریات میں تیسرا نظریہ بہتر ہوگا،اور ہر صورت میں آیات و روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اشیاا ور مادی مخلوقات ایک قسم کا شعور و ادراک رکھتی ہیں۔ نہ صرف ان میں تکوینی شعور موجود ر ہے، بلکہ اپنے سے مربوط حوادث سے متاثر ہوتی ہیں اور حوادث ان میں اثر ڈالتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ان میں ایک نئی قوت پیدا ہوتی ہے: اگر روی زمین پر عبادت انجام دی جاتی ہے تو، وہ اس سے نیک اثر قبول کرتی ہے اور اس لحاظ سے خوش ہوتی ہے اور اپنے اوپر ناز کرتی ہے، اس کے برعکس اگر روی زمین پر کوئی معصیت انجام دی جاتی ہے تو ایک منفی اثر ان پر پڑتا ہے، اس لحاظ سے زمین ناراض ہوتی ہے اور گناہ کار پر لعنت بھیجتی ہے، البتہ ہم اس قسم کے مفاہیم کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان آیات و روایات کا مضمون ہمارے لئے صحیح طور پر واضح اور نمایاں نہیں ہے، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ کائنات میں بعض نا معلوم حقائق

موجود ہیں جو ہمارے درک و فہم کے حدود اور دائرے کے باہر ہیں یا ان کے بارے میں ہماری معرفت بہت محدود ہے، چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے :(...وما اوتیتم من العلم الاقلیلا[1] " (اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ "کائنات میں بہت حقائق موجود ہیں جن کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے اور ان میں سے بعض کو ہم نے وحی کے ذریعہ پہچان لیا ہے اور یا انبیائے عظام صلوات اللہ علیہم اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے ہمارے لئے انہیں بیان کیا ہے اور ہم بھی ان کے کہنے پر اعتماد کرتے ہیں اور ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ان حقائق کو بیان فرمایا ہے ورنہ ہماری عقل ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور ممکن نہیں تھا ہم اپنی ناقص عقل کے ذریعہ ان حقائق تک پہنچ سکتے :(کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیا تنا ویزکیکم و یعلمکم الکتاب والحکمۃ و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون[2]) جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے، تمہیں پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر ہمارے لئے دو نکتے واضح ہوگئے: پہلا نکتہ یہ کہ اگر ہم ہزاروں دانش و علم بھی حاصل کرلیں اور تمام بشری مخلوقات کو پالیں، پھر بھی ہماری معلومات ہماری نامعلوم چیزوں کے مقابلہ میں محدود ہیں اور قابل شمار نہیں ہیں، پس ہمیں مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اپنے اوپر ناز نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ممکن نہیں ہے کوئی تمام بشری معلومات کو پا سکے، بلکہ ہر شخص علوم کے ایک حصہ کو حاصل کرسکتا ہے اور علم کے بے انتہا سمندر سے ایک قطرہ اس کو نصیب ہوتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے، کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں کہ اگر ایک خلوت گاہ پر کوئی کام انجام دیں تو کوئی ہمیں نہیں دیکھتا ہے: اگر زمین درک نہ کرے اور نہ سمجھے، تمھارے اعمال پر مقرر کئے گئے فرشتے تو اسے درک کرتے ہیں اور ہمارے اعمال کو لکھتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جو اس دنیا پر تسلط رکھتے ہیں اور ان کی نظروں سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔

---

[1] اسراء،٨٥
[2] بقرہ، ١٥١

انوارائمہ اطہار علیہم السلام کی وسعت اور اس کے حدود: ہم، شیعوں کے عقیدہ کی بنیاد پر، ائمہ اطہار علیہم السلام کا نور ہر جگہ حاضر ہے، اگرچہ ہم سب ان کے نور کو کما حقہ درک نہیں کرتے ہیں۔ ذخیرہ الٰہی، حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کو اگر کوئی انہیں سلام کرے تو وہ جواب دیتے ہیں، لیکن ہمارے کانوں میں ان کا کلام سننے کی توانائی نہیں ہے۔ اگر کوئی ان سے فریاد کرے، تو وہ جواب دیتے ہیں، اگر بیابان میں گم شدہ کوئی شخص انہیں پکارے تو وہ مدد کے لئے پہنچتے ہیں اور اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور آپؑ درماندہ وعاجز، مصیبت زدہ بیمار کو شفا بخشتے ہیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے آپؑ حاضر ہیں اور سنتے ہیں، ورنہ اگر حاضر نہ ہوتے اور نہیں سنتے اور تو کیسے سمندروں کی لہروں میں گرفتار یا جنگل و بیابان میں مشکل سے دو چار شخص کی فریاد سنتے اور اس کی مدد کو پہنچتے نیز اس کو نجات دیتے ؟ علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ایک صالح شخص جو صاحب تقوی اور اہل معرفت تھا اس نے بہت سے حج کئے تھے۔

اس کے بارے مشہور تھا کہ اس نے ''طی الارض'' کیا ہے، ایک دن وہ اصفہان آیا تو میں نے اس سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا: تمھارے متعلق ''طی الارض'' کی روداد کیا ہے؟ اس نے کہا: میں ایک سال حاجیوں کے ہمراہ بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے مکہ مکرمہ کی مسافت سات یا نو منزل رہ گئی تھی۔

میں قافلہ سے بچھڑ گیا اور قافلہ والے میری نظروں سے غائب ہوگئے، میں نے راستہ کو گم کردیا اور حیرانی و سرگردانی کی حالت میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا پیاس کی شدت کی وجہ سے زندگی سے نا اُمید ہوگیا تھا، اسی حالت میں، میں نے فریاد بلند کی: ''یا اباصالح، میری مدد کیجئے'' اچانک دور سے ایک سوار نمودار ہوا۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے ایک خوبصورت جوان کو لباس فاخرہ پہنے ہوئے بزرگوارانہ صورت میں اونٹ پر سوار دیکھا اور ان کے ساتھ پانی کا ایک برتن بھی تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور

انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: کیا تم پیاسے ہو؟ میں نے عرض کی: جی ہاں،انہوں نے مجھے پانی پیش کیا اور میں نے اسے پیا،اس کے بعد فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں تمھارے قافلہ کے پاس پہنچادوں؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، انہوں نے فرمایا: میرے اونٹ کی پشت پر سوار ہوجاؤ؟ میں سوار ہوا اور وہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے ہر روز ''حرزیمانی'' پڑھنے کی عادت تھی میں نے اسے پڑھنا شروع کیا پڑھنے کے بعد اس عرب جوان نے مجھ سے فرمایا: بعض کلمات کو یوں پڑھا کرو تھوڑی دیر گزرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا: اس جگہ کو پہنچانتے ہو؟ میں نے نظر ڈالی اور دیکھا کہ میں سرزمین ابطح یعنی مکہ کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

اس نے فرمایا نیچے اتر جاؤ۔ جوں ہی میں اونٹ سے نیچے اترا وہ غائب ہوگئے۔ یہاں پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت جوان، امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تھے[1]۔ پس امام علیہ السلام کا نور ہر جگہ حاضر ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے، چونکہ اس حقیقت کو درک کرنا تمام لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ اگر یہ حقائق لوگوں کے لئے کھلم کھلا بیان کئے جائیں تو وہ غلو میں مبتلا ہوجائیں گے، اس لئے ان کے ادنی مراتب بیان ہوئے ہیں من جملہ ہمارے نامۂ اعمال امام علیہ السلام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

یا بعض روایتوں میں ہمارے اعمال کے خدائے متعال اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے جانے کی بات کہی گئی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب ہفتہ کے دنوں میں من جملہ جمعرات کا ذکر آیا تو حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا... '':ھو یوم تعرض فیہ الاعمال علی اللہ وعلیٰ رسولہ' صلی اللہ علیہ وآلہ وعلی الائمۃ...'''' جمعرات کا دن وہ دن ہے جس میں بندوں کے اعمال خدائے متعال' رسول خدا،اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔''

یا بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جب ملائکہ انسان کے اعمال لکھتے ہیں، اسی دن شب کو عرش پر لے جا کر خدائے متعال کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ کیا خدائے متعال ہر جگہ حاضر نہیں ہے کہ اعمال کی رپورٹ کو عرش پر اس کی خدمت میں پہنچائی جائے؟ لیکن جاننا چاہئے کہ وجود کے مراتب کی خاص صورتیں ہیں اور اعمال کو پیش کرنے کا بھی ایک

---

[1] کفایۃ الموحدین ،نوری طبرسی ج۲، ص۱۸۲

خاص نظام ہے جو بارگاہ ربوبیت کے متناسب ہے اور یہ خدا کے ہر جگہ پر حاضر ہونے کے منافی نہیں ہے۔گواہوں اور شاہدوں کی نظروں سے اعمال کا مخفی نہ ہونا:مذکورہ مطالب کے پیش نظر، ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں، جو درک و شعور سے خالی ہو: اس دنیا میں دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان موجود ہیں جو ہمارے اعمال اور بیان کے گواہ ہیں اور بعض آیات و روایات کے ظاہر کی بناء پر زمین، درخت اور پرندے بھی شعور رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں، البتہ ہم غافل ہیں!اس سے بالا تر امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا وجود مقدس ہمارے اعمال پر ناظر ہے، سب سے ارفع و اعلیٰ ذات مقدس باری تعالیٰ ہمارے اعمال پر گواہ ہے :(...ان اللہ کان علی کل شیٔ شہیداً[1])''بیشک اللہ ہرشے پرگواہ اور نگراں ہے''خدائے متعال انسان کے پنہان اور آشکار اعمال کے بارے میں اپنی آگاہی اور فرشتوں کی نگرانی کے سلسلہ میں فرمایا ہے:(ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ اذیتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید۔ مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید[2])اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔

جب کہ دو لکھنے والے فرشتے اس کے نامہ اعمال لکھنے کے لئے مامور ہیں جو داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی بات منہ سے نکالتا ہے مگر یہ کہ ایک نگہبان اس کے پاس موجود رہتا ہے(جو اس کی باتوں کو لکھ لیتا ہے) ۔ایک دوسری جگہ پر قیامت کے دن پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی کے بارے میں فرماتا ہے :(فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ہولاء شہیداً[3])''اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہرامت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور اے پیغمبر تمھیں بھی ان پر گواہ بناؤں گا'' قیامت کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر گواہوں کی شہادت کے بارے میں بیان کرنے والی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ دنیا میں بندوں کے اعمال کے شاہد ہیں ورنہ اگر وہ دنیا میں لوگوں کے اعمال کے شاہد نہ ہوتے تو قیامت کے دن کیسے شہادت دیتے؟کیا

[1] نساء،۳۳
[2] ق: ۱۶،۱۸
[3] نساء، ۴۱

یہ ممکن ہے کہ کوئی حادثہ کو دیکھے بغیر اس کے بارے میں شہادت دے؟اگر ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، وہ خاموش اور شعور و درک سے خالی نہیں ہے بلکہ ایسے اشخاص موجود ہیں جو ہمیں دیکھتے ہیں اور وہ ہمارے اعمال کے شاہد اور ناظر ہیں، اگر چہ ہم ان کو نہیں دیکھ رہے ہیں، ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور اپنی رفتار پر نظر ثانی کرنی چاہئے یہ شرم و حیا ہے کہ جو بعض ناپسندیدہ حرکتوں کے سرزد ہونے سے ہمارے لئے مانع ہوتی ہے۔ جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ہمارے اعمال ثبت ہو کر قیامت کے دن ظاہر ہوں گے تو شرم و حیا بُرے کام کو انجام دینے سے ہمارے لئے مانع ہو جاتی ہے۔ جب انسان کسی گناہ کا مرتکب ہونا چاہتا ہے، اگر یہ توجہ کرلے کہ زمین و آسمان اور بعض صفحات (تختیاں) ہیں جن پر انسان کے اعمال کی صورت ثبت ہوتی ہے اور ایک دن ظاہر ہوگی، تو وہ اس گناہ سے پرہیز کرے گا اور خلوت میں بھی گناہ نہیں کرے گا، کیونکہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

''اتقوا معاصی اللّٰہ فی الخلوات فان الشاھد ھو الحاکم[1]'' ''پوشیدہ حالت میں خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو، کیونکہ جو شاہد اور ناظر ہے وہ حاکم بھی ہے'' اگر آپ اپنی کسی حالت کے بارے میں پسند نہیں کرتے کہ کوئی اس حالت کو دیکھ لے، تو اگر کسی نے اس حالت کی تصویر لے لی ہے تو، آپ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اس تصویر کو نابود کر دیں تاکہ اسے آئندہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ یقیناً انسان ہرگز نہیں چاہتا ہے کہ کوئی اس کی ایسی تصویر کھینچے جو اس کی شرمندگی کا سبب بنے۔

وہ تصویر کھینچتے وقت اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا قیافہ اچھا ہو زیر لب ہنستا رہے تاکہ اس کی تصویر بہتر ہو۔ اس کے لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ اس کی تصویر اس حالت میں کھینچی جائے جو اس کے لئے شرمندگی اور رسوائی کا سبب بنے۔

اس مثال کے پیش نظر، ہمیں جاننا چاہئے۔ کہ طبیعیوامل جیسے زمین، آسمان اور در و دیوار مسلسل ہماری تصویریں کھینچ رہے ہیں اور قیامت کے دن ان تصویروں کو ظاہر کریں گے۔ لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ نامناسب اور بد حالت میں ہماری تصویریں نہ کھینچی

[1] نہج البلاغہ '' ترجمہ شہیدی'' کلمات قصار ، ۳۲۴ص، ۴۲۰

جائیں تاکہ قیامت کے دن ہماری تمام رفتار اور کردار رونما ہو کر ہماری رسوائی کا سبب نہ بنیں :(یوم تجد کل نفسٍ ماعملت من خیرٍ محضراً وما عملت من سوءٍ تود لو ان بینھا وبینہ امدا بعیدا[1]) ''اس دن کو یاد کرو جب ہر نفس اپنے نیک و بد اعمال کو حاضر پائے گا جن کو دیکھ کر یہ تمنا کرے گا کہ کاش ہمارے اور ان بُرے اعمال کے درمیان طویل فاصلہو جاتا''بندگی میں اخلاص، شادمانی اور فخر و مباہات کا سبب'' :یا اباذر: مامن صباح ولا رواح الا وبقاع الارض تنادی بعضھا بعضاً یا جارھل مربک ذاکر للّٰہ تعالیٰ او عبد وضع جبھتہ علیک ساجد اللّٰہ؟ فمن قائلۃ لا ومن قائلۃ نعم ' فاذا قالت نعم اھتزت وانشرحت وتری ان لھا الفضل علی جارتھا '''' اے ابوذر! کوئی صبح و شام ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ زمین کا چپا چپا ایک دوسرے سے کہتا ہے: اے میرے ہمسایہ! کیا تم پر کوئی ایسا وقت گزرا جو ذکر خدا کرے، یا کوئی ایسا بندہ جو خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تجھ پر پیشانی رکھے؟ بعض کہتے ہیں: ہاں اور بعض کہتے ہیں: نہیں، جو بھی ہاں کہے وہ اپنے اوپر ناز اور شادمانی کرتا ہے اور اپنے کو دوسروں پر برتر جانتا ہے۔''

ایک اور مطلب، جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہوا ہے، وہ یہ ہے، کہ جس زمین پر خدا کا بندہ عبادت کرتا ہے اور سجدہ کرنے کے لئے اپنی پیشانی اس پر رکھتا ہے، وہ اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے مخر و مباہات کرتی ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ اس ناز کرنے اور فخر و مباہات کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ جو چیز بنیادی طور پر خدا کے سامنے قدر و قیمت رکھتی ہے، وہ اس کی طرف توجہ ہے اور دوسرے کام اس وقت قدر و منزلت رکھتے ہیں، جب خدا کی توجہ کے ہمراہ اور قربت الی اللہ انجام پائیں۔ کام اس وقت خدا کے لئے انجام پاتا ہے، جب انسان خدا کی یاد میں ہو ورنہ جو خدائے متعال سے غافل ہو، اس کا کام قربۃ الی اللہ انجام نہیں پاتا ہے، بلکہ وہ کام یا اپنے دل کی مرضی یا اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے یا دیگر مادی نیتوں سے انجام دیا جاتا ہے اور اس کی خدائے متعال کے پاس کوئی قیمت نہیں ہے۔ پس خدا کی یاد، اس کی طرف توجہ اور جو چیز انسان کو ذات ابدیت سے ملحق کرتی ہے وہ اصالت اور حقیقت رکھتی ہے اور اسی طرح دوسری تمام چیزیں خدا کی یاد کے سائے میں قابل اہمیت ہیں اور خدا کی یاد

[1] آل عمران، ۳۰

کے بغیر ان کی کوئی حقیقت و اہمیت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے، انسان کا حقیقی کمال خدا کی توجہ کے سائے میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو، خدا کی طرف توجہ کے بغیر اور اعمال و عبادت کو قربۃً الی اللہ اور اخلاص کے بغیر انجام دینا بے روح بدن کی طرح ناچیز اور بے قیمت ہے۔ پس، ہمارے تمام اعمال خدائے متعال کے لئے انجام پانا چاہئے :(قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصاً لہ الدین[1]) '' (اے پیغمبرؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کروں اور اپنے دین کو اس کے لئے خالص قرار دوں'' اخلاص، خاص کر دین میں اخلاص پر خدائے متعال کی تاکید، اس لئے ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اسے خدا کی بندگی اور عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے اپنی زندگی کی راہ میں اور زندگی کے دوسرے تمام مراحل میں، تکامل و ترقی، سعادت اور بالیدگی کی فکر میں ہونا چاہئے یہ چیز اخلاص اور خدا کے سائے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عبادت کو خدا کے لئے خالص بنانا، دین کا سب سے بڑا حکم ہے، کیونکہ انسان کے لئے خدا کے تقرب اور کمال تک پہنچنے کے لئے یہ بذات خود ایک اہم عامل ہے۔ اس لئے خدائے متعال، چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ پر مخلصین کی ستائش کی گئی ہے،

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرماتا ہے:(واذکر فی الکتاب موسیٰ انہ کان مخلصاً و کان رسولاً نبیا[2]) ''اور اپنی کتاب میں موسیٰؑ کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ میرے مخلص بندے اور رسول و نبی تھے'' (لام پر کسرہ کے ساتھ) مخلص اس معنی میں ہے جو اخلاص رکھتا ہے اور اپنے کام اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ لیکن (لام پر فتحہ کے ساتھ) مخلَص، یعنی جو خالص ہوا ہے۔ فطری بات ہے کہ ''خالص شدہ'' کو ایک خالص کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ یقیناً خدائے متعال ہے جو مخلصین کو خالص کرتا ہے، تاکہ شیطان ان کو گمراہ نہ کر سکے :(قال فبعزتک لا غوینھم اجمعین الاعبادک منھم المخلصین[3]) ''اس نے کہا تو پھر تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا۔ سواء تیرے ان بندوں کے جو تیری بندگی میں خالص ہیں۔'' اس آیت کی وضاحت میں قابل ذکر بات ہے کہ ''مخلصین'' نفسانی، روحانی اور معنوی توانائی کے مالک ہوتے ہیں جو شیطان کے دام میں پھنسنے سے مانع ہوتی ہے اور شیطان ان پر

---

[1] زمر، ۱۱
[2] مریم، ۵۱
[3] ص: ۸۲، ۸۳

بُرا اثر نہیں ڈال پاتا ہے۔ البتہ خدائے متعال کے لطف و عنایت سے مخلصین اس توانائی سے بہرہ مند ہوئے ہیں، چنانچہ خدائے متعال حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے :(ولقد همت به وهم بها لولا ان رءا برهان ربه کذٰلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین[1]) '' اور یقیناً اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے یہ تو ہم نے اس طرح کا انتظام کیا کہ ان سے برائی اور بدکاری کا رخ موڑ دیں کیوں کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔ ''

اس آیۂ شریفہ میں تاکید ہوئی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام برائی اور گناہ میں مبتلا نہیں ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کے لئے ایسے مناسب اور وسوسہ انگیز شرائط فراہم ہوچکے تھے کہ اگر دوسرا کوئی بھی انسان ان شرائط میں قرار پاتا، تو شیطان کے جال میں پھنس جاتا۔ کیونکہ حضرت یوسف غریزہ جنسی اور خواہشات کے نقطہ عروج پر تھے اور عزیز مصر کے گھر کا ماحول بھی آرام و آسائش سے بھرا تھا اور عزیز مصر کی بیوی نے ایسے شرائط فراہم کئے تھے کہ اگر حضرت یوسف، برہان الٰہی کا مشاہدہ نہ کرتے تو پھسل جاتے۔

اخلاص، بہترین عمل کا سبب:مذکورہ مطالب کے پیش نظر، جو چیز انسان کے عمل کو قدر و منزلت بخشتی ہے اور انسان کے لئے شیطان کے آشکار و مخفی پھندوں سے نجات پانے کا سبب بنتی ہے، وہ خدائے متعال کی طرف توجہ دینا اور اخلاص ہے۔ اس لحاظ سے اگر مقدس ترین اور بڑے بڑے کام خدا کے لئے انجام نہ دئے جائیں تو ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ آیات و روایات کی تعبیر میں سب سے بہتر عمل جہاد ہے، یہاں تک خدائے متعال فرماتا ہے:(فضل اللّٰہ المجاهدین باموالهم وانفسهم علی القاعدین درجة وکلا وعد اللّٰہ الحسنیٰ وفضّل اللّٰہ المجاهدین علی القاعدین اجراً عظیماً[2]) ''اللہ نے اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر فضیلت و برتری عنایت کی ہے اور ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں

---

[1] یوسف، ۲۴
[2] نساء، ۹۵

اجر عظیم عطا کیا ہے۔ ''اب اگر اس عظمت اور شوکت کے با وجود جہاد خدا کی مرضی کے بغیر اور غیر الٰہی قصد سے انجام دیا جائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق، صدر اسلام کی جنگوں میں سے ایک جنگ میں ایک شخص بڑی شجاعت کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوا۔ اس شخص کی مجاہدت دلیری نے دوسروں کو اس کی ستائش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لئے انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: وہ شخص جس بہادری اور شجاعت سے لڑا، خدا کے نزدیک عظیم مقام رکھتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: وہ خدا کی راہ میں شہید نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اپنے گدے کہ راہ میں قتل ہوا ہے۔ (جب اس کا گدھا خوف و وحشت کی وجہ سے دشمن کی فوج میں گھس پڑا تھا تو وہ شخص اپنے گدے کو حاصل کرنے کے لئے دشمنوں سے لڑ رہا تھا!) جی ہاں، ہر جہاد و مبارزہ اور قتل ہونا انسان کو کمال تک نہیں پہنچاتا ہے۔ بلکہ انسان کو وہ شہادت کمال تک پہنچاتی ہے جو خدا کی یاد کے ساتھ ہو، ہمارے عزیز شہداء کی طرح کہ (ایران عراق جنگ کے دوران نذر کرتے تھے کہ شہید ہوجائیں۔ بعض اوقات چالیس شب جمعہ یا شب بدھ کو مسجد جمکران جاتے تھے اور شہادت کے لئے درخواست و آرزو کرتے تھے۔ یہ شہادتیں چونکہ خدا کی یاد اور اس کی توجہ کے ساتھ ہیں، اس لئے ان کی قدر و منزلت ہے۔

اعمال و رفتار ،قدر و قیمت اور عظمت یا پستی انسان کی نیت پر منحصر ہے، اگر انسان کی نیت پاک ہو اور اس کا عمل خدا کے لئے انجام پائے تو اس عمل کی قدر و قیمت ہے، اب جس قدر خدا کی یاد زیادہ ہوگی اور محبت و معرفت الٰہی میں اضافہ ہوگا اسی اعتبار سے، اس کے عمل کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں اگر عمل خدا کی معرفت و محبت اور اس کی یاد اور توجہ کے بغیر انجام دیا جائے تو وہ اس جسد کے مانند ہے جو بے روح و بے خاصیت ہے۔ زمین کے حصے جب ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، تو وہ یہ نہیں کہتے ہیں: کہ کسی نے تم پر جہاد کیا یا تم پر انفاق کیا یا نہیں، بلکہ پوچھتے ہیں کہ کسی نے تمھارے او پر خدا کو یاد کیا ہے یا نہیں؟ پس اگر انسان کا عمل خدا کی توجہ کے ساتھ انجام پائے تو وہ عبادت شمار ہوتا ہے اور اس صورت میں اس کا جہاد کرنا، نماز پڑھنا اور انفاق کرنا سب عبادت کہلائے گا۔ علم حاصل کرنا، تدریس، بحث و گفتگو حتی تقریر سننا بھی عبادت میں شمار ہوگا لیکن اگر اخلاص نہ ہو

تو نہ صرف یہ کہ اس کا عمل عبادت نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی توجہ مبذول کرنے کا ایک وسیلہ ہے!لہٰذا جو بات بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے اور جس کی اہمیت کو زمین کے ٹکڑے بھی درک کر چکے ہیں وہ خدا کی طرف توجہ اور اس کے دربار میں حاضری دینا ہے۔ جب ہم قرآن مجید کی ورق گردانی کرتے ہیں، تو ہم کسی ایسے صفحہ کو نہیں پاتے جس پر خدا کے ذکرا ور اس کی تسبیح کی بات نہ کہی گئی ہو۔ من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے: (یا ایّھا الذین آمنوا اذکر وا اللہ ذکراً کثیراً[1]) ''ایمان والو!اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو''ایک دوسری جگہ پر خدائے متعال، عقلمندوں کے لئے، آسمان، زمین اور شب و روز کی گردش کی تخلیق کے دلائل ذکر کرتے ہوئے عقل مندو ں کا تعارف فرماتا ہے: (الّذین یذکرن اللہ قیاماً وقعو داو علیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض[2]'' (...جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے،لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں'' امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے خدائے متعال سے عرض کی'' :یا رب تمر بی حالات استحیی ان اذکرک فیھا ' فقال: یا موسیٰ' ذکری علی کل حالِ حسن[3]''خدا وندا! میرے لئے ایسے حالات پیش آتے ہیں،ان حالات میں تجھے یاد کرنے میں مجھے شرم آتی ہے (شاید ان کا مقصود قضائے حاجت کے وقت ہو)

خدائے متعال نے جواب میں فرمایا: اے موسیٰ! میرا ذکر ہر حالت میں نیک ہے''اس لئے حتی قضائے حاجت کرنے کے لئے بیت الخلا میں جاتے وقت بھی بعض دعائیں نقل ہوئی ہیں، تاکہ انسان اس حالت میں بھی خدا کی عبادت سے غافل نہ رہے، کیونکہ خدائے متعال راضی نہیں ہوتا ہے حتی ہماری عمر کا ایک لمحہ بھی اس کی توجہ اور عبادت کے بغیر گزرے اور انسانی کمال خدائے متعال کی عبادت و بندگی کے سایہ میں ہی ممکن ہے۔ پس ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہر صورت اور ہر حالت میں، خواہ ضعیف انداز میں کیوں نہ ہو لیکن خدا کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔ خدا کی یاد اور اس کی طرف توجہ ایک ایسی اکسیر ہے جو ہر ناچیز شئ پر لگا دی جائے، تو وہ گراں بہا چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ اکسیر ہی ہے جو ہماری زندگی کو قدر و قیمت بخشتی ہے۔

---

[1] اسراء، ۴۱
[2] آل عمران، ۱۹۱
[3] بحار الانوار ،ج۱۳،ص۳۴۳

ساتواں درس

انسان کی سب سے بڑی دولت بندگی و عبادت

انسان کی سب سے بڑی دولت بندگی و عبادت

''یا اباذر؛ ما من شاب یدع للہ الدنیا و لھوھا و اھرم شابہ فی طاعۃ اللہ الا اعطاہ اللہ اجر اثنین و سبعین صدیقا'''' اے ابوذر ؛ جو بھی جوان خدا ئے متعال کے لئے دنیا اور اس کے لہو و لعب کو چھوڑ کر اپنی جوانی کو خدا کی اطاعت میں بوڑھا کر لے ،اللہ تعالی بھی اسے بہتر صدیقین کے اجر و ثواب عطا کرتا ہے'' دنیا کاانسان کے لئے طفیلی ہونا :حدیث شریف کے اس حصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم،انسان کی کمال جوئی اور راہ تکامل اختیار کرنے والے کی عظمت، کی اہمیت بیان فرماتے ہیں۔

کیونکہ بعض آیات و روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات اپنی پوری وسعتوں او ر عظمتوں کے ساتھ انسان کے کمال تک پہنچنے کیلئے خلق کی گئی ہے اور حقیقت میں اس دنیا کی تخلیق کا اصلی مقصد انسان ہے اور دوسرے تمام مخلوقات انسان کے طفیل میں خلق کی گئی ہیں خدائے متعال فرماتاہے:(ھو الذی خلق السموات و الارض فی ستہ ایام و کان عرشہ علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملا[1]) ''اور وہی وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے اور اس کا تخت اقتدار پانی پر تھا تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سب سے بہتر عمل کرنے والا کون ہے'' آیۂ مبارکہ کا مضمون یہ ہے کہ خدا ئے متعال نے آسمانوں، زمینوں اور عالم طبیعت کو اس لئے خلق کیا ہے تا کہ انسان کی خلقت کے اسباب فراہم ہو جائیں او رپھر انسان کو خلق کیا تا کہ اس کی آزمائش کرے۔آیۂ شریفہ کا مضمون حیرت انگیز ہے اور اس کا درک کرنا ہمارے طرز تفکر اور رفتار میں کافی اثر ڈالتا ہے یہ حقیقت ہے کہ خدائے متعال نے عالم وجود کو اس عظمت کے ساتھ اس لئے خلق کیا ہے کہ اس میں انسان کوپیدا کرے تا کہ وہ اس کے امکانات سے استفادہ کرکے اپنے کمال

---

[1] ھود،٧

تک پہنچے، انسان کی قدر و منزلت او راس کی ذمہ داری کی گہرائی کی دلیل ہے۔گزشتہ مطالب کا ذکر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے وجودکی قدر و قیمت کو دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں درک کرے اور جان لے کہ وہ کیڑے اور مینڈک جیسی مخلوقات کے مانند ایک سادہ مخلوق نہیں ہے،بلکہ وہ ایک عظیم اور قدرو منزلت والی مخلوق ہے کہ جس کی زندگی کی تسہیل کے لئے بہت سے سرمایہ کو وجود بخشا ،اور کائنات کو اسی آب وتاب کے ساتھ خلق کیا تا کہ ایک با شعور، با ارادہ او رصاحب اختیار مخلوق کی حیثیت سے اپنے وجودکی قدرو قیمت کو سمجھے لہٰذا پہلی فرصت میں ایک عاقل اور متفکر وجود ہونے کے ناطے ایک انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی اہمیت کو درک کرے، لیکن ان تمام اہمیتوں کے پیش نظر صرف اس نکتہ کا درک کرنا کافی نہیں ہے،بلکہ اسے عالم ھستی میں اپنی ذمہ داری اور وظیفہ کی عظمت کو بھی درک کرنا ضروری ہے اور جاننا چاہئے کہ وہ عبث،بیہودہ، باطل اور بغیر مقصد خلق نہیں کیا گیا ہے۔

مخلوقات عالم میں انسان ایک ایسی خصوصیتوں کا حامل ہے کہ دوسری مخلوقات میں وہ خصوصیتنہیں پائی جاتی ہیں اور وہ عقل کی نعمت سے آراستہ ہے۔ انسان کی دوسری تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت کے معنی یہ ہیں کہ عقل کے علاوہ دوسری خصوصیات و صفات میں بھی انسان دوسری مخلوقات پر برتری رکھتا ہے اور دیگر موجودات میں جو بھی کمال پایا جاتا ہے، وہ انسان میں بھی بدرجہ اعلی موجود ہے۔ یہ معنی انسان کا دیگر مخلوقات سے خوراک، لباس، رہائش اور ازدواج میں موازنہ کرنے سے بالکل واضح ہو جاتاہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جو اپنے اجتماعی زندگی کے نظم و تدبیر میں تبدیلیوں اورموجودہ ترقی سے جس طرح استفادہ کرتا ہے، وہ کسی بھی دوسری مخلوق میں نظر نہیںآتا ۔ اس کے علاوہ انسان اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے تمام مخلوقات کو بہ روئے کار لاتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں تمام حیوانات و نباتات و غیرہ ایسے نہیں ہیں،بلکہ ان کے بہت معمولی، بسیط اور مخصوص قسم کے اختیارات ہیں، وہ اپنے پیدائش سے آج تک اپنی حالت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے ہیں اور ان میں کسی قسم کی قابل توجہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔جب کہ انسان نے اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں بہت زیادہ ترقی کی ہے اور اس کی ترقی کا یہ سفر جاری ہے۔ مختصر یہ کہ انسان

تمام مخلوقاتِ عالم میں ان سے جس خصوصیت و برتری کا مالک ہے، وہ عقل کی خصوصیت ہے اس عل کے ذریعہ اس نے دنیا کی تمام موجودات پر فوقیت حاصل کی ہے اسی کے ذریعہ وہ حق و باطل، خیر و شر اور نفع و نقصان میں فرقپیدا کیا ہے۔ انسان کامل کی شرافت اور کرامت: (ولقد کرّمنا بنی آدم و حملنا ھم فی البرّ و البحر و رزقنا ھم من الطیبات و فضّلنا ھم علی کثیر ممّن خلقنا تفضیلا[1])

''اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے انھیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انھیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔''

علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں ''یہ آیت منّت رکھنے کے سیاق میں ہے، البتہ وہ منّت جو سرزنش کے ساتھ آمیختہ ہے۔ گویا خداوند متعال، انسانوں سے اپنی فراوان نعمتوں اور فضل و کرم کا تذکرہ کرتا ہے کہ اس نے انھیں ان نعمتوں کو حاصل کرنے اور رزق سے اپنی زندگی کو بخوبی گزارنے کے لئے، بیابانوں اور دریاؤں میں سواریاں اور کشتیاں چلائیں، اس نکتہ کی طرف متنبہ کرتاہے کہ انسان نے اپنے پروردگار کو فراموش کر دیا ہے، اس سے منہ موڑلیا اور اس سے کوئی چیز نہ مانگی اور دریا سے نجات پانے کے بعد پھر سے اپنی گزشتہ روش پر گامزن ہو، باوجودیکہ وہ ہمیشہ اس کی نعمتوں میں غرق تھا۔

خدائے متعال اس آیت میں اپنی کرامتوں اور فضل کا ایک خلاصہ بیان فرماتاہے، تاکہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس کا پروردگار اسے کس قدر عنایت کرتاہے اور انتہائی افسوس ہے کہ انسان اس عنایت کا بھی دوسری نعمتوں کے مانند کفران کرتاہے[2]۔ اس لئے بجا ہے کہ انسان اپنے وجود کے گوہر اور صدف کی قدر و منزلت کو جان لے اور اسے حقیر اور پست دنیا کے عوض فروخت نہ کرے۔

چشم دل باز کن تاکہ جان بینی

آنچہ نادیدنی است آن بینی

---

[1] اسراء، ٧٠
[2] المیزان دار الکتب لاسلامیہ، طبع سوم ج ١٣، ص ١٦٥

گر بہ اقلیم عشق روی آری

ہمہ آفاق گلستان بینی

بر ہمہ اہل آن زمین بہ مراد

گردش دور آسمان بینی

آنچہ بینی دلت ہمان خواہد

وآنچہ خواہد دلت ہمان بینی[1]

(دل کی آنکھیں کھولو تاکہ روح ''ہستی'' کو دیکھ لو، جو دیکھنے کے قابل نہیں ہے اسے دیکھ لو گر ملک عشق کی طرف توجہ کرو گے تو تمام آفاق کو گلستان پاؤ گے، تمام اہل زمین، گردش افلاک کو اپنے مقصد کے مطابق خیال کریں گے جسے دیکھو گے تمھارا دل اسی کو چاہے گا اور تمھارے دل اور آرزو کے مطابق تمام چیزیں نظر آئیں گی)انسان کو انسانی کما لات تک پہنچنے کے لئے بعض خاص شرائط اور سہو لتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دنیا جو عالم طبیعت کے ای پر شکوہ نظام کا حصہ ہے اپنے تمام تر تبدیلیوں اور ترقیوں کے ساتھ انسان کے اختیار میں ہونی چاہئے۔ ہم کسی حد تک جانتے ہیں کہ اگر عالم طبیعت میں وہ تحولات اور متواتر نظم نہ ہوتا تو یا انسان کی اختیاری زندگی متحقق نہ ہوتی یا ناقص صورت میں متحقق ہوتی ۔ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ کائنات کا ایک ہماہنگ نظام ہے اور اس کے اجزا و عوامل ایک دوسرے کے محتاج ہیں ۔

ان عوامل کا ایک نمونہ مختلف سیاروں میں پایا جانے والا قوۂ جاذبہ ہے یہاں تک کہ اگر اس معین اور دقیق جاذبہ میں کسی قسم کا خلل ایجاد ہو جائے اور ایک سیارہ اپنے مدار سے ہٹ جائے تو تمام سیاروں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک خلاف توقع المیہ

---

[1] ہاتف اصفہانی کے اشعار

پیش آئے گا۔جیسا کہ اشارہ ہوا، عالم اس عظمت کے ساتھ انسان کی خلقت اوراس کے کمال تک پہنچنے کا ایک مقدمہ ہے۔ اور جن کمالات تک انسان پہنچنا چاہتا ہے،اور یہ بات شائستہ ہے ایک عالم اتنی وسعت و عظمت کے ساتھ اس کی حیثیت انسان کے لئے طفیلی۔ اگر چہ تمام انسانوں میں سے بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان کما لات کی انتہا تک پہنچتے ہیں اور بقیہ افراد تو ان کے وجود کے سایہ میں کسی حد تک بہرہ مند ہوتے ہیں اور ان کے وجود کا دارو مدار ان نیک اور منتخب شخصیات کے وجو کے تابع ہے ۔ مثال کے طور پر پچاس کلو میٹر وسیع و عریض علاقہ پر پوری گہرئی سے چند دانے ہیرے حاصل کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر کھدائی کی جائے تویہاں پر اصلی مقصد ہیروں کے چند دانے حاصل کرنا ہے، اگر چہ اس کھدائی کے دوران پتھرکے کوئلہ کا بھی استخراج ہوتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا ہیروں کی کھدائی کے لئے کہ جومعدن کے استخراج کا اصلی مقصدہے دوسرے مواد بھی موجود ہوتے ہیں کہ جن کو ددسرے درجے کی اہمیت حاصل ہے ان کے علاوہ کچھ بے فائدہ چیزیں بھی ملتی ہیں جنھیں ضایعات کے طور پر دور پھینکا جاتا ہے۔

اس دنیا کی خلقت کا مقصد کچھ انوار پاک ہیں کہ ان میں بر جستہ ترین و مشخص ترین انوار مقدس چہار دہ معصومین علیہم السلام ہیں، اور ان کے بعد تمام انبیاء اور وہ افراد ہیں جو اپنے کمال کے درجات کے مطابق ان میں ملحق ہوتے ہیں ۔ (تقریبا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور اولیائے خدا ہیں۔ ان میں سے بعض انبیاء دوسرے انبیاء سے بر تر ہیں ہم انکی تعداد سے بے خبر ہیں)پس کمالات نسانی کا آخری درجہ اور مرتبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ ؐکے اہل بیت علیہم السلام کی ذات میں منحصر ہے اور ان مالات کے ادنی مراتب ان لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو دوسروں کے بعد بہشت میں داخل ہوں گے۔ ان افراد کے علاوہ ،دوسرے لوگ جن کے دل ایمان کے نور سے خالی ہیں، انھیں ضائعات کے مانند قہرالٰہی کی آگ میں جلادیا جائے گا :(ولقد ذرانا لجہنّم کثیرا من الجن و الانس لہم قلوب لایفقھون بہا و لہم اعین لا یبصرون بہا و لہم آذان لا یسمعون بہا'' [1] (...اور یقیناًہم نے انسان و جنات کی ایک

---

[1] اعرف/ ۱۷۹

کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں''۔جہنم میں اس دنیا کے ضائعات ہیں اور خلقت عالم کا اصلی مقصد ،پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ،فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اور ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں کہ عالم اپنی پوری وسعت اور عظمت کے ساتھ فضیلت و کمال کے لحاظ سے ان میں سے کسی کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے ؛ بلکہ ان کے ایک دن کی قیمت پورے اس کائنات کے برابر ہے ۔ اس عالم کے اصلی وارث وہ انسان ہیں جو سعادت پاکر خدا کا تقرّب حاصل کر چکے ہیں:(ان المتقین فی جناتِ و نہرِ فی مقعد صدقِ عند ملیکِ مقتدر[1]) ''بیشک صاحبان تقوی باغات اور نہروں کے درمیان ہوں گے۔اس پاکیزہ مقام پر جو صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں ہے''۔بہشت مومنین اور محبان اہل بیت کی جگہ:ہمارا اعتقاد ہے کہ با ایمان مرنے والے بہشت میں جائیں گے؟

حتی اگر ان کا ایمان سب سے ادنی درجہ کا بھی ہو اور وہ ایمان مرتے وقت کفر میں تبدیل نہ ہوا ہو۔ (وہ عالم برزخ کے بعد بہشت میں داخل ہوتاہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کمال ایمان ،اعتقاد اور محبت اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے چنانچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔'':الا و من مات علی حبّ آل محمدِ مات مومناً مستکمل الایمان، الا و من مات علی حب آل محمدِ بشّرہ ملک الموت بالجنۃ[2]'' بیشک جو آل محمدؐ کی محبت میں مرجائے، وہ مؤمن اور ایمانِ کامل کے ساتھ مراہے۔بیشک جو آل محمدؐ کی محبت میں مرجائے، ملک الموت اسے بہشت کی بشارت دیتے ہیں۔''اس لحاظ سے جو شیعہ محب اہل بیت علیہم السلام ہے اور خدائے متعال اور اولیائے خدا کے حکم کے مقابلہ میں خاضع اور فرمانبردار ہے، اسے موت کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ موت مومن کے سامنے رضائے الٰہی تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا'':اے شریف زادو! صبر و تحمل سے کام لو کہ موت صرف ایک پل ہے جو تمہیں سختیوں اور مشکلات سے عبور کراکے وسیع باغوں اور ابدی نعمتوں میں پہنچاتی ہے اور حقیقت میں تم میں سے کون راضی نہیں ہے جو زندان سے محل کی

[1] قمر،۵۴و۵۵
[2] بحار الانوار ،ج ۲۳، ص ۲۳۳

طرف روانہ ہو جائے[1] ''حضرت علی علیہ السلام متقین کے لقاء اللہ کے شوق کے بارے میں فرماتے ہیں '':اگر ان کے لئے (متقین) موت معین او رمقدر نہ کی گئی ہوتی تو ثواب کے شوق اور عذاب کے ڈر سے ان کی جان ان کے بدن میں ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہ رہتی ''ان کی نظروں میں پروردگار عالم عظیم ہے اس لحاظ سے دوسرے ان کی نظروں میں چھوٹے ہیں[2] ''ایک شخص نے جناب ابوذرؓ سے پوچھا : ہم کیوں موت سے بیزار ہیں؟ جناب ابوذرؓ نے جواب میں فرمایا '':لانکم عمرتم الدنیا وخربتم الآخرہ فتکرہون ان تنتقلوا من عمران الی خراب.[3] ''

چونکہ تم لوگوں نے اپنی دنیا کو آباد کیا ہے اور اپنی آخرت کو ویران کیا ہے۔اس لئے آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہونے کے لئے راضی نہیں ہو۔ ''افراد اپنے ایمان و اعمال کے مراتب کے مطابق بہشت سے بہرہ مند ہوتے ہیں: کچھ لوگ مرنے کے بعد برزخی بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے بعد قیامت کے دن بہشت میں جاتے ہیں۔

لیکن جو لوگ گناہ گار تھے،مگر یہ کہ ان کے وجود میں ایمان کا ایک ضعیف روشن تھا، وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے کے بعد اور ممکن ہے برسوں تک عذاب برداشت کریں اور گناہوں سے پاک ہونے کے بعد بہشت میں داخل ہوں گے۔ان کی مثال اس سونے کی سی ہے جسے بھٹی میں ڈال دیاجاتاہے تا کہ آلودہ اور غیر خالص مادہ اس سے دور ہو جائے اور خالص سونے میں تبدیل ہو جائے۔یقیناً یہ لوگ بہشت کے مالک نہیں ہیں، بلکہ یہ ایسے مہمان ہیں جو بہشت کے اصلی مالکوں کی شفاعت اور خدائے متعال کے لطف و کرم سے بہشت میں پہنچے ہیں.ا۔ صاحبان بہشت:بہشت کے اصلی مالکوں کا خدائے متعال نے یوں تعارف کرایا ہے:

(ومن یطع اللہ و الرّسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النّبییّن و الصّدیقین و الشّہداء و الصالحین و حسن اولئک رفیقا[4]) ''اور جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا، جن پر خدا نے نعمتیں نازل کی ہیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور

[1] شیخ صدوق ، معانی الاخبار ، ص ۲۸۹
[2] نہج البلاغہ (ترجمہ فیض الاسلام) ،ج ۱۸۴، ص ۶۱۲
[3] فیض کاشانی، محجہ البیضاء، ج ۸، ص ۲۵۸
[4] نساء، ۶۹

صالحین اور یہی بہترین رفقاء ہیں۔ ''یہ آیۂ مبارکہ بہشت کے اصلی مالک کی حیثیت سے چار گروہ کا تعارف کراتی ہے اور دوسرے افرادان کی پیروی اور شفاعت سے بہشت میں داخل ہوتے ہیں اور حقیقت میں وہ لوگ میزبان اور صاحب خانہ ہیں اور دوسرے مہمان۔ صاحبانِ بہشت،یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین وہ لوگ ہیں جن پر خدائے متعال نے اپنی نعمتیں تمام کی ہیں اور ہمیں حکم دیاہے کہ ہم ہر روز نماز میں خدا سے دعا کریں کہ ہمیں ان کی راہ کی طرف ہدایت فرمائے: (اہدنا الصّراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم)قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ آیۂ مبارکہ میں،شہداء سے مراد قیامت کے دن بندوں کے اعمال پر گواہی دینے والے ہیں کہ ان کا مقام دیگر شہداء سے بلند ہے۔

چنانچہ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں '': شہادت کا مقصود (بعض آیتوں میں) لوگوں کے اعمال پر شہادت ہے اور اس سے مراد ان اعمال کے حقائق کو دیکھنا اور برداشت کرنا ہے جنھیں لوگ دنیا میں انجام دیتے ہیں،خواہ وہ حقیقت سعادت ہو یاشقاوت ۔پس قیامت کے دن شاہد اس چیزکی شہادت دیتا ہے جسے اس نے دیکھاہے جس دن خدائے متعال ہر چیز سے گواہی لیتا ہے، حتی بدن کے اعضا سے بھی شہادت لیتا ہے، جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: (...یا رب ان قومی اتّخذوا ھذاالقرآن مھجورا[۱]) ''پروردگارا:میری قوم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے''واضح رہے کہ اس قسم کا عظیم مرتبہ پوری امت کی شان میں نہیں ہوسکتا ہے،چوں کہ یہ ایک خاص فضیلت ہے جوخدا کے اولیائے طاہرین کے لائق ہے کم ترین مقام جو یہ گواہ (اعمال کے شاہد) رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ولایت کے تحت اور اس کی نعمت کے سایہ میں پلتے ہیں اور اصحاب صراط مستقیم ہیں[۲]۔ پس ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیاکہ خدا کے برترین بندے اور وہ جن کے حق میں خدائے متعال نے اپنی نعمتیں تمام کیں اور انھیں صاحبان بہشت قراردیا، انبیاء،صدیقین،شہداء اور صالحین ہیں ۔ دوسرے بندے ان چار گروہوں کی پیروی اور وابستگی کی وجہ سے بہشت میں داخل ہوں گے البتہ جو لوگ خدا کے نیک و صالح بندوں سے رابطہ کی وجہ سے سعادت و بہشت تک

---

[۱] فرقان،۳۰

[۲] المیزان(دارالکتاب الاسلامیہ، طبع سوم)ج،۱،ص ،۳۲۴۔۳۲۵

پہنچتے ہیں وہ مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں اور سب ایک مرتبہ میں نہیں ہیں، یہاں تک کہ خود وہ چار گروہ مراتبکے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور بعض کو بعض دو سروں پر فوقیت و بر تر ی حا صل ہے۔الف: انبیاء اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقام:فرمان الٰہی کے مطا بق انبیاء دوسرے لوگوں پر بر تری رکھتے ہیں۔(ان اللہ اصطفی آدم و نوحا و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین[1]) ''اللہ نے آدم، نوح اور آل ابراھیم اور آل عمران کو دنیا کے لوگوں پر بر تری بخشی ہے''اس کے علاوہ بعض پیغمبر دوسرے پیغمبر وں پر بر تری رکھتے ہیں:(تلک الرسل فضّلنا بعضھم علی بعض [2]''(:ان رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر بر تری دی ہے''ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے صرف۳۱۳ افراد مقام رسالت کے حامل تھے۔ اور ان میں سب رسول صاحب شریعت نہیں تھے،بلکہ صرف پانچ رسول صاحب شریعت تھے کہ جن سے یہ افراد مراد ہیں : نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسی علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام،اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ۔

یہ اولوا العزم انبیاء دیگر تمام رسولوں سے بر تر ہیں اور ہما رے اعتقاد کے مطا بق حضرت خاتم الا نبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان سب سے افضل و بر تر ہیں چنانچہ پیغمبر اکرم ؐنے فر مایا ہے '': یا علی ان اللہ تبارک وتعالی فضّل انبیاءَ المرسلین علی ملائکتہ المقربین و فضّلنی علی جمیع النبیین والمرسلین والفضل بعدی لک یا علی وللأئمۃ من بعدک وان الملائکۃ لخدامنا وخدام محبینا[3]...'' ''اے علیؑ!خدائے متعال نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مقرب فر شتوں پر بر تری عنایت کی ہے اورمجھے تمام انبیاء اور پیغمبر وں پر فوقیت و بر تری دی ہے اور میرے بعد بر تری کے مستحق تم اور تمھارے بعدآنے والے ائمہ ہیں ،بیشک فر شتے ہما رے اور ہمارے دوستوں کے خدمت گزار ہیں'' ثا بت ہوا کہ انسان کی خلقت کا اصلی مقصد خدا کے منتخب بندے ہیں اور چونکہ عام افراد انسانی کمالات میں ایک دوسرے سے متفاوت ہیں، انبیاء و صالحین او ر خدا کے دوستوں میں بھی کمالات انسانی کے لحاظ سے فرق ہے اور ان کے مراتب اور درجات میں اختلاف ہمارے لئے قابل درک نہیں ہے او رصرف خدا ان سے آگاہ ہے۔

---

[1] آل عمران۳۳
[2] بقرہ۲۵۳
[3] بحار الانوار ، ج ۱ ، ص ۳۴۵

انبیائے الہی اور اولیائے خدا حتی ایک پلک جھپکانے کے برابر بھی شرک و گناہ میں آلودہ نہیں ہوئے ہیں،یہاں شرک بہ معنی حقیقی ہے یعنی غیر خدا کی طرف لو لگانا بت پرستوں کے شرک کی تو بات ہی نہیں ہے،ان کا مقصود و مطلوب خدائے متعال ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصود و مطلوب نہیں ہوتا ۔اگر وہ کبھی غیر خدا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو فریضہ اور خدا کی اطاعت کے طور پر ہے کہ ان سے خدانے یہ چاہا ہے کہ اس کے دوسرے بندوں سے غافل نہ رہیں او ر اپنے اصلی مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنے مادی وسائل سے فائدہ اٹھائیں ورنہ ان کا مقصد صرف خدا ہے اور بس.ہم انبیائے کرام کے اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کے بارے میں صرف ایک ضعیف تصور رکھتے ہیں اور ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے ،بلکہ اگر ہم ان کے مقام کی کیفیت کے بارے میں فکر کریں تو ہماری عقل حیران ہوجاتی ہے۔

ان کے مقام و منزلت کے بارے میں صرف وہ اور ان کاخدا واقف ہے اور دوسرے ان کے انسانی مرتبہ اور مقام و منزلت کی معرفت حاصل کرنے سے عاجز ہیں: (فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرہ اعینِ جزاء بما کانوا یعملون[1]) ''پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کاسامان چھپا کر رکھاگیاہے جوان کے اعمال کی جزا ہے''.

ب۔صالحین کا مقام: منجملہ انسانی عالی مراتب، جن کی طرف اشارہ ہوا، صالحین کامرتبہ ہے کہ ان کے بلندمرتبہ اور عظمت و منزلت کے بارے میں خدائے متعال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرماتاہے:(رب ہب لی حکما و الحقنی بالصالحین[2]) ''خدایا !مجھے علم وحکمت عطا فرمااورمجھے صالحین کے ساتھ ملحق کردے ۔''ایک دوسری جگہ پر فرماتاہے:(ووہبنا لہ اسحاق و یعقوب نافلۃ و کلاّ جعلنا صالحین[3]) ''اور پھرابراہیم کو اسحاق اور ان کے بعد یعقوب عطاکئے اور سب کو صالح اور نیک کردارقرار دیا.''

---

[1] سجدہ ،۱۷

[2] شعراء،۸۳

[3] انبیاء ،۷۲

ج۔ صدیقین کا مقام:ایک او ربلند انسانی مرتبہ، صدیقین کا مرتبہ ہے کلمۂ ''صدیقین'' جیسے کہ خود کلمہ دلالت کرتا ہے کہ ''صدق ''کا مبالغہ ہے، یعنی وہ جو بہت زیادہ سچے ہیں۔ حقیقت میں صدق صرف زبانی نہیں ہے: اس کے مصادیق میں سے ایک انسان کی گفتگو ہے جو وہ بولتا ہے، اس کا دوسرا مصداق عمل ہے، کہ اگر عمل بات اور دعوی کے مطابق ہے، تو صادق ہے۔ چونکہ انسان کا عمل اس کے اندرونی اعتقاد کی حکایت کرتا ہے اور انسان اس حکایت میں اس وقت صادق ہے جب وہ مافی الضمیر کو مکمل طور پر حکایت کرے او راس میں سے کوئی چیز باقی نہ رکھے، ایسا عمل صحیح اور صادق ہے۔اس کے مقابلہ میں اگر ما فی الضمیر کی حکایت نہ کرے یا صحیح اور مکمل طور پر حکایت نہ کرے، تو وہ عمل غیر صادق ہے۔

سچ بات بھی وہ بات ہے جو واقع اور خارج کے ساتھ مطابقت رکھے، چونکہ بات کرنا بھی ایک فعل ہے، قہری و فطری طور پر جو اپنے فعل میں صادق ہے وہ اس وقت تک بات نہیں کرے گا جب تک کہ اس کے سچ ہونے کے بارے میں علم نہ ہو جائے اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ بات کہنا مناسب اور بجا ہے اور اس کا کہنا حق ہے۔ اس بنا پر ایسی بات خود اور بولنے کی صداقت کی حکایت بھی ہے اور کہنے والے کی صداقت کی حکایت بھی ۔پس صدیق وہ ہے جو کبھی اور کسی صورت میں جھوٹ نہیں بولتا ہے اور جس کام کے حق ہونے کے بارے میں نہیں جانتا ہے اسے انجام نہیں دیتا ہے خواہ، وہ کام کتنا ہی اس کے نفسانی خواہشات کے مطابق کیوں نہ ہو، اسی طرح جس بات کے سچ ہونے کے بارے میں نہیں جانتا، اسے نہیں کہتا ہے اور جو کام عبودیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اسے انجام نہیں دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنی توصیف میں فرماتے ہیں... '':وانی لمن قوم لا تاخذ ہم فی اللہ لومة لائم، سیماہم سیما الصدیقین وکلامھم کلام الابرار[1]'' ''میں ان لوگوں میں سے ہوں جو راہ خدا میں سرزنش و ملامت کرنے والوں سے باز نہیں آتے ہیں ۔ان کی نشانیاں سچّوں کی نشانیاں ہیں اور ان کی باتیں سچے کر دار والوں کی باتیں ہیں''صدیقین کا مقام ایک ایسا مقام ہے کہ جب خداوند متعال اپنے

[1] نہج البلاغہ " ترجمہ شہیدی'' خطبہ ،۱۹۲ص،۲۲۴

بعض پیغمبروں کے مقام کی توصیف کرنا چاہتا ہے تو فرماتاہے:(واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقا نبیا[1]) ''اور کتاب خدا میں ابراھیم کا تذکرہ کرو کہ وہ ایک صدیق پیغمبر تھے۔''یا حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کے بارے میں فرماتا ہے:(و امہ صدیقہ[2]) البتہ ہمیں کوئی طمع نہیں ہے کہ صدیقین یا صالحین کے جیسے مقام تک پہنچ جائیں، لیکن انسان کی کوشش کسی بھی حالت میں پست نہیں ہونی چاہئے۔اس اپنی استعداد وں اور توانائیوں کے مطابق کوشش کرنی چاہئے اور برتر مراتب تک پہنچنے کے لئے سعی کرے۔اسے ان مراحل تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے، جن تک غیر معصوم انسان پہنچ سکتے ہیں،علماء کے درمیان ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو انسانی مراحل کے اعلی مقام تک پہنچے تھے، ہم نے ان میں سے بعض کو دیکھا ہے اوران سے واقف ہیں اور کتنے ایسے بزرگوار ہیں جو تکامل کے اس مرحلے تک پہنچے ہیں جو خاصان خدا سے مخصوص ہے اور ہم ان کے بارے میں خبر نہیں رکھتے ہیں۔یقیناً ایسے بلند وبالا مقامات عالی ہمت اورپیہم کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے شاعر کہتا ہیں:

ہمت بلند دارکہ مردان روزگار

از ہمت بلند بہ جائی رسیدہ اند

(اپنی ہمت کو بلند کروکہ مردان روزگار بلند ہمت سے ہی عالی مقامات تک پہنچے ہیں)ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

ہمت اگر سلسلہ جنبان شود

مور تواند کہ سلیمان شود

اگر ہمت اور حوصلہ کو بہ روئے کار لایا جائے تو ایک چونٹی بھی سلیمان ہو سکتی ہے۔ خدا کے منتخب بندوں کے لئے عصمت کا ایک خاص درجہ:خدائے متعال نے انسان کی تکامل و ترقی اور بالیدگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ قرار نہیں دی ہے۔ اگر انسان ہمت

[1] مریم ,۴۱
[2] مائدہ۷۵

کرے تو وہ مقام صالحین جیسے بلند مقامات تک پہنچ سکتا ہے،اگر چہ وہ معصوم نہیں ہو سکتا صدیقین اور صالحین کا مقام معصومین کے مقام سے پست تر ہے ۔ اس لحاظ سے ہر انسان ان مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔ ہر انسان اپنی پوری عمر میں گناہ نہیں کر سکتا ہے اور حقیقت میں جو شخص چاہتا ہے کہ گناہ میں آلودہ نہ ہو اور اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول رکھے اور صرف خدا کی خوشنودی کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دے، تو وہ عمل میں معصوم ہے، اگر چہ معصوم کی اصطلاح اس پر صادق نہیں آتی ہے۔اس مطلب کی ضاحت میں کہنا چاہئے:لغت میں ((عصمت)) روکنے اور رکاوٹ بننے کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں ایک نفسانی ملکہ کو کہتے ہیں جوانسان کو گناہ حتی خطا و اشتباہ سے محفوظ رکھے ۔

اب کیا یہ ملکہ مانع ہے اور اسی لئے اسے ملکہ ''عصمت'' کہتے ہیں، یا یہ کہ خدائے متعال اس انسان کو گناہ، خطا و اشتباہ سے روکتا ہے جس میں یہ ملکہ پایا جاتا ہے فی الجملہ دونوں معنی صحیح ہیں، خواہ ہم یہ کہیں کہ معصوم وہ ہے جو ایسا ملکہ رکھتا ہے اور وہ ملکہ اسے خطا اور گناہ سےمحفوظھے ، یا یہ کہیں کہ معصوم وہ شخص ہے کہ اللہ تعالی اسے گناہ اور اشتباہ سے روکتا ہے، تو ہم نے خطا نہیں کی ہے کیونکہ خدائے متعال بھی اسی ملکہ کے ذریعہ اس کا تحفظ کرتا ہے۔پس معصوم وہ ہے جو خطا وگناہ سے پاک ہو یا صرف گناہ سے محفوظ ہو۔

عصمت کی قسمیں:١۔ گناہ سے عصمت: یعنی معصوم وہ ہے جو اختیار و قصد سے کسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے۔

٢۔ خطا و اشتباہ سے عصمت: یعنی معصوم وہ ہے جو گناہ کو ترک کرنے کے علاوہ خطا و اشتباہ سے بھی پرہیز کرے ، عصمت کی پہلی قسم ، مقام عمل میں عصمت ہے، لیکن عصمت کی دوسری قسم، عمل اور غیر عمل دونوں کو شامل ہے، یعنی مقام ادراک اور تشخیص میں بھی معصوم ہے ، چونکہ دوسری قسم کا معصوم وہ ہے کہ نہ صرف مقام عمل میں گناہ نہیں کرتا ہے، بلکہ تشخیص میں بھی خطا سے دوچار نہیں ہوتاہے۔ یعنی صحیح سمجھ بھی سکتے ہیں صحیح بیان بھی کرتے ہیں اور صحیح عمل بھی کرتے ہیں ۔علامہ طباطبائی رحمۃاللہ علیہ انبیاء اور ائمہ معصومین کی عصمت کے بارے میں فرماتے ہیں: قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ خدائے متعال نے انھیں

اپنے لئے منتخب کیا ہے اور اپنے لئے خالص قرار دیا ہے، جیسے کہ فرماتا ہے:(و من ءآباءھم و ذریا تھم و اخوانھم و اجتبیناھم و ھدیناھم الی صراط مستقیم[1]) ''اور پھر ان کے باپ دادا، اولاد اور برادری میں سے اور خود انھیں بھی منتخب کیا ور سب کو سیدھے راستہ کی ہدایت کر دی'' خدائے متعال نے انھیں علم میں سے وہ مرحلہ عطا کیا ہے جو عصمت کا ملکہ ہے اور وہ انھیں گناہ کے ارتکاب اور جرائم سے روکتا ہے۔ اس ملکہ کے ہوتے ہوئے ان سے گناہ کا (حتی گناہ صغیرہ) سر زد ہو نا محال ہوتا ہے ۔ اگر چہ عصمت،اورعدالت کے دونوں ملکہ گناہ کے مرتکب ہونے سے مانع ہوتے ہیں، لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ عصمت کے ملکہ ساتھ گناہ کا سر زد ہونا ممتنع ہوتاہے، لیکن عدالت کے ملکہ ساتھ گناہ کا سرزد ممتنع نہیں ہوتا ہے۔

مزید فرماتا ہے'' :عصمت'' کا ملکہ سے سے نہ صرف یہ کہ اس کا اثر کو نہیں بدلتا ہے بلکہ اس کا اثر قطعی اور دائمی ہے ، اسی کے ساتھ طبیعت انسانی کو کہ وہی اپنے ارادی افعال میں مختار ہو نا ہے تغیر دئیے بغیر اسے عصمت کے لئے مجبور و مضطرب نہیں کیا جاسکتا ۔ اسے کیسے مجبور کر سکتاہے،جبکہ علم خود اختیارات کا مقدمہ ہے اور علم کا قوی ہونا ارادہ کے قوی ہونے کا سبب ہوتا ہے، مثلا جو تندرستی کا طالب ہے، اگر یقین پیدا کر لے کہ فلاں چیز زہر قاتل فوری ہے،بلکہ یقین اسے مجبور کر دیتا ہے کہ اپنے کو ارادہ و اختیار کے ساتھ اس زہریلے سیال مادہ کو پینے سے روک لے[2]۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، حتی بعض افراد جیسے حضرت ابو الفضل العباس علیہ السلام اور حضرت علی اکبر علیہ السلام اور بہت سے امام زادے دوسری قسم کی عصمت جو بعض انبیاء، ائمہ معصومین اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے مخصوص ہے کے مالک نہیں ہیں، جبکہ وہ اپنی پوری زندگی میں مرتکب گناہ نہیں ہوئے ہیں ۔ البتہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کا مقام دوسرے لوگوں سے بدرجہ ہا بلند ہے اور وہ ایک قسم کے مقام عصمت کے مالک ہیں، البتہ جو عصمت بعض انبیاء اور ائمہ کے لئے مخصوص ہے ، اس کے یہ مالک نہیں ہیں۔ نتیجہ نکلا کہ انسان گناہ سے عملی عصمت کا مالک ہو سکتا ہے اور عملا گناہ نہ کرے

[1] انعام،۸۷
[2] المیزان(دارالکتب الاسلا میہ ،طبع سوم)ج۱۱،ص۱۷۷۔۱۸۹

اور اگر بلند ہمت رکھتا ہے اور تزکیہ نفس اور نفسانی خواہشات کو کچل کر خدائے متعال سے اپنے رابطہ کو مستحکم کرلے تو وہ صدیقین کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔لہذا ہمیں معنوی کمالات تک پہنچنے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھانا چاہئے اور خود کو صدیق یا صالح بننے کی تلقین کرنا چاہئے۔ بیشک اگر انسان کوشش کرے اور ضروری ظرفیت اور کما حقہ تمام شائستگی کو کسب کرے، تو خدائے متعال ایسے مقامات عطا کرنے میں بخل نہیں کرتا ہے ۔ بنیادی طور پر خود خدائے متعال نے انسان کی ہمت افزائی کی ہے کہ وہ بلند مقام تک پہنچے اور اسلام نے مومن کو بلند ہمتی کی دعوت دی ہے اور خدائے متعال چاہتا ہے کہ مومن کے حوصلے بلند ہوں اور وہ تھوڑے پر مطمئن اور قانع نہ ہوجائے، انبیاء کے مقام پر نظر رکھے اور کوشش کرے کہ ان کی پیروی۔

اگر ہم انبیاء کے درجہ اور مقام عصمت تک نہیں پہنچ سکتے، لیکن صدیق اور صالح بن سکتے ہیں، کیونکہ انبیاء اور ائمہ معصومین کی خصوصی عصمت کے لئے ان دونوں چیزوں کی شرط نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ''صدیق یعنی'' سچ بولنے اور راست گفتاری میں مبالغہ ہے، یعنی جو اپنی زندگی میں جھوٹ کو اپنے نزدیک آنے کی اجازت نہ دے، نہ اپنے گفتار میں، نہ کردار میں اور نہ اپنی سوچ میں حتی غلط فکر اور برا تصور بھی نہیں کرتا ہے ۔

ایمان میں صداقت کی اہمیت اور اس تک پہنچنے کا راستہ: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچائی وصداقت کی قدر و قیمت کے بارے میں فرماتے ہیں'': ان ا لصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ و ان الرجل لیصدق حتی یکتب عنداللہ صدیقا[1]'' ''صدق، نیکی کے لئے راہنما ہے اور نیکی بہشت کے لئے، اور مرد سچ نہیں کہتا ہے مگر یہ کہ خدا کے نزدیک صدیق کی حیثیت سے پہچا نا جائے''شاید ہم بولنے فکر کرنے اور رفتار وکردار میں صداقت پیدا کرنے کو مشکل نہ سمجھیں اور اپنی جگہ یہ تصور کریں کہ ایسا ممکن ہے کہ ہم جھوٹ نہ بولیں، بری فکر کو اپنے ذہن میں پلنے نہ دیں اور ناشائستہ رفتار سے پرہیز کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے ۔ ہم سب دعوی کرتے ہیں کہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیشہ خدا کو حاضر وناظر جانتے ہیں، لیکن کیا ہماری رفتار و گفتار ہمارے

---

[1] فیض کاشانی،المحجۃ ا لبیضاء ،ج۸،ص۱۴

ایسے دعوی کی تائید کرتی ہیں؟ہم بعض اوقات تنہائی میں ایسے کام انجام دیتے ہیں کہ اگر ایک چھوٹا بچہ ہمارے پاس ہوتا تو ہم شرم کے مارے ڈوب مرتے اور وہ کام انجام نہ دیتے،اب ہم کیسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا حاضرو ناظر ہے جبکہ ہم برے کام انجام دیتے ہیں!حقیقت میں ہم خدائے متعال کو ایک بچے سے بھی کم تر جانتے ہیں اور اپنے اعتقاد میں صادق نہیں ہیں بلکہ ہمارے اعتقاد میں جھوٹ اور کذب کا شائبہ پایا جاتا ہے ۔

ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر انسان اپنی عمر کو خدا کی اطاعت میں صرف کرے ،تو خدائے متعال اس کی عمر کے ہر لمحہ کے مقابلہ میں اسے ایسی جزا دیتا ہے کہ اس کی قیمت پوری دنیا اور جو کچھ اس میں موجود ہے ،کے برابر ہے ،لیکن کیا ہم اس اعتقاد اور باور میں صادق ہیں ؟کیا ہماری رفتار اس اعتقاد کی تصدیق کرتی ہے؟اگر کسی کے پاس سونے سے بھری ایک چھوٹی سی تھیلی ہو،کیا وہ اسے بیہودہ طور پر کنویں میں ڈال دے گا ؟کیا کوئی عاقل انسان ایسا کر سکتا ہے ؟یا یہ کہ اگر سونے کا ایک سکہ بھی اس کے پاس ہوتو اسے ایک محفوظ جگہ پر چھپائے رکھتا ہے تاکہ گم نہ ہوجائے یا چوری نہ ہوجائے؟پس انسان کبھی اپنے مادی سرمایہ اور دولت کو بیہودہ طور پر ضائع نہیں کرتا ہے،کیونکہ اس کام کو وہ معقول تصور نہیں کرتا ہے۔

اب ہم اگر یقین کرتے ہیں کہ ہماری عمر کا ہر لمحہ ہیرے سے گراں قیمت ہے کیا ہم حاضر ہیں اسے مفت میں کھو دیں ؟کیا ہم اس فکر میں ہیں کہ گناہ نہ کریں ،کیا ہم اپنی عمر کو بیہودگی اور لغو کے عالم میں ضائع نہیں کرتے؟اگر ہم حقیقت میں اعتقاد رکھتے کہ ہماری عمر کے ہر لمحہ کے بدلے میں پوری دنیا سے زیادہ جزاملنے والا ہے ،تو ہم ہرگز اسے مفت میں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے،کیونکہ ہم مال دنیاکو مفت میں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں ۔ اگر ہم سو روپیہ کھو دیں تو پریشانی کے عالم میں ہمارے ہوش اڑ جاتے ہیں حتی ہم نماز پڑھتے وقت بھی انھیں پانے کی فکر میں ہوتے ہیں (عام طور پر بعض لوگ نماز میں اپنی گم شدہ چیزوں کے تصور میں کھوئے رہتے ہیں اور جو چیز بھول گئے ہیں نماز میں وہ انھیں یاد آتی ہے)اگر انسان محنت اور کوشش کے نتیجہ میں کوئی دولت کمائے،تو وہ کبھی حاضر نہیں ہوتا ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ کسی کو بخش دے اور وہ اس کی قدر کو جانتا ہے،کیونکہ اس نے اسے حاصل کرنے

میں کافی محنت کی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ معمولی سے نقصان کا احساس کئے بغیر انسان اپنی عمر کے بہت سے گھنٹوں کو باطل راستہ پر صرف کرے ۔ دوسرے الفاظ میں ممکن ہے انسان مال خرچ کرنے میں بخیل ہو لیکن اپنی عمر کو صرف کرنے میں بخیل نہ ہو، با وجودیکہ مال کی قیمت کا عمر کی قیمت سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پس ہم آخرت اور اخروی ثواب کے بارے میں جو ہماری عمر کے ہر لمحہ کے لئے موجود ہے۔ اس دعوے اور ایمان میں صادق نہیں ہیں، ورنہ اگر ہم سچا ایمان رکھتے، تو اپنی عمر کو بیہودہ طور پر نہ گزارتے، اسے گناہ کی راہ میں صرف کرنے کی بات ہی نہیں۔ حقیقت میں ہماری زندگی ان جھوٹے دعووں کے ساتھ آمیختہ ہے۔ اگر خدا نخواستہ ہماری رفتار اور گفتار میں بھی جھوٹ سرایت کرجائے تو یہ ہمارے لئے بدتر مصیبت ہوگی۔

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون[1]) ''خدا پر ایمان کا ادعویٰ کرنے والے اکثر مشرک ہیں'' شائد خدائے متعال اس آیت کے ذریعہ ہمیں یہ نکتہ سمجھنا چاہتا ہے کہ بہت سے مومنوں کا ایمان شرک کے ساتھ آمیختہ ہے اور خالص نہیں ہے، اگر کسی کا صرف ایک معبود ہوتا اور وہ مشرک نہ ہوتا تو اس کے اندر لالچ، مقام پرستی خلاصہ یہ کہ دنیا پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی ۔ ان رجحانات کا وجود اور باطل سے دل لگی اس بات کی علامت ہے کہ اس کے کئی معبود ہیں نہ کہ ایک معبود: (افأیت من اتخذالھہ ھواہ واضلہ اللہ علی علم وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعداللہ افلاتذکرون[2]) کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے اور خدا نے ایسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اوراس کی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو؟ جی ہاں، جن لوگوں میں نفسانی خواہشات ہیں اور انہوں نے ان نفسانی خواہشات کو اپنا معبود قرار دیا ہے وہ مشرک ہیں ۔ حقیقت میں چونکہ ان کا ایمان نفسانی خواہشات کے ساتھ آلودہ ہے اور خالص نہیں ہے، اس لئے وہ شرک میں آلودہ ہیں، البتہ شرک میں آلودہ ہوئے ایمان سب ایک حد میں نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ۹۹فی صد ایمان ۵فی صد شرک

[1] یوسف/۱۰۶
[2] جاثیہ/۲۳

سے آلودہ ہوتاہے اور کبھی شرک یہاں تک بڑھتا ہے کہ خدا پر ایمان ہی مکمل طور پر نابود ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم گناہ میں آلودہ ہیں۔ لیکن کیا وہ شخص جس نے سالہا سال تک اپنی عمر کو گناہ اور بیہودگیوں میں صرف کیا ہے،فیصلہ کر سکتا ہے کہ گناہ سے پرہیز کرے اور اپنے ایمان و اعتقاد میں صادق ہو جائے اور حقیقت میں وہ صدیق بن سکتا ہے یا نہیں؟یقیناً یہ امر ممکن ہے، حتی ساٹھ سال عمر کے گزرنے کے بعد بھی انسان مصمم ارادہ کرسکتا ہے کہ صدیق بن جائے،اس شرط پر کہ اپنے گذشتہ کے بارے میں توبہ کرے اور مصمم ارادہ کرے کہ اپنی باقی عمر کو خدا کی اطاعت میں گزارے ،اور ایسی رفتار کرے جسے خدا پسند کرتا ہے۔ اس کا سونا ،بیداری، اٹھنا،بیٹھنا، معاشرت کرنا گھر میں برتاؤ اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ سب خدا کے لئے ہو ۔یہ امر ممکن ہے ،لیکن مختصر وقت میں حاصل نہیں ہو سکتا اور مختصر زمانے میں انسان صدیق نہیں بن سکتا ہے۔ ''صدق''ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان میں طولانی اور مسلسل سعی وکوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ۔

جو ساٹھ سال گناہ کرنے کے بعد صدیق بننے کا مصمم ارادہ کرے،اسے اس قدر کوشش کرنی چاہئے کہ ملکۂ ''صدق'' اس معنی میں اس میں پیدا ہو جائے،جسے ہم نے دقیق طور پر بیان کیا ۔ اب ممکن ہے کوئی شخص دو سال تک مسلسل مشق اور ریاضت کے نتیجہ میں وہ ملکہ حاصل کرلے ،اس صورت جب وہ صدیق بن جاتا ہے، تو اس کا مرتبہ اس شخص کے مرتبہ سے دگنا ہے جس نے مقام صدق تک پہنچنے کے لئے ایک سال کوشش کی ہے اور اس کا اجر و ثواب بھی اس سے زیادہ ہو گا ۔ اسی طرح اگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے مزید برسوں تک کوشش کرے تو اس کا مرتبہ بلند تر ہو گا۔ کتنا بہتر ہوتا انسان بالغ ہونے کے وقت سے ہی خدا کا بندہ ہونے کے لئے مصمم ارادہ کرتا !حقیقی معنوں میں خدا کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر قدم نہ رکھتا اور خدا کی فکر کے علاوہ کسی اور فکر کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا حتی گناہ کا خیال تک نہ کرتا ۔

ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ انسان ایک ایسے مقام تک پہنچ جائے کہ حتی گناہ کا تصور بھی نہ کرے ، لیکن ہمارے علماء میں ایسے افراد گزرے ہیں جو اس مقام تک پہنچے تھے۔ نقل کیا گیا ہے کہ مرحوم سید رضی اور سید مرتضی رحمۃاللہ علیہمانماز جماعت پڑھنا

چاہتے تھے ۔ سید مرتضی جو بڑے بھائی تھے اشارتاً سید رضی کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ اس کی عدالت میں کسی قم کا شبہ نہیں ہے اس لئے انھوں نے کہا: ہم میں سے جس نے آج تک گناہ نہیں کیا ہے وہ نماز جماعت کی امامت کرے ۔ وہ اپنے بھائی کو سمجھانا چاہتے تھے کہ انھوں نے بالغ ہونے سے اس وقت تک کوئی گناہ نہیں کیا ہے! سید رضی نے جواب میں کہا: ہم میں سے اس کو نماز جماعت کی امامت کرنی چاہئے جس نے گناہ کا خیال بھی نہیں کیا ہو، یعنی میں نے گناہ کی فکر تک کو بھی ذہن میں جگہ نہیں دی ہے ایک بزرگ شخص نقل کرتا تھا کہ تقریباً ساٹھ سال پہلے، خاندان قاچار کا ایک شخص جو ایک زمانے میں عراق میں ایران کا قونصلر (سفیر) تھا۔ جو بلند قامت تھا اور وقار کے ساتھ راہ چلتا تھا ۔

وہ چلتے وقت اس قدر وقار اور سر بلندی کے ساتھ قدم بڑھاتا تھا کہ بعض اسے متکبر سمجھتے تھے لیکن میں احساس کرتا تھا کہ اس کا ایک اور راز تھا وہ یہ کہ تواضع و انکساری میں اس متانت کا مظاہرہ کرتا تھا ۔ میں اسے نہیں جانتا تھا، یہاں تک اس نے مرتے وقت دو مراجع کو اپنا وصی قرار دینا چاہا۔ اس نے سکرات الموت اور احتضار کی حالت میں ان دو مراجع کے محضر میں کہا تھا: خداوندا! تو شاہد ہے کہ میں نے بالغ ہونے کے دن سے آج تک جان بوجھ کر اور عمداً کوئی گناہ نہیں کیا ہے! جب کہ اس حال میں کہ سب اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ شخص دو مراجع کے محضر میں کہتا ہے کہ بالغ ہونے سے اس وقت تک میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے ۔

وہ بزرگ عالم کہتے تھے: میں نے جب وہ روداد سنی تو مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ میں اس راز اور حقیقت سے آگاہ ہوجاؤں کہ تو میں نے اس کے دعوی کو سچا پایا ۔ شاید وہ بزرگ عالم اس کے باطن کو دیکھ رہے تھے، کیونکہ بعض اولیائے الٰہی افراد کے باطن کے بارے میں خبر رکھتے ہیں۔ ایسا شخص جو جوانی کی ابتدا سے گناہ کا مرتکب نہ ہو اور صرف خدا پر نظر رکھتا ہو فرائض اور تکالیف الٰہی کو انجام دینے کی فکر میں ہو یقیناً وہ صدیقین کے مقام سے دور نہیں رہے گا ۔

آٹھواں درس

ذکر کی اہمیت،تربیت ساز معاشرت اور انتخاب دوست کا معیار

ذکر کی اہمیت ،تربیت ساز معاشرت اور انتخاب دوست کا معیار ''یا اباذر:الذاکر فی الغافلین کالمقاتل فی الفارّین؛یااباذر؛ الجلیس الصالح خیر من الوحدۃ والوحد تخیر من جلیس السوء واملاء الخیر خیر من السکوت و السکوت خیر من املاء الشر''؛''یا ابا ذر: لا تصاحب الا مؤمنا ولا یا کل طعا مک الا تقی ولا تا کل طعام الفاسقین؛ یااباذر؛اطعم طعامک من تحبہ فی اللہ وکل طعام من یحبک فی اللہ عزوجل''

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ابوذرؓ سے نصیحتوں کا یہ حصہ ایک دوسرے سے میل جول اور نشست برخاست سے مربوط ہے،علمائے اخلاق نے اپنی کتابوں میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے اور ان میں کم وبیش اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اخلاق کی نظر میں میل جول اور اجتماعی ہونا بہتر ہے یا تنہائی وگوشہ نشینی؟دوسروں سے میل جول کی اہمیت کے سلسلے میں بعض روایتیں نقل ہوئی ہے کہ من جملہ حضرت محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:امیرالمؤمنین علی علیہ السلام نے احتضار اور جان کنی کے عالم میں،اپنے بیٹوں حسن وحسین علیہما السلام اور محمد حنفیہ نیز اپنے چھوٹے فرزندوں کو اپنے پاس بلاکر انھیں وصیت کی اور وصیت کے آخر میں فرمایا'': میرے فرزندو!لوگوں کے ساتھ ایسی معاشرت کرو کہ اگر تم ان سے دور ہوگئے تو وہ تمھیں دوبارہ دیکھنے کے لئے مشتاق رہیں اور مرجاؤ تو تم پر روئیں[1]''

علمائے اخلاق نے تنہائی اور گوشہ نشینی کے کچھ فوائد بیان کئے ہیں کہ ان کا ذکر لوگوں کے ساتھ میل جول اور نشست وبرخاست کرنا مطلوب دکھایا ہے،اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ معاشرت کے بھی کچھ فوائد بیان کئے ہیں اور گوشہ نشینی کے کچھ نقصانات بھی ذکر کئے ہیں۔گوشہ نشینی کے فوائد:گوشہ نشینی کے درج ذیل فائدے بیان کئے گئے ہیں:الف۔ اجتماعی زندگی سے گوشہ نشینی اختیار کرنا،عبادت کے لئے فراغت پیدا کرنے ،دنیوی واخروی امور میں تفکر کرنے ،خدا کے ساتھ مناجات سے انس پیدا کرنے،

[1] بحارالانوار :ج ۴۲ ، ص ۲۴۷

اسرار الٰہی کو درک کرنے اور خدا متعال کی حیرت انگیز مخلوقات پر غور وخوض کرنے کا سبب ہے اور لوگوں کے ساتھ میل جول انسان کو بلند توفیقات سے محروم کر دیتا ہے بیان کیا گیا ہے کہ:گوشہ نشینی کے اہم تربیتی رول کی وجہ سے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی رسالت کے آغاز پر تنہا کوہ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنے پروردگار سے مناجات میں مشغول ہوتے تھے اور معاشرے سے دوری اختیار فرماتے تھے،یہاں تک آپؐ کے قلب مبارک میں نور نبوت و رسالت روشن ہوا اور اس کے بعد لوگ آپ کو خدائے متعال سے جدا نہ کر سکے۔آپؐ اگر چہ جسم و بدن کے ساتھ لوگوں میں ہوا کرتے تھے،لیکن آپ کا دل خدا کے ساتھ ہوتا تھا اورتنہائی میں خدا کی یاد اورذکر کیاکرتے تھے۔ نبوت و رسالت کی طاقت اور قرب الٰہی پر فائز ہونے کی طاقت کے بغیر انسان لوگوں کے ساتھ ظاہری میل جول اور خداوند متعال سے مخفی توجہ کوآپس میں جمع نہیں کر سکتا ہے۔

ب۔ لوگوں سے کنارہ کشی کرنے سے انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے،خاص کر ان گناہوں سے جو غالباً لوگوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے ہی سرزد ہوتے ہیں،مثال کے طور پر :۱)غیبت۔

۲)ریاکیونکہ انسان لوگوں کے ساتھ معاشرت کی وجہ سے ہی ریا اور نفاق میں مبتلا ہوتاہے وہ اگر لوگوں کے ساتھ نرمی نہ کرے اور انھیں بُرے کاموں اور نامناسب باتوں سے روکنا چاہے تو اسے تکلیف پہنچاتے ہیں ۔ اس کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرے تو ریا میں مبتلا ہوتا ہے ۔

۳)۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں خاموشی،۴۔ پست اخلاق اور ناپسند اعمال سے انسان کی طبیعت اور فطرت کو پاک نہ کرنا جس کی وجہ سے انسان دنیا کی طمع میں مبتلا ہوتاہے ،جو لوگوں سے میل جول کی وجہ سے ہی انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ فطری و طبعی بات ہے کہ جب انسان نے اپنی اصلاح نہ کی ہو اور ایک ایسے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو جہاں پر وہ اپنے نفس کو لگام دے سکے اور اسے لغزشوں سے بچا سکے تو وہ اجتماع میں گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ لوگوں سے گفتگو کرنا اور میل جول بذات خود گناہ

سے آلودہ ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ج)۔ اختلاف اور ٹکراؤ سے بچنا، دین کا تحفظ اور اپنے نفس کو معاشرتی لغزشوں سے روکنا : کیونکہ اجتماعات،تعصبات، عداوت اور دشمنیوں سے خالی نہیں ہیں، اس لحاظ سے جو اجتماعات سے بچتا ہے،وہ ان انحرافات سے حفوظ ہے۔

د)۔ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والے نقصانات سے نجات: کبھی دوسرے لوگ غیبت کرکے انسان کو اذیت و آزار پہنچاتے ہیں اور کبھی بد ظن ہوکے، کبھی تہمت سے اور کبھی ناروا باتوں اور طمع و لالچ سے آزار پہنچاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے جب انسان لوگوں سے دوری اختیار کرتا ہے تو ان امور سے آزاد ہوتا ہے ۔ اگر لوگوں سے میل جول کرے اوران کے ساتھ نشست وبر خاست رکھے اور خود کو ان کے کاموں میں شریک قرار دے ،توحسادت اور دشمنیوں کے شر سے محفوظ نہیں ہے ۔ ہر لمحہ اسے فتنے ضربہ لگانے کے درپے ہیں تاکہ اسے اپنے مقام و منزلت سے گرادیں۔

ھ)۔ گوشہ نشینی اور تنہائی لوگوں کی طرف سے انسان کے لئے طمع نہ کرے اور انسان کی طرف سے لوگوں کے لئے طمع نہ کرنے کا سبب بن جاتاہے ۔ انسان کی آسائش اس میں ہے کہ لوگوں کی طمع اس سے کم ہو جائے،انسان کبھی لوگوں کی رضا مندی حاصل نہیں کر سکتا ہے ،کیونکہ امیدیں اور توقعات حد سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لحاظ سے نفس کی اصلاح کرنا لوگوں کی رضا مندی حاصل کرنے سے بہتر ہے۔

جو انسان دوسروں کے حقوق جیسے لوگوں کے تشیع جنازہ میں شرکت کرنا ، بیماروں کی عیادت اورشادی وغیرہ میں شرکت کرنا اداکرنے کی تلاش میں ہوتاہے،اگران تمام امور کو انجام دینا چاہے اس کا وقت ضائع ہوتا ہے اور دوسرے فرائض انجام دینے سے پیچھے رہتاہے ،اگر ان امور سے بعض کو انجام دے تو بعض دوسرے امور رہ جاتے ہیں،اگر دوسروں کی خواہشات کے مقابلہ میں کوئی عذر پیش کرے تو اس کے عذرکو قبول نہیں کرتے اس لحاظ سے وہ دوسروں کا مقروض رہتاہے اور یہ بذات خود کدورت

اور دشمنی کا سبب بنتا ہے ۔ لیکن جو مکمل طور پر ان امور سے دوری اختیار کر تا ہے، اس کے لئے کم تر مشکلات اور درد سر پیدا ہوتا ہے۔

و)۔ جو تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کر تا ہے، وہ مغرور، ہٹ دھرم اور احمق انسانوں جن کو دیکھنا انسان کیلئے رنجش کا سبب بن جاتاہے کو دیکھنے سے بچتا ہے ۔ اعمش سے پوچھا گیا کہ: تیری آنکھ میں کیوں تکلیف ہوئی ہے؟ اس نے کہا: کیونکہ میں نے مغرور متکبروں پر نگاہ کی۔ اس لئے دنیوی نقطہ نظر سے، احمقوں، متکبروں مغروروں کو دیکھنا انسان کی روح پر بُرا اثر ڈالتاہے اور اخروی جہت سے، جب انسان ان کو دیکھنے سے رنجیدہ ہوتا ہے، تو ان کی غیبت میں تاخیر نہیں کرتا ۔ اس کے علاوہ جب انسان دوسروں کی غیبت، اپنے اوپر تہمت اور دوسروں کے حسد اور چغلخوری سے اذیت و آزار محوس کر تا ہے، تو ان کی تلافی میں کوتاہی نہیں کرتا اور یہ سب انسان کے لئے اس کے دین میں خرابی پیدا کرنے کا سبب بن جاتاہے اور انسان گوشہ نشینی کے ذریعہ ان مصیبتوں سے محفوظ رہ سکتاہے۔

معاشرت اوردوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے فوائد: بہت سے مقاصد اور دینی اور دنیوی ضرورتیں دوسروں کی مدد سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ چیزیں دوسروں کی معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ پس جو کچھ دوسروں سے معاشرت کی بنا پر ہاتھ آتا ہے، وہ گوشہ نشینی اور اختیار کرنے سے ہاتھ سے چلا جاتا ہے اور فطری بات ہے کہ ان منافع کے ہاتھ سے چلا جانا، گوشہ نشینی اور تنہائی کے نقصانات اور آفات ہیں ۔ مذکورہ بیان کے پیش نظر دوسروں سے معاشرت کے چند فوائد کو حسب ذیل عبارت میں ذکر کیا جاسکتا ہے: الف)۔ سیکھنااور دوسروں کو سکھانا (تعلیم و تعلم) جس کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اور یہ بڑی عبادتوں میں سے ہے، جو دوسروں سے معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ گوشی نشینی ور تنہائی اختیار کرنے والا (تعلیم و تعلم) علم کے سیکھنے اور سکھانے اوراس کے نشر و اشاعت سے محروم رہتا ہے۔ یقیناً اگر انسان گوشہ نشینی کی وجہ سے دینی اوردنیوی علوم سیکھنے سے محروم رہا اور اس نے دینی احکام نہ سیکھے تو وہ ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوگا ۔

ب)۔ دوسروں سے فائدہ اٹھانا اور دوسروں کوفائدہ پہنچانا : فطری بات ہے کہ لوگوں سے استفادہ کرنا ،ان کے ساتھ کسب و تجارت اور کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ امر ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ لوگوں سے معاشرت کی جائے اور جو دوسروں سے استفادہ کرنا چاہتاہے، اسے گوشہ نشینی کو ترک کرنا ہوگا اور لوگوں سے روابط اور میل جول بر قرار کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ لیکن اس کی یہ کوشش اور کام خدا کی راہ میں انجام پانا چاہئے۔ لیکن دوسروں کا فائدہ اٹھانا اس معنی میں ہے کہ انسان اپنے مال ،جسم اور فکر سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے اور ان کی ضرورتوں کوپورا کرے ۔ حقیقت میں لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اقدام کرنا ثواب کا کام ہے اور یہ لوگوں سے معاشرت اور میل جول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ جولوگوں کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے اور ان کے مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس نے ایک بڑی فضیلت حاصل کی ہے اور یہ امر گوشہ نشینی سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان گوشہ نشینی میں صرف اپنی انفرادی عبادت جیسے نوافل، مستحبات اور شخصی کام انجام دے سکتا ہے۔

ج)۔ تربیت کرنا اور ادب وتربیت قبول کرنا : ادب و تربیت قبول کرنا یعنی لوگوں کی نامناسب عادات کا علاج اور انھیں بر داشت کرنے کی کوشش کرنا اور لوگوں کے ناشائستہ اخلاق اور ان کی اذیتوں کو بر داشت کرنے کی کوشش کرنا، تاکہ اپنے نفس اور شہوانی خواہشات کو کچل سکے۔ یہ امر صرف لوگوں سے معاشرت اور ان کے ساتھ نشست بر خاست سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ جو تزکیہ نفس اور اصلاح نہ کر سکا وہ حدود شرعی کی رعایت سے اپنی شہوت کو کنٹرول نہیں کر سکتا ہے، تو اس کے لئے لوگوں کے ساتھ تعمیری معاشرت تنہائی اور گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔

دوسروں کی تادیب و تربیت کا معنی یہ ہے کہ انھیں ناپسند کاموں کے بارے میں ڈرایا جائے اور روکا جائے،چونکہ معلم اپنے شاگردوں سے ایسا ہی کرتا ہے ۔گوشہ نشینی اور لوگوں سے معاشرت کے نتائج کا آپس میں موازنہ نہیں کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ لوگوں سے میل جول انسان کے اخلاقی سدھار میں کس قدر بہتر رول ادا کرتا ہے، اس کے بعد بہترین پہلو کو اختیار کرنا چاہئے۔

د)۔ دوسروں سے رفاقت اور انس: یہ امر مجالس میں شرکت اور دوسروں سے معاشرت وانس سے حاصل ہوتا ہے ۔ البتہ

ایسی رفاقت و مجانست سے دوری اختیا ر کرنا چاہئے جو حرام کام میں ملوث ہونے کا سبب ہو،بلکہ انس و دوستی خدا کی مرضی اور احکام شرع کے مطابق ہونی چاہئے۔ انسان کو میل جول کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ لوگوں سے نشست وبر خاست اس کے کمال وعلم کے عروج کا سبب بنے ۔ نہ یہ کہ وقت کے ضائع ہونے اور مادی و معنوی استعدادوں کو کھو دینے کا سبب بنے۔ کیونکہ انسان کے دوست و ساتھی اس کے سعادت و کمال یا شقاوت و بد بختی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس لحاظ سے دوست کو منتخب کرنے میں انتہائی سنجید گی اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں: ''المرء علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من یخا لل[1]'' ''انسان اپنے دوست کے دین پر ہے،پس تم سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ کس سے دوستی کر رہے ہو''

حضرت لقمان علما اور دانشمندوں سے ہم نشینی کی اہمیت کے سلسلہ میں اپنے بیٹے سے کہتے ہیں'' :یابنیّ جالس العلماء فزا حمھم برکبتیک فان القلوب تحی با لحکمۃ کما تحی الارض المیتۃ بوا بل المطر[2]'' میرے بیٹے: علما کی ہمنشینی اختیار کرو اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرو ،بیشک دل حکمت سے اسی طرح زندہ ہوتے ہیں، جس طرح مردہ زمین بارش کے قطروں سے زندہ ہوجاتی ہے۔ سعدی نے عابد و عالم کی ہم نشینی کے فرق کے بارے میں کہا ہے:

صاحب دلی بہ مدرسہ آمد ز خانقاہ

بشکست عہد صحبت اہل طریق را

گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود

تا اختیار کردی ازآن این فریق را

---

[1] بحا ر الا نوار،ج۷۴ ص۱۹۴
[2] بحار الانوار ، ج۱ص۲۰۴

گفت آن گلیم خویش بدر می بر دز موج

وین جہد می کند کہ بگیرد غریق را

(ایک عارف خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں آگیا۔ تاکہ اہل طریقت کی ہم نشینی کے عہد وپیمان کو توڑ دے میں نے اس سے پوچھا کہ عابد اور عالم میں کیا فرق ہے اور تم نے عبادت کو چھوڑ کر علم کے راستہ کو کیوں اپنایا؟ اس نے جواب میں کہا: عابد دریا کی لہروں سے اپنی گلیم کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتاہے اور عالم ڈوبنے والے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔)

ھ)۔ لوگوں سے معاشرت کا فائدہ ،ثواب حاصل کرنا اور دوسروں کو ثواب پہنچانا ہے۔ لوگوں کے مردوں کے تشییع جنازہ میں شرکت کرنے، بیماروں کی عیادت کو جانے، رشتہ داروں اور جانے پہچانے لوگوں کے گھر جانے اور ان کے غم وشادی میں شریک ہونے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔

کیونکہ ان امور کو انجام دینا برادری کے مستحکم ہونے اور مسلمانوں کے دلوں میں مسرت و شادمانی داخل ہونے کا سبب بنتا ہے اور یہ بذات خود فراوان ثواب رکھتا ہے۔ لیکن دوسروں کو ثواب پہنچانے کا معنی یہ ہے کہ،انسان اپنے گھر کے دروازہ کو دوسروں کے لئے کھلا رکھے تاکہ مشکلات اور مصیبتوں میں لوگ آجائیں اور اسے تسلیت و تعزیت پیش کریں اور خوشیوں اور نعمتوں سے بہرہ مند ہونے پر اسے مبارکباد پیش کریں،کہ اس کام سے لوگ ثواب پاتے ہیں۔چنانچہ اگر ایک عالم اپنے گھر کے دروازہ کو دوسروں کے لئے کھلا رکھے،تو یہ اس امر کا سبب بن جاتاہے کہ لوگ اس کی زیارت سے ثواب پائیں۔

و)۔ تواضع و انکساری:دوسروں کے ساتھ معاشرت اور میل جول سے،انسان میں تواضع اور انکساری کی بلند عادت پیدا ہوتی ہے،اور حقیقت میں یہ ایک ایسا بلند مقام ہے جو انسان کو گوشہ نشینی اور تنہائی میں حاصل نہیں ہوتاہے،کیونکہ بعض اوقات بذات خود تکبر گوشہ نشینی کا سبب بنتاہے۔ نقل کیاگیا ہے کہ ایک فلسفی نے حکمت کے موضوع پر تین سو ساٹھ مقالے لکھے تاکہ خدا کے

نزدیک ایک بلند مقام حاصل کرے خدائے متعال نے اس زمانے کے پیغمبر کو وحی کی کہ اس فلسفی سے کہو: تم نے زمین کو نفاق و پریشانی سے بھر دیا ہے، میں تمھاری پریشانی پھیلانے والے کاموں کو پسند نہیں کرتا ہوں ۔ اس کے بعد اس حکیم نے گوشہ نشینی اختیار کی اور لوگوں سے دور ہوگیا اور کہا :شاید اب خدائے متعال مجھ سے خوش ہوگیاہے۔ خداوند متعال نے اپنے پیغمبروں کو وحی کی کہ اس سے کہہ دو :میں تجھ سے خوش نہیں ہوں گا مگر یہ کہ تم لوگوں کے ساتھ معاشرت رکھو اور انکی آزار و اذیت کو برداشت کرو۔ اسکے بعد وہ حکیم لوگوں سے جا ملا اور کوچہ بازار میں ان کے ساتھ معاشرت اور میل جول کرنے لگا ،ان کے ساتھ نشست بر خاست کرتا تھا ،یہاں تک خدائے متعال نے وحی بھیجی: میں تم سے خوش اور راضی ہوا ۔

ز)۔کسب تجارت:لوگوں کے ساتھ معاشرت، ہم نشینی اور ہمراہی سے تجربے حاصل ہوتے ہیں ،چونکہ انسان لوگوں کے حالات، افکار اور اعمال کے بارے میں آگاہ ہوتاہے ۔ ان کی زندگی میں موجودہ کردار اور اتار چڑھاؤسے آگاہ ہونے کے بعد ، صحیح زندگی گزارنے کے لئے توشہ راہ مہیا کرتے ہیں۔یقیناً دینی اور دنیوی مصلحتوں کو سمجھنے کے لئے صرف فطری عقل کافی نہیں ہے اور تجربہ اس کی مدد کرتاہے اسکے مقابلہ میں جو تجربہ سے استفادہ نہ کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کرتاہے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ مذکورہ بیانات کے پیش نظر واضح ہوگیا کہ نہ مکمل طور پر تنہائی اور گوشہ نشینی سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ لوگوں سے معاشرت اور میل جول کو مکمل طور پر مطلوب سمجھا جا سکتا ہے،بلکہ ہر فرد کے حالات وجذبات اور اس کے ہم نشین کے حالات و جذبات اور ان کی دوستی و معاشرت کے محرک کے پیش نظر حکم فرق کرتاہے ۔

مختصر یہ کہ لوگوں سے دوری اختیار کرنا ،عداوت و دشمنی کا سبب بن جاتاہے اور ان سے میل جول میں افراط،بد کرداری کا سبب بن جاتاہے، لہذا انسان کو ہر حالت میں گوشہ نشینی اور لوگوں سے معاشرت کے درمیان اعتدال کی رعایت کی جانی چاہئے۔الفت و برادری ، خداکی ایک مہربانی:بیشک خدائے متعال نے ،کوہ و بیابان ،جنگل و دریاسے لےکر انسان و حیوانات تک جو کچھ خلق کیاہے،ان سب کو نعمت قرار دیا ہے ۔اہل فن کی تعبیر میں، یہ عالم ایک ہم آہنگ نظام کا حامل ہے جس کے اجزا ایک دوسرے

سے مرتبط اور ہم آہنگ ہیں، حقیقت میں عالم پر ایک بہترین نظام حاکم ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر قرار پائی ہے اور تمام مخلوقات ،آپس میں منظم ربط کے پیش نظر ایک دوسرے کو بہرہ مند کرتے ہیں ۔ اس اصول کے مطابق ،خدائے متعال نے انسانوں کی زندگی کے لئے جو مقصد مد نظر رکھا ہے ،جسے انسانی کمال سے تعبیر کیا گیا ہے ، لوگوں کو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے لئے مفید واقع ہونا چاہئے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرنا چاہئے دوسری طرف سے اگرچہ خدائے متعال نے بنیادی طور پر انسان کو ایک دوسرے کے لئے نعمت قرار دیا ہے کہ بہترین نظام کے راستے میں کمال کی طرف قدم بڑھائیں، لیکن چونکہ انسان صاحب اختیار ہے ،اس لئے وہ خدا کی نعمتوں کو شقاوت اور بد بختیوں میں تبدیل کرسکتا ہے ،جیسا کہ خدائے متعال فرماتا ہے:(الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللّٰہ کفراً واحلّوا قومھم دار البوار[1]) ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا ،جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفران نعمت سے تبدیل کردیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کی منزل تک پہنچا دیا''

مذکورہ مطالب کے پیش نظر ،انسان خود کو دوسروں کے لئے نعمت بھی قرار دے سکتا ہے تاکہ دوسرے اس سے استفادہ کرسکیں، اور انکے لئے مشکلات اور بد بختی کا سبب بن سکتا ہے ۔اخوت و، برادری اور معاشرتی زندگی خدائے متعال کی ایسی عظیم نعمتیں ہیں کہ خدائے متعال نے ان پر خاص نظر عنایت کی ہے،یہاں تک کہ فرماتا ہے:(...واذکروانعمۃ اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداء فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا[2]...) ...'اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کردی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے'' پس لوگوں کے درمیان الفت اور برادری کا رابطہ ایک نعمت الٰہی ہے، اس کی قدر کرنی چاہئے اور مزید اس الفت کو مستحکم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے ۔ ایک مسلمان کو ہر حالت میں اپنے مسلمان بھائی کا یار و غمخوار ہونا چاہئے نہ یہ کہ اس کے لئے رنجیدگی کا سبب بنے اور اس پر ظلم کرے ۔ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے

---

[1] ابراہیم،۲۸
[2] آل عمران،۱۰۳

ہیں، ''المسلم اخوا لمسلم ھو عینہ و مرآتہ و دلیلہ لا یخونہ ولا یظلمہ و لا یکذ بہ ولایغتابہ[1]'' ''مسلمان، مسلمان کا بھائی، اس کی آنکھ، آئینہ اور اس کا رہنما ہے وہ اس کے ساتھ خیانت نہیں کرتا ہے اوراس پر ظلم نہیں کرتا ہے اور اس سے جھوٹ نہیں بولتا ہے اور اس کی غیبت نہیں کرتا ہے''، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ سب انسانوں کے ساتھ معاشرت اور ہم نشینی مفید ہے اور اس کے بر عکس یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ تمام انسانوں کے ساتھ معاشرت بالکل مضر ہے اور انسان کوکسی سے میل جول نہیں رکھنا چاہئے، بلکہ ایک معیار مد نظر رکھنا چاہئے، جس کے پیش نظر مطلوب اور تعمیری معاشرتوں کو نا مطلوب اور مضر معاشرتوں سے جدا کر کے پہچانناچاہئے۔

انسان کو جاننا چاہئے کہ کیسے افراد سے معاشرت اس کو الہی اور معنوی مقاصد تک پہنچنے میں مدد کر سکتی ہے ،اسے اپنی معنوی اورروحی تکامل و ترقی کے لئے اور فرائض کو انجام دینے کے لئے کن افراد سے معاشرت کرنی چاہئے یا کن افراد سے معاشرت کرے تاکہ ان پر تعمیری اثر ڈال سکے، کیونکہ دوسروں پر تعمیری اثر ڈالنا بھی انسان کے لئے تکامل و ترقی کا سبب بنتا ہے۔ اگر انسان دوسروں کی خدمت کرنا اپنا فرض قرار دے خواہ خدمت مادی ہو یا معنوی البتہ معنوی مدد کی قدر و قیمت زیادہ ہے اور فرائض کو انجام دینے کیلئے دوسروں کی ہدایت اورانھیں خیر و سعادت کی طرف رہنمائی کرے تووہ خود تکامل و ترقی پاتا ہے کیونکہ فریضہ انجام دے کر اس نے خدا کی عبادت کی ہے جس کے نتیجہ میں وہ پر خود کامل تر ہوا ہے ۔

حقیقت میں اس دنیا میں ہم دوسروں کی جو بھی خدمت انجام دیں،اگر وہ صحیح نیت اور شرعی صورت میں ہو،تو وہ خدمت دراصل خود ہماری طرف پلٹتی ہے، یعنی ہم نے خدائے متعال کی عبادت کی ہے اور اس کا ثواب ہماریطرف پلٹتا ہے۔ پس اگر معاشرت و ہمنشینی سبب ہو کہ انسان دوسروں کے ساتھ نیکی کرے یا دوسروں سے معنوی خیر حاصل کرے اور ان سے معاشرت کر کے ہدف ومقصد کی طرف اچھی طرح متوجہ ہو تو ،اس کے علم اور قلبی توجہات میں اضافہ ہو گا اور وہ اپنی زندگی کے لئے بہتر راستہ کا انتخاب

[1] اصول کافی، ج۲، ص۱۶۶

کرے گا تو یقیناً یہ معاشرت اس کے لئے گراں قیمت ہے۔اس کے مقابل میں،ایسے افراد سے معاشرت کرنا مطلوب نہیں ہے جو نہ صرف انسان کو خدا کی یاد نہیں دلاتے بلکہ اس سے غافل کرتے ہیں اور اپنی گفتار اور عمل سے انحطاط وانحراف کی طرف دعوت دیتے ہیں۔اس لحاظ سے ہر انسان کو اپنا دوست قرار نہیں دینا چاہئے۔دوستی اور رفاقت کے لئے دوست کی بلند اور قابل قدر خصلتیں معیار ہیں،البتہ رفیق اور دوست میں پائی جانے والی عمدہ ممتاز خصلتیں دوسروں کے ساتھ ہم نشینی و مصاحبت سے ان کی طرف مفید اور اچھے پیغامات پہنچتے ہیں۔اگر چہ بعض اوقات دوستی اور رفاقتوں سے دنیوی فوائد، جیسے مال اور مقام سے استفادہ مدنظر ہوتا ہے،لیکن اہم ترین فوائد، دینی فوائد ہیں،جیسے ہم نشین کے علم و عمل سے استفادہ کرنا کسی کی طرف سے خدا کی عبادت و بندگی میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے ایجاد کئے گئے آزار اور مزاحمت سے محفوظ رہنے کی سعی کرنا۔یا اس کے مال سے استفادہ کرے تاکہ اپنے وقت اور عمر کو دنیوی امور میں ضائع کرنے سے محفوظ رکھے اور فرائض الٰہی کو بہتر صورت میں انجام دے۔

دوست کے انتخاب کا معیار: مناسب دوست کے انتخاب میں مشکلات اور نیک وبد دوستوں کے مثبت و منفی اثرات کے پیش نظر اسلامی منابع و مصادر میں دوست بنانے کے معیاروں کے سلسلے میں چند باب مختص کئے گئے ہیں اور اولیائے دین نے مناسب دوست کے اوصاف اور ان کی خصوصیتیں بیان کی ہیں من جملہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ:بہترین ہم نشین کون ہیں؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا"؛من ذکّرکم باللہ رؤیتہ و زادکم فی علمکم منطقہ وذکّرکم بالآخرۃ عملہ[1]""جس کا دیدار تمھیں خدا کی یاد دلائے اور اس کا کلام تمھارے علم میں اضافہ کرے اوراس کا عمل تجھے قیامت کی طرف متوجہ کرے"یا جب حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام سے ان کے اصحاب سوال کرتے ہیں کہ:ہم کس کے ساتھ معاشرت کریں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا":اس شخص سے ہم نشینی اختیار کرو، جس کا دیدار تجھے خدا کی یاد دلائے اوراس کا عمل تجھے آخرت کا مشتاق بنائے اور اس کا علم تمھاری عقل و منطق میں اضافہ کرے۔مزید فرمایا: اہل دنیا سے دوری اختیار کرکے خدا کے نزدیک ہو جاؤ اور گناہگاروں سے

[1] بحار الانوار،ج۷۱،ص۱۸۶

دشمنی کرتے ہوئے، خدا کے دوست بن جاؤ"[1] اور قرآن مجید ایک نقصان اٹھائے ہوئے فرد کی زبانی کہ جس نے راہ حق اور خدا کے پیغمبروں سے انحراف کر کے، خود اور دوسروں پر ظلم کیا ہے، خشم اور غضب الٰہی کی آگ میں پھنس گیا ہے اور بے انتہا پشیمانی و اندوہ کے عالم میں حسرت سے کہہ رہا تھا: (یاویلتیٰ لیتنی لم أتخذ فلانا خلیلالقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاء نی" ہائے افسوس :کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا ۔اس کی دوستی نے مجھے پیروی قرآن اور رسول حق کی اطاعت سے محروم کر دیا اور مجھے گمراہ کر دیا ۔"

اس قسم کی آیتیں،اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کے گمراہ ہونے کے عوامل میں نا مناسب دوست اور گمراہوں کے ساتھ رفاقت ہے،اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ مومن ناسالم افراد اور آلودہ اجتماعات سے پرہیز کرے ۔البتہ تمام افراد یکساں نہیں ہوتے ۔کچھ لوگ ایسے خود ساختہ اور مصمم ارادے کے مالک ہیں کہ ہر شرائط میں دوسروں سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان پر ہی اثر ڈالتے ہیں ،لیکن کچھ لوگ ارادہ میں سستی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے، جس سے بھی میل جول کرتے ہیں انھیں کے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں اور انکے اخلاق اور رفتار سے متاثر ہوتے ہیں ۔اس لئے انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ وہ کس سے معاشرت کرتا ہے اور کون اس پر اثر ڈال رہا ہے جولوگ مضبوط اور قوی دل کے مالک ہیں ،اگرچہ دوسروں سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں نہیں ڈھل سکتے،پھر بھی انھیں دیکھنا چاہئے کہ کس سے بہتر استفادہ کر سکتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ وہ معاشرت میں ترجیحات کو مد نظر رکھیں۔

لہٰذا جن شرائط میں بھی ہم ایسے لوگوں اور ایسی جماعت میں ہوں کہ ان کی معاشرت ہمیں زیادہ سے زیادہ خدا اور آخرت کی یاد دلائے، ہمارے علم میں اضافہ کا باعث ہو،کار خیر کو انجام دینے اور دوسروں کی خدمت کرنے میں ہمارے لئے تشویق کا سبب ہو اور ان کی مدد سے زندگی کے صحیح راستہ پر آرام سے ہم چل سکتے ہیں بڑھا سکیں، تویقیناً ایسی معاشرت مناسب اور تعمیری ہے،

[1] بحار الانور ج۷۱ ص۱۸۹ح۱۸

اگر ایسا نہیں ہے تو معاشرت معکوس اور نا مطلوب ہے ،لہذا مطلق طور پر نہیں کہا جا سکتاہے کہ ہر معاشرت مطلوب ہے اور انسان کو ہر اجتماع میں داخل ہونا چاہئے اور ہر ایک سے معاشرت کرنی چاہئے ،اس بہانہ سے کہ خوش اخلاقی اور خوش رفتاری اچھی ہے، حقیقت میں ایسے تصور سے انسان اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔ ہر کسی کے ساتھ معاشرت انسان کے فائدے میں نہیں ہے ۔ ممکن ہے انسان ابتدا میں پاک نیت سے ایک اجتماع میں داخل ہوجائے اور اس کے بعد اسے معلوم ہوجائے کہ ان کے ساتھ معاشرت اس کے نقصان میں ہے،کیونکہ وہ غیبت کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے ہیں، بیہودہ گفتگو کرتے ہیں اور اسے دنیا پرستی کیطرف دعوت دیتے ہیں۔یا ان کی رفتار ایسی ہے کہ انسان کو دنیا کی طرف کھینچتی ہے اور آخرت سے غافل کرتی ہے اس حالت میں انسان کو نیکی، خوش اخلاقی اور نیک رفتاری کے بہانہ سے اس جماعت کے ساتھ میل جول نہیں کرنا چاہئے،مگر یہ کہ ایسی قدرت اور ہمت رکھتا ہو کہ ان پر اثرانداز ہو ،اگر چہ جانتا ہے کہ انکی رفتار نا پسند ہے ،لیکن مطمئن ہے کہ نصیحت اور موعظہ سے انکی ہدایت کر سکتاہے ۔ایسی معاشرت،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دوسروں کی راہنمائی کے طور پر،جس کو شرع مقدس میں خاص اہمیت دی گئی ہے مطلوب ہو سکتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک روایت میں فرماتے ہیں ''انظروا من تحادثون،فانہ لیس من احد ینزل بہ الموت الا مثل لہ اصحابہ الی اللہ فان کانوا خیارا فخیارا وان کانوا شرارا فشرارا[1]۔'' ''دیکھو کہ کس کے ساتھ بات کر رہے ہو،کیونکہ جب کسی کو موت آتی ہے تو خدا کے حضور اس کے دوست اس کے سامنے مجسم ہوتے ہیں۔اگر وہ نیک ہیں تو وہ بھی نیک افراد کے زمرہ میں قرار پاتا ہے اگر وہ برے ہیں تو وہ بھی بروں کے ساتھ قرار پاتاہے''پس اگر سوال کیا جائے کہ اخلاق اسلامی کی نظر میں معاشرت اور میل جول مطلوب ہے یا گوشہ نشینی جواب میں کہا جاتا ہے:ایسا نہیں ہے کہ معاشرت تمام مواقع پر مطلوب ہے اور گوشہ نشینی اور تنہائی نا مطلوب،بلکہ اس شخص سے دوری اور گوشہ نشینی اختیار کرنا بہت بجا اور لازم ہے جو انسان کو گناہ کے انجام دینے پر اکساتا

[1] اصول کافی،ج۴ص۴۵

ہے اور اسے صحیح راہ سے منحرف کرتا ہے اور اس کے ایمان کو کمزورکر کے اسے شک و شبہ میں ڈالتاہے۔اس کے مقابلہ میں ،معاشرت کو ترک کر کے گو شہ نشینی اختیار کر نا انسان کو اجتماعی مسائل اور خدا کی طرف سے اجتماعی زندگی کے سایہ میں قرار دی گئی نعمتوں سے محروم کر تا ہے اور اسے دوسروں کے متعلق انجام دینے والے فرائض سے روکتا ہے ۔ حقیقت میں گو شہ نشینی کا منفی اثر یہ ہے کہ بہت سے واجبات اور تکالیف کو ترک کرنے کا سبب ہے انسان اجتماعی زندگی کے سائے میں حاصل ہونے والے علم ودانش اور کمالات سے محروم ہو جاتا ہے ۔ صحیح و سالم اخلاقی طریقہ کار اور آداب اور دوسروں کی مادی اور معنوی مدد جو اس کے لئے دنیا و آخرت میں مفید ہے سے بھی محروم ہو جاتاہے ۔اگر سب لوگ گوشہ نشینی اختیار کریں اور دوسروں سے معاشرت نہ کریں،تو اسلام کے اجتماعی احکام معطل اور ترک ہوجائیں گے۔ اس لئے گوشہ نشینی اور دوسروں سے معاشرت،دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مطلوب اور پسندیدہ ہے ۔

خود بخود تنہائی میں بسر کر نا اچھا اور مطلوب نہیں ہے،مگر یہ کہ یہ کام ایک عبادت کو ریا سے بچانے کے لئے ہو اور روزانہ کی مشکلات اور لوگوں سے معاشرت اس میں رکاوٹ بنے،تو اس صورت میں عبادت کو تنہائی اور رات میں انجام دینا چاہئے،کیونکہ شب خدا کی عبادت اور مناجات الٰہی کے لئے مناسب ہے،تاکہ انسان روز مرہ کی فعالیتوں سے فارغ ہو کر اپنے بارے میں فکر کرے اور اپنے دل کو خدا کی مناجات سے جلا بخشے۔خدا ئے متعال فرماتا ہے:(ان نا شءۃ الیل ھی اشد و طأ واقوم قیلا ان لک فی النھار سبحاَ طویلا[1]) ''بیشک رات کا اٹھنا (نماز شب کے لئے)نفس کی پامالی کے لئے بہترین ذریعہ اور ذکر کا بہترین وقت ہے ۔یقیناآپ کے لئے دن میں بہت سی مصروفیت ہیں''انسان کو دن میں تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے ایک گوشے میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول نہیں ہونا چاہئے،بلکہ اسے لوگوں کے اجتماعات میں داخل ہونا چاہئے اور ان کے ساتھ فرائض انجام دینا چاہئے لوگوں کے اجتماعات میں شرکت کئے بغیر اور لوگوں سے میل جول رکھے بغیر صرف ایک کمرے یا مسجد میں بیٹھ کر تعلیم و تعلم اور وعظ و نصیحت کا فریضہ انجام

[1] مزمل ،۶و۷

نہیں دیا جا سکتاہے اور نہ محتاجوں اور فقرا کی مدد کی جا سکتی ہے اور نہ خیر کی دعوت دی جا سکتی ہے اور نہ انسان دیگر ایسے اجتماعی فرائض کو انجام دے سکتا ہے کہ جو اس پر نجام دینا ضروری ہیں۔ انسان کے سیاسی پہلوؤں میں فرائض کوانجام دینے کی بات ہی نہیں جو اس سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پردوسرے ممالک میں زندگی گزارنے والے دنیا کے مسلمانوں کی مدد کے طور پرانجام دینے چاہیئے۔دوسری طرف سے انسان کو یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ چونکہ یہ برکتیں اور نیکیاں اجتماع میں پائی جاتی ہیں،لہذا ہر اجتماع اورہرایک سے ہر حالت میں معاشرت مطلوب ہے،یہ بذات خود انسان کی لغزش اور انحراف کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا انسان کو الہی مصلحتوں اور معاشرت کے شرعی پہلوؤں کی رعایت کی کوشش کرنی چاہئے،تاکہ اپنے اصلی مقصد یعنی سعادت تک پہنچنے سے پیچھے نہ رہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام صالح نامی اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں ''؛اتبع من یبکیک وھولک ناصح ولا تتبع من یضحکک وھولک غاش وستردون علی اللہ جمیعا فتعلمون[1]'' ''اس کی پیروی کرو جو تجھے رلائے اور تیری نصحت کرے ،اور اس کی پیروی نہ کرو جو تجھے ہنسائے اور دھوکہ دے تم جلدی ہی خداکے پاس پہنچ جاؤ گے اور اپنے کردار سے آگاہ ہو جاؤ گے۔ ''غافلوں کے اجتماع میں ذکر خداکی عظمت؛اگر انسان ناخواستہ طور پر غافلوں کے اجتماع میں پھنس جائے،جو نہ خدا کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں اور نہ قیامت کا ،تواس سے کیا کرنا چاہیئے تاکہ وہ گناہ میں آلودہ نہ ہو ۔اگر وہ اس اجتماع سے باہر نکلنا چاہے تو وہ مناسب رد عمل نہیں دکھائیں گے بلکہ ممکن ہے وہ تصور کریں کہ شخص اپنے آپ کو دوسروں سے منزہ اوربر تر جانتا ہے ۔اسلامی آداب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نہ دل میں اپنے کو دوسروں سے برتر تصور کرے اور نہ اس کا عمل ایسا ہونا چاہئے جس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،جناب ابوذرؓ کو اپنی ایک نصیحت میں جس پراس سے پہلے بحث ہوئی فرماتے ہیں:انسان تب تک مکمل فقہ تک نہیں پہنچتا،جب تک لوگوں کو خدا کی عظمت کے سامنے درک و فہم سے فاقد اونٹوں کے مانند نہ دیکھے،اس کے بعد

[1] اصول کافی، ج۴ ص۴۵۱

اپنے آپ پر نظر ڈال کر خودکو ان سے پست نہ سمجھے۔ حتی انسان اپنے آپ کو ایک فاسق سے بھی برتر نہ جانے، ممکن ہے وہ فاسق تو بہ کر چکا ہوگا اور اس کے گناہ بخش دئے گئے ہوں ،جبکہ وہ مومن اپنی عبادت پر ناز کرتے ہوئے غرور و تکبر میں مبتلا ہوگیا ہو جو اس کی ہلاکت کا سبب ہو،لہذا بعض اوقات ایسے شرائط پیش آتے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک جماعت سے جدا نہ کرے تاکہ وہ منفی رد عمل نہ دکھائیں اور اس پر بد گمانی نہ کریں۔اس کے علاوہ بعض اوقات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک سماج اور معاشرے کے اندر انجام دینا چاہئے جو گناہ اور معصیت میں مشغول ہوں ،تاکہ ان کو گناہ سے ڈرائے،ان کے درمیان رہنا نہی از منکر کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے ،یعنی ممکن ہے ایک جماعت اہل خیرو نیک راستہ پر نہیں ہے اور غافل ہے اور بیہودہ باتیں کرتی ہے لیکن کسی معصیت و حرام کی مرتکب نہیں ہوتی ہے کہ اسے ڈرانا واجب ہو،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم ایسی جماعت کے بارے میں فرماتے ہیں'' :یا ابا ذر' الذاکر فی الغافلین کا لمقاتل فی الفارین' 'اے ابو ذر:جو غافلوں کے درمیان خدا کو یاد کرے ،اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو جنگ سے فرار کرنے والوں میں جہاد کو جاری رکھے۔

جبکہ غافلوں کے اجتماع میں موجود انسان ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا ہے، وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے دل میں خدا کی یاد کو تقویت بخشے تاکہ وہ اس شخص کے جیسا ہو کہ جب دوسرے میدان جنگ سے فرار کرتے ہیں تو وہ تن تنہا دشمن کے مقابلہ میں مبارزہ کرتا ہے اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ خدائے متعال ایسے شخص کے بارے میں اپنے فرشتوں پر فخر و مباہات کرتا ہے جو دوسروں کے جنگ سے بھاگنے کے باوجود تن تنہا جہاد کو جاری رکھتا ہے ۔اسی طرح خدائے متعال اس شخص پر بھی فخر کرتا ہے جوایک ایسے معاشرے میں ہو جو خدا سے غافل ہیں اور دنیا کے پست امور کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ایسے کام انجام دیتے ہیں جو خداپسند نہیں کرتا لیکن وہ مومن اپنے دل میں خدائے متعال کی طرف توجہ رکھتاہے، تو خدائے متعال اس پر فخر ومباہات کرتاہے۔
گفتگو کرنے کے بارے میں انسان کی ذمہ داری:اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' :یا اباذر!ا لجلیس الصالح خیر من الوحدۃ،والوحدۃ خیر من جلیس السوء و املاء الخیر خیر من السکوت و السکوت خیر من املاء الشر '' 'اے ابو ذر !:نیک

انسان سے ہم نشینی تنہائی سے بہتر ہے اور تنہائی برے کی ہم نشینی سے بہتر ہے اور نیک گفتگو خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بُرے کلام سے بہتر ہے''فطری بات ہے کہ جب انسان دوسروں سے میل جول رکھتا ہے تو گفتگو کرنے کے امکانات فراہم ہوتے ہیں،کیا اس حالت میں بات کرنا بہتر ہے یا خاموشی؟چنانچہ ہم نے معاشرت اور گوشہ نشینی کے اصولوں کی بحث میں کہا کہ اس کے معیار متفاوت ہیں کبھی معاشرت مطلوب ہے تو کبھی گوشہ نشینی۔اسی طرح بات کرنے اور خاموشی اختیار کرنے کے بارے میں بھی کوئی ثابت اور معین معیار نہیں ہے،دیکھنا چاہئے کہ بات کس غرض سے کہی جاتی ہے۔

بات کرنا اس وقت مطلوب اور اچھا ہے کہ خدا کیلئے اور دوسروں کے فائدے کے لئے کہی جائے اور خدا کی توجہ اور احکام و مسائل الٰہی بیان کرنے کی غرض سے ہو،بہر صورت نیک بات،وہ ہے جو ہدایت اور دوسروں کو مطلوب کمال کی طرف رجحان پیدا کرنے کی غرض سے کی جائے،خواہ وہ بات معنوی او راخروی تکامل و ترقی سے براہ راست مربوط ہو یا تکامل معنوی اور سعادت اخروی کے لئے ایک مقدمہ ہو،اگر چہ دنیوی امور سے ہی مربوط ہو۔بات کرنے والے کا مقصد یہ ہے کہ مخاطب کو مادی وسائل کے ذریعہ آگاہ کر کے کمال و ترقی تک پہنچنے کے راستہ کو ہموار کرے،کیونکہ انسانیت اور کمال کے راستہ میں مادی وسائل سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔لیکن جب اپنی بات سے انسان نہ خود استفادہ کر سکتا ہو اور نہ دوسرے تو اس حالت میں خاموشی بہتر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ روایتوں میں((املاء))کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ((تکلم))یعنی بات کرنا۔اس تعبیر میں ایک عنایت ہے:عربی اور فارسی میں((املاء))اس معنی میں ہے کہ کوئی کسی چیز کو کہے اور دوسرا اسے لکھے،ہر بات جو انسان بولتا ہے وہ املاء نہیں ہے،کیونکہ وہ ہمیشہ اس لئے نہیں بولتا ہے کہ دوسرے اسے لکھیں،پس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں نہیں یہ فرمایا:خیر کے متعلق گفتگو خاموشی سے بہتر ہے اور خاموشی بُری بات سے بہتر ہے؟''املاء''کی تعبیر استعمال کرنے کے لئے دو نکتے بیان کئے جا سکتے ہیں:پہلا نکتہ:جب انسان بات کرتا ہے،تو اس کی بات سننے والے کے ذہن میں محفوظ ہوجاتی ہے اور اسکے ذہن کے حافظہ میں واقع ہوتی ہے پس دیکھنا چاہئے کہ کونسی بات سننے والے کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہے اور اسکے ذہن پر کونسا

اثرڈالتی ہے،اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ بات کرنا صرف یہ نہیں کہ منہ سے کوئی آواز نکلے ،بلکہاس بات کا کوئی نہ کوئی اثر ہوتا ہے،گویا جب انسان بات کرتاہے تو دوسرے اسے لکھتے ہیں۔پس انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ وہ دوسروں کی روح پر کونسا اثر ڈالتاہے اور سننے والے کے ذہن اوردل کی تختی پر کونسی چیز نقش ہوتی ہے،اگر وہ بات نیک ہے تواس کا بولنا مناسب ہے اور وہ اپنا اچھا اثرڈالتی ہے،لیکن اگر بات نیک نہیں ہے ،توکیوں انسان اس امر کا سبب بنے کہ نا مناسب بات کااثر دوسروں کے ذہن میں باقی رہے؟

دوسرا نکتہ: جو کچھ انسان کہتاہے ،اس کے لکھنے کے لئے دوفرشتے مامور ہیں،اس لحاظ سے انسان کی بات ((املاء)) کہی جاتی ہے،جیسے خدائے متعال فرماتا ہے:(ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید[1]) اور کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی ہے مگر یہ کہ ایک نگہبان اس کے پاس موجود رہتا ہے۔ایک اور جگہ پر خدائے متعال فرماتاہے: (وان علیکم لحا فظین، کرا ما کا تبین یعلمون ما تفعلون[2]) ''اور یقیناًتمہارے سروں پر نگہبان مقرر ہیں.جو با عزت لکھنے والے ہیں.وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتے ہیں''مومن کے ساتھ کھانا کھانے کے محاسن اور فاسق کے ساتھ کھانا کھانے سے پر ہیز:حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':یا اباذر ؛لا تصاحب الا مؤمنا ولا یا کل طعامک الا تقی ولا تا کل طعام الفاسقین''''اے ابو ذر!با ایمان افراد کے علاوہ کسی سے ہم نشینی نہ کرو ،تمھارا کھانا پرہیز گار کے علاوہ کوئی نہ کھائے اور تم بھی فاسق لوگوں کا کھانا نہ کھاؤ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روایت کے اس حصہ میں سب سے پہلے معاشرت کے مسئلہ کو پیش کیاہے اور اس کے بعد اس سے مربوط بعض مسائل کی طرف اشارہ فرمایا ہے،ان مسائل اور معاشرت کے آثار میںآپس کی گفتگو تھی،اب دوسروں کے ساتھ غذا کھانے کے مسئلہ کو بیان فرماتے ہیں۔کیونکہ دوسروں سے معاشرت کے نتیجہ میں بعض اوقات انسان مجبور ہوتاہے تاکہ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کھانا کھائے۔آپؐ فرماتے ہیں کہ مومن کے علاوہ کسی کی ہمنشینی اختیار نہ کرو اور ہر ایک کا کھانا نہ کھاؤ اور ہر کسی کو اپنا مہمان نہ بناؤ اور

---

[1] ق،١٨
[2] انفطار،١٠-١٢

صرف مومن کے ساتھ کھانا کھاؤ ۔فاسق کی غذا کھانے کا پہلا نتیجہ اس کا احسان مند ہونا ہے اور جب انسان فاسق کا مہان ہوتا ہے اور اس کا کھانا کھاتا ہے تو وہ فاسق بھی اس سے توقع رکھتاہے اگر وہ غیر شرعی چیز کی درخواست کرے اور توقع و امید رکھے کہ فلاں حکم پر دستخط کرے،فلاں ناحق اور غیر شرعی سفارش کو انجام دے اور بعض اوقات انسان اس کی خواہشات کو پورا کرنے پر مجبور ہوجا تاہے اس کے بر خلاف اگر انسان فاسقوں کے ساتھ معاشرت نہ کرے اور ان کا کھا نا نہ کھائے تو ان کا احسان مند نہیں ہوگا اوروہ اس سے کوئی امید بھی نہیں رکھے گا ۔اگر اس سے کسی نا حق چیز کی درخواست بھی کرے تو وہ پوری جرأت کے ساتھ اس سے مسترد کردے گا،کیونکہ اس درخواست کو منظور کرنا وہ اپنے فرائض کے حدود میں نہیں جانتا ہے ۔

دوسری طرف سے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ فاسق کی غذا حلال ہے کیوں کہ ،وہ تو اسلام کے احکام کا پابند نہیں ہے،معلوم نہیں ہے اس نے مال کہاں سے حاصل کیا ہے،معلوم نہیں وہ اپنے مال میں خمس وزکواۃ کا پابندہے کہ نہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس نے یہ مال رشوت کے ذریعہ حاصل کیاہے یا کسی اور ذرائع سے ۔انسان مومن پر تواعتماد کر سکتاہے کہ اس سے اپنے مال کو حلال راہ سے حاصل کیا ہو گا ،لیکن فاسق پراعتماد نہیں کیا جاسکتاہے،ممکن ہے انسان اسکی غذا کھائے اور بعد میں معلوم ہو کہ اس کا مال حلال نہیں تھا ۔

مذکورہ مطالب کے علاوہ بعض روایتوں سے یہ بھی استفادہ کیاجاسکتاہے کہ مشکوک غذا انسان کی روح پر اثر کرتی ہے اور اس کا طبیعی اثر ہوتاہے ،اگر انسان بے خبری میں بھی مشکوک غذا کو کھائے تو اس غذا کے طبعی اثرات مرتب ہوں گے اس سلسلہ میں بعض بزرگوں سے عجیب و غریب داستانیں نقل ہوئی ہیں:ایک بزرگ سے نقل ہے کہ انھوں نے اپنے بیوی سے کہا تھا :میں احساس کر رہاہوں کہ مردار حیوان کا گوشت کھا رہاہوں!ان کی بیوی تعجب کرتی تھی کہ اسکا شوہر یہ کیا باتیں کررہاہے لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ پانی کے مخصوص برتن میں ایک جانور (گزشتہ زمانے میں نجف اشرف میں پانی رکھنے کا ایک مخصوص ظرف ہوتا تھا)پڑا تھا اور وہ اسی نجس پانی کو پیتے تھے!اور وہ بزرگ عالم اس نجس پانی کے طبیعی اثرکو محوس کر رہے تھے ۔

بعض بزرگوں کے حالات میں پا یا جاتا تھا کہ وہ ہر ایک کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے اور ہر جگہ نہیں جاتے تھے اور ہر غذا کو نہیں کھاتے تھے۔ کربلائی کاظم نامی ایک شخص کی ایک معروف داستان ہے کہ وہ خدا کی خاص عنایت سے معجزانہ طور پر حافظ قرآن ہوئے تھے ۔ طلبگی کے ابتدائی دنوں میں جب ہم مدرسۂ حجتیہ میں سکونت پذیر تھے، وہ ہمارے مدرسے میں آئے تھے اور طلاب ان سے امتحان لیتے تھے کہ واقعا وہ حافظ قرآن مجید ہیں یا نہیں. وہ ایک عجیب قسم کے حافظ تھے، یہاں تک قرآن مجید کی آیات کو بر عکس آخر سے اول تک پڑھتے تھے اور قرآن مجید کے نقطوں کی تعداد کو بھی جانتے تھے.۔ وہ ہر ایک کے گھر نہیں جاتے تھے۔ بعض لوگوں کی دعوت کو قبول کرتے تھے اور بعض کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے ۔ انھوں نے کہا تھا: جب بعض دعوتوں پر جاتا ہوں، اس کے بعد دل میں کدورت اور تاریکی کا احساس کرتا ہوں اور اس دعوت سے پہلے جن انوار کو دیکھتا تھا، اب انھیں نہیں دیکھتا ہوں (یقیناً یہ مذکورہ باتیں ہمارا ادراک ہے، لیکن یہ حقیقت ہے)

مرحوم آیت اللہ حاج آقا مرتضی حائری رضوان اللہ تعالے علیہ نے نقل کیا ہے: میں نے کتاب جواہر کربلائی کاظم کے سامنے رکھی، چونکہ وہ ان پڑھ تھے اس لئے نہیں پڑھ سکتے تھے اور ''الف'' کو ''ب'' سے تشخیص نہیں دے سکتے تھے ۔

لیکن قرآن مجید کی آیتوں پر انگلی رکھ کر کہتے تھے: یہ قرآن مجید کی آیت ہے! آقا حائری نے ان سے کہا تھا: تم تو ان پڑھ ہو، قرآن مجید کی آیت کو کیسے تشخیص دیتے ہو؟ اس نے کہا: یہ آیتیں نورانی ہیں اور میں انھیں نور سے تشخیص دیتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں! جی ہاں ایسی حقیقتیں موجود ہیں ،چونکہ ہم درک نہیں کرتے ہیں، ہمیں انکار نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسے لوگوں سے معاشرت کریں، ایسے لوگوں کے ہمراہ کھانا کھائیں، ایسے لوگوں کے مال سے استفادہ کریں اور ایسے افراد کا تحفہ قبول کریں جو اہل ایمان و تقوی ہوں۔ اسی طرح جب خدائے متعال کسی کو کوئی مال عطا کرے، تو اسے کوشش کرنی چاہئے کہ اس نعمت سے بنحو احسن استفادہ کرے۔ اگر اس مال سے کھانا تیار کرے تو ایسے افراد کو کھلائیجو با ایمان و با تقوی ہوں تاکہ اس کا عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ قرار پائے اس کے علاوہ اس کی دعوت اور اسکا کھانا کھلانا ان دونوں کے درمیان رابطۂ الٰہی کے بر قرار ہونے کا سبب ہو نہ یہ کہ وہ

دعوت پست مادی ہوس رانیوں کے لئے ہو ''یا اباذر: اطعم طعامک من تحبہ فی اللہ و کل طعام من یحبک فی اللہ عزو جل ''''اے ابو ذر!اپنی غذا اس کو کھلاؤ کہ جسے خدا کی راہ میں دوست رکھتے ہو تم بھی اس کا کھانا کھاؤ جو تجھے خدا کی راہ میں دوست رکھتا ہے''انسان کو اپنی غذا اس کو دینی چاہئے اور اسکی غذا کھانی چاہئے جس کے ساتھ دوستی اور مودت کا رابطہ بر قرار ہو اور وہ دوستی الہی اصولوں پر مبنی ہو۔جب کوئی کسی انسان کو غذا دیتاہے،معلوم ہے کہ وہ اسے دوست رکھتاہے،لیکن دیکھنا چاہئے کہ اسے خدا کے لئے دوست رکھتا ہے یا دوسرے مقاصد کے لئے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرماتے ہیں کہ دعوت پر جانا اور دعوت کرنا خدا کے لئے ہو تا کہ خدا کی نعمتوں سے پورا پورا استفادہ کیا جا سکے اور خدا کے مومن بندوں کے درمیان الہی رابطہ مستحکم ہو ۔کیونکہ ایک دوسرے کو کھانا کھلانے سے مومن بندوں کے درمیان محبت مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے اور الہی محبت سے مومن بندے نشوونما پاتے ہیں،اس کے مقابلہ میں اگر محبت غیر الہی اور شیطانی ہو تو اس کا اثر انسان کے لئے انحطاط و پستی کا سبب ہے۔

احکام ظاہری حلال و حرام کی سفارش کے علاوہ ۔۔جو ضروری فقہی احکام ہیں۔ او لیائے الہی بعض دوسرے سنجیدہ اور ظریف مسائل کی رعایت کرنے کی بھی تاکید کرتے تھے ۔کیونکہ صرف واجبات انجام دینا اور محرمات کو ترک کرنا انسان کے تکامل و ترقی اور نشوونما کے لئے کافی نہیں ہے اور ان فرائض کو انجام دینا جو ابھی ابتدائی قدم ہے (کہ البتہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسی ابتدائی مرحلہ میں رک گئے ہیں) مومن کی ہمت بلند ہونی چاہئے اور وہ یہ خیال نہ کرے کہ واجبات ومحرمات الہی کی رعایت سے انتہائی مقصد تک پہنچ سکتاہے،بلکہ اسے جاننا چاہئے کہ دوسراقدم آداب شرعی اور مستحبات کی رعایت کرنا ہے،ان میں سے بعض من جملہ آداب معاشرت،آداب گفتگو،کھانا کھانااور حسن اخلاق کی طرف اشارہ کیا گیاہے ۔دوسرے مستحبات کی رعایت اور مشکوک چیزوں سے پرہیز نیز دوسرے شرعی آداب وغیرہ ۔اس مرحلہ کو طے کرنے اور دوسرا قدم اٹھانے کے بعد ،بھی انسان کو تکامل وترقی تک پہنچنے کے لئے ایک طولانی راستہ طے کرناہے اسے اپنی قلبی رجحانات کی تحقیق کرنی چاہئے اور دیکھ لے کہ اس کا دل کس

چیز کی طرف مائل ہے۔ اس کے رفتاری مقاصد کیا ہیں ؟ حتی اگر وہ ایک نیک یا مستحب کام انجام دیتا ہے ،اسے بھی دیکھ لے کہ کیا غرض رکھتا ہے ۔ بالآخر دل اور نفس کی تحقیق اور جانچ کرنا انسان کے تکامل و ترقی کے مراحل میں سے ہے،ہم جو ابھی اپنے ظاہری اعمال کی تصحیح و تطہیر نہیں کر چکے ہیں ،ابھی اس مرحلہ تک نہیں پہنچے ہیں ۔

اس کا انتہائی اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ اولیائے الٰہی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی توجہ صرف خدائے متعال پر متمرکز ہو ، ان کے دل خدا کی محبت کے مظہر بن جائیں ،ان کی امیدیں صرف خدا سے ہو ،اور اسی سے ڈریں نہ غیر خدا سے.وہ ایسی زندگی گزاریں کہ گویا اس دنیا میں خدا کے علاوہ کسی سے سروکار نہیں رکھتے ہیں جبکہ اسی حالت میں سب کے ساتھ معاشرت کرتے ہیں اور دوسروں سے گفتگو کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں ،انکے دل خدا سے اس طرح لو لگائے ہیں کہ گویا خدا کے سوا کسی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ہیں ۔ حدیث معراج میں، جوار اور قرب الٰہی میں پہنچے ہوئے مومن کی روح کی زبانی خدائے متعال فرماتا ہے ’’ :ثم یقال لھا :کیف ترکت الدنیا ؟فتقول :الٰھی وعزتک وجلالک لا علم لی بالدنیا ۔انا منذ خلقتنی خائفه منک[1] ‘‘اس مومن کی روح سے کہا جاتا ہے ،تم نے کیسے دنیا کو ترک کیا ؟ وہ جواب میں کہتی ہے: خداوندا !تیری عزت وجلال کی قسم کہ میں دنیا کے بارے میں علم و آگاہی نہیں رکھتی ہوں جس دن تونے مجھے پیدا کیا اس دن سے تیرے مقام سے خائف ہوں ۔ وہ مومن دنیا کی کوئی خبر نہیں رکھتا ہے، کیونکہ اس کی توجہ صرف خدا کی طرف ہے اور جو امور خدا سے مربوط نہ ہوں وہ ان سے بے خبر ہے ۔ دنیا کے گوشہ وکنار میں خدائے متعال ایسے بندے رکھتا ہے ۔ اگر ہم بھی ہمت کریں ،اپنے ارادہ کو مستحکم کریں، اپنے نفس کی اصلاح کریں اور اپنے آپ کو طاہر قرار دیں، تو ہم بھی اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں ۔ ہمیں اپنے انجام دیئے گئے کاموں پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور ظاہر کو نہیں دیکھنا چاہئے کوشش کرنا چاہئے اپنی روح اور دل پر نگاہ رکھیں ۔

---

[1] بحار لانوار، ج ۷۷ ، ص ۲۷

نواں درس

زبان،وسیلہ ہدایت یاوسیلہ گمراہی

زبان،وسیلہ ہدایت یاوسیلہ گمراہی

''یا اَباذَرّ؛ ان اللہ عزّوجل عند لسان کل قائل فلیتق اللہ امرء ولیعلم ما یقول.یا اباذر؛ اترک فضول الکلام و حسبک من الکلام ما تبلغ بہ حاجتک یا اباذر؛ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما یسمع.یا اباذر؛ ما من شیء احق بطول السجن من اللسان''رسول خدا صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث شریف کا یہ حصہ زبان اور اس کے کنٹرول کے بارے میں ہے۔ البتہ گزشتہ درس میں بھی زبان کے کنٹرول کی ضرورت کے بارے میں تھوڑی سی بحث ہوئی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے یہ بیانات اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی گفتگو میں بیشتر احتیاط کرے۔

اس امر کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری احادیث کی کتابوں میں بات کرنے کے طریقہ اور بولنے کے آداب اور اس کی آفتوں کی بارے میں کئی باب مخصوص کئے گئے ہیں۔اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ کونسی بات کرنا ضروری ہےاو رکونسی بات ناپسندید ہے کہ جس کو بولنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصیحتوں کے سلسلہ میں ہم اس مرحلہ تک پہنچے ہیں،اس لئے ہم اسی مناسبت سے اس موضوع کی وضاحت کرتے ہیں۔

پہلے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زبان، خدا کی نعمتوں میں سے ایک قیمتی نعمت ہے،اس کے بعد زبا ن کی بعض آفتوں اور نقصانات کی طرف اشارہ کریں گے.ترقی و بالیدگی کے لئے زبان اور دیگراعضاء و جوارح سے استفادہ: خدائے متعال نے جن تمام نعمتوں کو انسان کے وجود میں قرار دیا ہے خواہ وہ اس کے ظاہری اعضاء و جوارح ہوں، جیسے:آنکھ، کان،ہاتھ پاؤں وغیرہ خواہ اس کے داخلی اعضاء ہوں خواہ انسان کی غیر مادی خصوصیات کہ جو روحانی پہلو رکھتے ہیں، جیسے تفکر و تخیّل کی صلاحیت کہ جو دماغ سے

مربوط ہے اور انسان کے روحی جذبات، مختصر جو کچھ انسان کے بدن اور روح سے مربوط ہے یہ تمام کی تمام چیزیں انسان کے تکامل و ترقی کے لئے وسائل ہیں نہ کہ مقصد اور نہ ہی ان کی چاہت اور ان کا ماحصل انسان کا آخری مقصد ہے، چیزوں کو ہمیں اس نگاہ سے دیکھنا چاہئے جو انسان کے کمال اور اخروی ثواب کا سبب بنے، اس طرح دوسرے تمام اعضاء، من جملہ زبان۔ انسان کو ایسی بات کرنی چاہئے جو اس کی بلندی اور خدائے متعال کی خوشنودی کا سبب بنے۔ خدا کی تمام نعمتوں کو، خدا کا تقرب حاصل کرنے اور کمال تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دینا چاہئے اور یہ نعمتیں تماشا نہیں ہیں کہ انسان ہر نیت وغرض سے ان کا استعمال کرے۔ انھیں زبان جیسےعضو سے حاصل ہونے والی خواہشات اور نتائج کو اپنا اصلی مقصد نہیں سمجھنا چاہئیکیونکہ اس کا اصلی مقصد ان چیزوں سے بلند تر ہے اور انسان کا بات کرنا اصل مقصد نہیں ہے۔ اس لحاظ سے زبان کو خیر کمال کی راہ میں استعمال کرنا چاہئے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں ''زکاۃ اللسان النصح للمسلمین و التیقظ للغافلین و کثرۃ التسبیح و الذکر[1]'' ''زبان کی زکوۃ مسلمانوں کو نصیحت اور غافلوں کو بیدا رکرنا اور فراوان تسبیح و ذکر ہے۔''

بات کرنا وسیلہ ہے او رچونکہ خدائے متعال نے انسان کی خلقت کا مقصد کمال اور اپنا تقرب قرار دیا ہے، لہذا اس نیک مقصد تک پہنچنے کے لئے زبان سے فائدہ اٹھا نا چاہئے، نہ کہ اس کے ذریعہ اپنے لئے بد بختی کے وسائل فراہم کئے جائیں۔ سوچ اور سمجھ کے بات کرنی چاہئے اور بیہودہ باتوں سے و انسان کی اجتماعی و معنوی منزلت کے انحطاط کا باعث ہے پر ہیز کرنا چاہئے، کیونکہ انسان کا بولنا اس کی شخصیت و منزلت کا مظہر ہے۔

پس اگر انسان نے اپنی بات کے نتائج کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر بات کی تو اس نے اپنی بے مایہ ماہیت کو فاش کر دیا، چنانچہ حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں '' :تکلّموا تعرفوا فان المرء مخبوء تحت لسانہ[2]'' ''بات کرو تا کہ پہچانے جاؤ،بیشک انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے''.دوسری جگہ پر بیہودہ بات کرنے اور اس کے نتیجہ کے بار میں فکر نہ کرنے کو منافقوں کے صفات جانتے ہوئے

[1] بحار الانوار ، ج ۹۶، ص ۷
[2] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) کلمات قصار ۳۹۲، ص ۴۳۲

فرماتے ہیں ''و ان المنافق یتکلّم بما علی لسانہ لایدری ماذالہ و ما ذا علیہ[1] '' ''منافق کی زبان پر جو آتا ہے اسے بولتا ہے اور وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے نفع میں کیا ہے اور نقصان میں کیا ہے۔ ''اس کے برعکس مومن '':اذا اراد ان یتکلم بکلام تدبرہ فی نفسہ، فان کان خیراً ابداہ وان کان شرّاً واراہ[2] '' ''جب چاہتا ہے کوئی بات بولے اس کے بارے میں صحیح طور پر غور و فکر کرتا ہے، اگر اچھی ہے تو اسے اظہار کرتا ہے اور اگر بری ہے تو اسے چھپاتا ہے''۔اگر چہ ہم اجمالاً جانتے ہیں کہ زبان کے وسیلہ سے خدائے متعال کے تقرب کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن بات اس تقرب کی کیفیت میں ہے اس کی وضاحت میں یہ کہنا بہتر ہے: ہماری بات اور گفتگو کبھی عبادت کے زمرے میں ہے، کہ انسان نماز اور عبادت کے دوران کچھ کلمات زبان پر جاری کرتا ہے، ہمارا یہ بولنا واجب اور مستحب عبادتوں میں شمار ہوتا ہے۔

لیکن دوسرے مواقع پر ، زبان ایک وسیلہ ہے اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لئے اس کے ذریعہ سے انسان اپنی نیت اور ارادے سے دوسروں کو آگاہ کرتا ہے ،اس سلسلہ میں بھی انسان کو الٰہی مقصد ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کونسی بات خدا کو پسند او راس کا تقرب حاصل کرنے کا سبب ہے اور اس میں اخروی ثواب ہیں، اس صورت میں انسان اپنی زبان کو حرکت دینے اور بات کرنے سے رضائے الٰہی تک پہنچتا ہے۔بعض مواقع پر ،بات کے مطلوب او رپسندیدہ ہونے کے سلسلے میں شرعی راہ سے معلومات حاصل کرنی چاہئے ورنہ انسان مطلوب کے حدود اور مشخصات کو نہیں پاسکتا ہے۔

بہت سے مواقع پر انسان اپنی عقل کے ذریعہ بات کے نیک ہونے کو تشخیص دیتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات پسندیدہ ہے ،واجب یا مستحب ہے۔ اس صورت میں اگر انسان قصد قربت رکھتا ہو، تو اس کی بات عبادت شمار ہوگی، مثال کے طور پر وہ اپنی بات کے ذریعہ کسی مظلوم سے ظلم کو دور کرنا چاہتا ہے یا اپنی بات سے کسی مظلوم کا حق ظالم سے واپس لینا چاہتا ہے۔یہ موارد ''مستقلات عقلیہ'' میں سے ہیں کہ عقل ان کو درک کرنے میں آزاد ہے اور اسے حکم شرعی کی ضرورت نہیں ہے۔اگر ہمیں

[1] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۱۷۶، ص۱۸۴
[2] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خطبہ ۱۷۶، ص۱۸۴

کوئی شرعی حکم بھی نہیں ملتا، تب بھی ہم اس بات کو درک کرتے ہیں کہ مظلوم سے ظلم کو دور کرنا واجب ہے اور اگر ہم اپنی بات سے کسی مظلوم سے ظلم کو دور کر سکیں، تو وہ بات واجب اور رضائے الٰہی کا سبب ہے، اگر وہ بات واجب کی حد تک بھی نہ پہنچے تو کم از کم اس کے نیک ہونے کو ہم درک کرتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرنا اور اسے خوش کرنا اور اپنی بات سے مصیبت سے دوچار ہوئے مومن کے غم و اندوہ کو دور کرنا ،پسندیدہ ہے ۔ ایسی صورت میں اگر انسان قصد قربت کرے تو اس کا عمل عبادت ہے۔ ان مواقع کے مقابلہ میں بعض جگہوں پر ہم فعل کے جائز ہونے کے حدود تشخیص نہیں دے سکتے ہیں، ایسے مواقع پر شرعی احکام کے مانند، شارع کو ہمارے لئے حکم بیان کرنا چاہئے ۔

اگر چہ ہماری عقل بعض کلی چیزوں کو درک کرتی ہے ، لیکن ان کی خصوصیات شرائط اور حدود کو شارع مقدس معین کرتاہے، کہ وہ منابع فقہی سے استنباط کے بعد ہمارے اختیار میں قرار دے، لہذا ایسے مواقع پر حکم شرع کا انتظار کرنا چاہئے .بعض مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا کو پسند نہیں ہیں، ان کا انجام دینا صحیح نہیں ہے ،اور اگر انسان انھیں انجام دے تو اس نے گناہ کیا ہے، اسے سزا ملے گی، چونکہ وہ خدا کو پسند نہیں ہیں اس لئے قصد قربت سے وہ عبادت نہیں بن سکتے۔ ایسے موارد کے بارے میں انسان کی عقل مستقل طور پر تشخیص دیتی ہے اور شارع مقدس کی طرف سے حکم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زبان کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف دینا، جھوٹ، تہمت اور دو مومنوں کے درمیان زبان کے ذریعہ اختلاف پیدا کرنا یہ سب امور عقلی کی بنا پر قابل مذمت ہیں۔

مذکورہ باتوں سے ہم نے نتیجہ حاصل کیا کہ بعض باتوں کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کو ہم واضح طور پر درک کرتے ہیں اور بعض دوسرے موارد ایسے ہیں کہ جہاں پر پسندیدیا ناپسندیدہ باتوں کے حدود و شرائط کو ہمارے لئے شارع مقدس بیان کرتا ہے۔ زبان سے بہرہ مند ہونے اور اس کے آفات سے بچنے کا طریقہ: یاد رکھنا چاہئے کہ زبان، خدائے متعال کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت اور اس کی لطیف ترین مخلوقات ہے۔ اگر چہ اس کا حجم چھوٹا ہے لیکن اس کی اطاعت و جرم بڑے ہیں ۔چونکہ کفر و

ایمان زبان کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ دونوں انسان کی اطاعت و عصیان کی سر حد ہیں ۔ اس لئے زبان پر کنٹرول کرنے کے لئے کوشش کی جانی چاہئے، کیونکہ زبان کو کھلی ڈھیل دینا انسان کے لئے فروان نقصانات کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان زبان کے شر سے تب محفوظ رہتا ہے ۔ جب اسے شرعی احکام اور قوانین کے ذریعہ کنٹرول کرے اور اسے دنیا و آخرت کے فائدہ کے علاوہ کسی اور چیز کے لئے آزادانہ رکھے اور جہاں پر بات کرنے سے دنیوی و اخروی خطرات کے ایجاد ہونے کا خوف ہو، اسے کنٹرول کرے ۔ انسان کو فریب دینے اور غافل کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا وسیلہ انسان کی زبان ہے۔ اسی لئے روایتوں میں خاموش رہنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں ''؛من صمت نجا[1]''''جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی''ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں ''؛لا یستقیم ایمان عبدٍ حتی یستقیم قلبہ و لا یستقم قلبہ حتی یستقیم لسانہ[2]'' ''کسی بندے کا ایمان تب تک مستحکم نہیں ہوتا جب تک اس کا دل مستحکم نہ ہو جائے اور اس کا دل اس وقت تک مستحکم نہیں ہوتا ہے جب تک نہ اس کی زبان استوار نہ ہوجائے'' اوحدی شاعر نے خاموشی کی توصیف میں یہ شعر کہے ہیں:

غنچہ کو در کشد زبان دو سہ روز

ہم بزاید گلی جھان افروز

گر چہ پرسند کم جواب دھد

بہ نفس بوی مشک ناب دھد

راہ مردان بہ خود فروشی نیست

در جھان بہتر از خموشی نیست

[1] بحار الانوار ، ج ۷۷، ص ۹۰، ح۲،
[2] بحار الانوار ، ج ۷۱، ص ۲۸۶

غنچہ دو تین دن کے لئے اپنی زبان بند رکھتا ہے تا کہ عالم کو منور کرنے والے پھول اور خوشبو کو جنم دے جب اس سے پوچھتے ہیں توکم جواب دیتا ہے بلکہ نفس کو خاص مشک کی خوشبو دیتا ہے خودفروشی مردوں کا شیوہ ہے دنیا میں خاموشی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے)زبان کو جھوٹ، تہمت اور غیبت وغیرہ جیسی آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہئے اور نیک اور شائستہ گفتگو کرنی چاہئے تا کہ مخاطب یا کسی دوسرے کو کوئی اذیت نہ پہنچے ۔پس ایسے موقع پر گفتگو کرنی چاہئے جہاں اس کی ضرورت ہو اور اس سے کوئی مقصد نکلے، ممکن ہے کبھی انسان ایسی بات کہے جس کے نتیجہ میں اس کے لئے بہشت میں ایک محل تعمیر کیا جائے۔پس جو اپنی بات سے خزانے حاصل کر سکتا ہے اگر اس کے بجائے خس وخاشاک حاصل کرے تو اس نے بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ مثال اس کے لئے ہے جو ذکر الٰہی ترک کرکے مباح کاموں میں لگ جائے جس کا اس کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اگر چہ اس نے گناہ نہیں کیا ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ اس نے ایک بڑے فائدے کو جو ذکر خدا کے ذریعہ اسے حاصل ہو رہا تھا کھو دیا ہے اس لئے وہ خسارے میں ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام اولیائے الٰہی کی توصیف میں فرماتے ہیں ''ان اولیاء اللّٰہ سکتوا فکان سکوتھم ذکراً و نظروا فکان نظرھم عبرۃً ونطقوا فکان نطقھم حکمۃً و مشوا فکان مشیھم بین الناس برکۃ[1]'' ''اولیائے الٰہی نے خاموشی اختیار کی ان کی خاموشی ذکر تھی، ان کا نگاہ اٹھا کر دیکھا ان کا دیکھنا عبرت تھا اورانھوں نے گفتگو کی ان کی گفتگو حکمت تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان پیادہ روی کی اور ان کا چلنا برکت تھا'' انسان کی سعادت و شقاوت اس سے بڑھ کر معاشرے کی تعمیر یا ایک سماج کے اقدار کی بیخ کنی کرنے میں زبان کا جو نقش رہا ہے اس کے پیش نظر خدائے متعال اور اولیائے الٰہی کی طرف سے اس کے متعلق بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے کہ انسان اپنی زبان کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔ اور اجتماعی و اسلامی آداب نیز رفتار سے آگاہی حاصل کرے، اولیائے دین کی رفتار و کردار کے طریقوں کو اپنے لئے نمونہ قرار دے اپنی زبان کو خود سازی اور معاشرے کی اصلاح کے لئے استعمال کرے۔ اس لحاظ سے زبان کو کنٹرول کرنے اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کا بہترین طریقہ

[1] اصول کافی ، ج ۳، ص ۳۳۳، ح ۲۵

انبیاء و اولیای الٰہی کی بات کرنے کے آداب کو مد نظر رکھنا ہے۔ معاشرت کے درمیان انبیاء لوگوں کو بات کرنے کے بہترین آداب کے طریقہ پیش کئے کہ نمونے کے طور پر ان کفار کے ساتھ انجام شدہ استدلالی مناظر پیش کئے جا سکتے ہیں، جو قرآن مجید میں بھی نقل ہوئے ہیں، اس طرح جو باتیں وہ مومنوں کے ساتھ کرتے تھے اور جو مختصر سیرت ان کی نقل ہوئی ہے۔ اگر ہم پیغمبروں کی کفار اور ہٹ دھرم افراد کے ساتھ کی گئی گفتگو کی جانچ پڑتال کریں تو ہم اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی کہ جو کفار کے لئے خوشی کا باعث نہ ہواور بے ادبی اور بی احترامی پر مبنی ہو۔

جی ہاں، خدا کے پیغمبر کفار کی طرف سے اس قدر مخالفت، گالم گلوچ، طعنہ زنی، بے احترامی اور مذاق اڑانے کے با وجود جواب میں بہترین بیان اور خیر خواہانہ نصیحتوں کے علاوہ کچھ نہیں کہتے تھے اور ان سے جدا ہوتے وقت سلام کئے بغیر جدا نہیں ہوتے تھے:(وَ عِبادُ الرَّحمٰنِ الّذین یَمشُون عَلَی الارضِ ہوناً وَ اِذا خاطَبَہُم الجاہلون قالوا سلاماً[1]) ''اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں، تو وہ انھیں سلام کرتے ہیں''

جی ہاں، مشرکین جو خدا کے پیغمبروں کے خلاف اس قدر زخم زبان، تہمتیں اور بے احترامیاں روا رکھنے کے با وجود قرآن مجید کے نقل کے مطابق کسی ایک پیغمبر نے بھی ان اذیت و آزاروں کے مقابلہ میں سختی یا بد زبانی سے جواب نہیں دیا ہے، بلکہ اس کے بر عکس نیک گفتار، دل کو موہ لینے والی منطق اور نیک اخلاق سے پیش آتے تھے۔ جی ہاں یہ بزرگوار ایسی تعلیم و تربیت گاہ کے پرورده تھے کہ جنھیں بہترین کلام کرنے اور زیبا ترین ادب کی تعلیم دی جاتی تھی اور انہیں تعلیمات الٰہی میں سے ایک دستور ہے کہ جسے خدا ئے متعال حضرت موسیٰ اور ہارون کو دیتے ہوئے فرماتا ہے:(اذہبا الی فرعون انہ طغی فقولا لہ قولاً لینا لعلّہ یتذکّرا و یخشیٰ[2]) ''تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس سے نرمی سے بات کرو شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خوف خداپیدا ہو''انبیاء کی بات کرنے کے آداب میں یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں میں سے جانتے تھے اور ان کے ہر گروہ اور طبقہ

---

[1] فرقان / ۶۳
[2] طہ ،۴۳و۴۴

سے ان کے فہم کے مطابق گفتگو کرتے تھے اور یہ حقیقت ان کی مختلف لوگوں کے ساتھ کی گئی گفتگو جو تاریخ اور روایتوں میں نقل ہوئی ہے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے. چنانچہ شیعہ اور سنی دونوں کی طرف سے روایت کی گئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ''؛انا معاشر الانبیاء امرنا ان نکلّمَ الناس علی قدر عقولھم[1]'' ''ہم پیغمبروں کا بنیادی کام یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل کے مطابق بات کریں[2]''مزاح میں مشغول کرنے والی اور افراطی باتوں سے پرہیز:آفات زبان اور زیان آور بحث و مباحثہ کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ہمارے فقہانے فقہ میں حرام باتوں کے بارے میں کئی باب مخصوص کئے ہیں، جیسے جھوٹ، غیبت، مذاق اڑانا، مومن کو اذیت کرنا، ایسی بیہودہ اور مشغول کرنے والی باتیں، جن کو ''لھوالحدیث'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ انسان کو خدا سے دور کرتی ہے اور انسانی طبیعت کو معنویت اور خدا کے نور سے خالی کردیتی ہے۔ (اخلاق کی کتابوں میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے) بعض مواقع پر کسی عمل کے مذموم اور حرام ہونا انسان کے لئے واضح ہوتا ہے، اس لئے انسان اس گفتگو یا عمل کے حکم کے بارے میں شک نہیں کرتا۔

لیکن بعض مواقع پر کچھ باتیں بظاہر مباح لگتی ہیں حتی انسان تصور کرتا ہے کہ یہ پسندیدہ ہیں لیکن حقیقت میں وہ باتیں ناشائستہ اور حرام ہوتی ہیں۔ایسے مواقع پر شیطان ہمیں دھوکہ دیتا ہے اور ہم مشکوک باتوں کو آگاہانہ یا نیم آگاہانہ طور پر زبان پر لاکر گناہ میں آلودہ ہوتے ہیں، اگر چہ کبھی انسان کافی توجہ نہ کرنے کی وجہ سے خود اپنے کو دھوکہ دیتا ہے۔ اگر انسان مشکوک مواقع کے بارے میں صحیح فکر اور دقت کرے، تو حقیقت کو درک کر سکتا ہے، لیکن چونکہ وہ خواہشات سے مغلوب عمل کرتا ہے، اپنی کام میں دقت نہیں کرتا ہے اور اپنے عمل کو انجام دینے کے لئے ایک نہ ایک بہانہ تلاش کرتا ہے۔ مثلاً ایک شوخ مزاج انسان جب ایک مجلس کو سرگرم کرنا چاہتا ہے اور اپنی باتوں سے دوسروں کہ شاد و مسرور کرنا چاہتا ہے۔ تو بہانہ جوئی کرتا ہے کہ مثلاً آج شبِ عید ہے اور میں دوسروں کو شاد کرنا چاہتا ہوں۔ اسی بہانہ سے اوقات کو ضائع کرنے والی ایسی باتیں کرتا ہے کہ ان کا کوئی معنوی حتی دنیوی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اپنی عمر

[1] بحار الانوار، ج ۱، ص ۸۵، ح ۷
[2] المیزان (دار الکتب الاسلامیہ ، طبع سوم) ج ۶، ص ۳۱۵-۳۱۷

ضائع کرنے، دوسروں کو تکلیف پہنچانے اور برے اثرات کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔ کلمہ ''لھو'' کا معنی ہر وہ چیز ہے جوانسان کو ضروری اور اہم کاموں سے روکے اور ''لھوالحدیث'' مشغول کرنے والی بات ہے کہ انسان کو حق سے منصرف کرکے اپنی طرف مشغول کرلے، مثال کے طور پر خرافاتی حکایتیں اور وہ داستانیں جو انسان کو فسق و فجور کی طرف کھینچتی ہیں۔اس طرح مبتذل ترانے اور موسیقی وغیرہ ''لھوالحدیث'' کے مصداق ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں آیا ہے کہ یہ آیت نصربن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چونکہ وہ ایک تاجر تھا ایران سفر کرتا تھا او ر وہا ں پر ایرانی اخبار اور افسانوں کو ان کے منابع سے حاصل کرتا تھا او رپھرانھیں قریش سے بیان کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا: محمد تمھیں عاد و ثمود کی داستانیں سناتے ہیں اور میں رستم ،اسفندیار اور کسری کی داستانیں سناتا ہوں، لوگ بھی اس کی داستانوں کو کان لگا کے سنتے تھے اور قرآن مجید کی آیتوں کو نہیں سنتے تھے[1]۔

اس امر کی طرف دھیان رکھنا چاہئے کہ ایک بے چین اور افسردہ مومن بھائی کو خوش کرنے کے لئے صرف یہ وسیلہ نہیں ہے کہ اسے بیہودہ او رہنسانے والی باتوں سے سرگرم کیا جائے، بلکہ افسردہ اور غمگین فرد کے مزاج کے مطابق خدا کی رحمتوں سے متعلق کسی روایت کو منتخب کرکے اسے بیان کیا جاسکتا ہے تا کہ اس کے اندر خوشی اور مسرت پیدا ہواور اس کی بے چینی اور افسردگی دور ہوجائے، نہ یہ کہ ہم اسے بعض خرافات اور بیہودہ باتوں سے خوش کریں. اس بناپر دوسروں کے دلوں میں مسرت پیدا کرنے اور انھیں خوش کرنے کا کوئی منکر و مخالف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی مکرر طور پر دینی کتابوں میں تاکید کی گئی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ انسان کا بیان او راس کی بات میں مثبت مادی و معنوی نتیجہ ہونا چاہئے تا کہ نہ دوسروں کا وقت ضائع ہو اور نہ زبان جیسی نعمت الٰہی کا پست اور بے اہمیت طریقہ سے استعمال کیا جائے۔امام محمد باقر علیہ السلام نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'':من سرّ موٴمناً فقد سرّنی و من سرّنی فقد سرّ اللہ[2]''''جو شخص کسی مومن کو خوش و مسرور کرے،اس

[1] المیزان (دار الکتب الاسلامیہ ، طبع سوم) ج۱۶، ص۲۲۰، ۲۲۳
[2] وصول کافی ،ج۳ص۲۷۱

نے مجھے خوش کیا ہے اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے بیشک خدائے متعال کو خوش کیا ہے۔ ''ایک اورروایت میں حضرت اما م سجاد علیہ السلام نقل فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا '':ان احبَّ الاعمال الی اللہ عز و جل ادخال السرور علی المومنین '''' خدائے متعال کے پاس سب سے بہترین عمل مومنوں میں مسرّت و شادمانی پیدا کرناہے۔ ''کبھی مومن امور دنیوی یا اخروی کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے، غم و حزن اس کی فعالیت اور سرگرمی میں روکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں اور اس کی توانائیوں کو مفلوج کرکے رکھ دیتے ہیں۔ اس بناپر وہ اپنی قابلیتوں اور توانائیوں سے استفادہ نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ وہ نشاط و آرام سے محروم ہوتا ہے۔ اگر وہ مطالعہ کرے تو کسی چیز کو حفظ نہیں کرسکتا ہے یانماز کے وقت حضور قلب نہیں رکھتا ہے۔

بہر صورت کسی کام میں اسے دلچسپی نہیں ہوتی اور کسی کام کوانجام دینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھا تا اس صورت میں اسے اس غم و اندوہ سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کو خوش کرناچاہئے تا کہ وہ عبادت اور دیگر سرگرمیوں کو انجام دے سکے۔ اُسے خوش کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے اور اگر خدائے متعال کے لئے ہو توعبادت بھی ہے۔ کبھی انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور ایک مومن کو خوش کرنے کے لئے، بے فائدہ کہانیاں نقل کرنے اور لغو و بیہودہ باتیں،مذاق اور مضحکہ خیز کلمات کا سہارا لیتا ہے، گویا راستے کو انہی پر منحصر جانتاہے۔

اس سے غافل کہ اس سلسلے میں کوئی منطقی، موزوں او رقابل قدر بات کہہ سکے اور دلیل و استدلال سے اس مومن کو اس کے غم و آلام سے نجات دلا سکے۔ اس مومن کی رہنمائی کی جاسکتی ہے اور اسے یاددہانی کرائی جاسکتی ہے کہ یہ اضطراب اور غم و اندوہ تمھارے ذہن کو نقصان پہنچانے اور بیکار کرنے کے علاوہ تمھارے درد کا علاج نہیں کر سکتے ہیں اس سے تجھے کوئی فائدہ نہیں مل سکتاہے۔ شوخ طبیعت اور لطیفہ باز انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کا دوست مضطرب و رنجیدہ ہے تو وہ لطیفے اور ہنسانے والی باتیں کہنا شروع کرتا ہے تا کہ اپنے دوست کو خوش کر سکے، البتہ وہ اس سے غافل ہے کہ مزاح بہت کم پسندیدہ ہے اور اس میں افراط قابل مذمت ہے۔ مزاح میں افراط اس امر کا سبب ہے کہ انسان متواتر اپنے اور دوسروں کو کھلونا بنا لیتا ہے اور اس میں افراط

کے علاوہ حد سے زیادہ ہنسی کا موجب ہوتا ہے اور حد سے زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے اور انسان کی عظمت اور وقار کو زائل کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی مزاح و شوخی کم کرتے تھے، چنانچہ فرمایاہے: ''انّی لاامزح و لا اقول الاّ حقاً'' [1] ''میں بھی مزاح کرتا ہوں، لیکن مزاح (مذاق) میں سچی باتیں کہتا ہوں'' یا زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں'':واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیراً [2] '' ''خدا کی قسم!اگر تم لوگ اس چیز سے آگاہ ہوتے جس سے میں آگاہ ہوں تو زیادہ روتے اور کم ہنستے۔''

مذکورہ مطالب کے پیش نظر کوشش کرنی چاہئے کہ مذاق و مسخرہ حد سے تجاوز نہ کرے ۔ کیونکہ کبھی مذاق و مسخرہ میں اعتدال سے تجاوز کرنا ادخال السرور کے بہانے اذیت، آزار، گستاخی، تہمت و غیبت کا مرتکب جاتا ہے۔ اس بہانہ سے کہ مومن کو خوش کرنا مستحب ہے، انسان شیطان کے دھوکے میں آتا ہے اور غیبت جیسے گناہ کبیرہ میں آلودہ ہوتاہے، یعنی اپنے دوست کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ غیبت کو سن کرگناہ میں آلودہ ہوجائے۔

بہر حال، بہت سے مواقع پر شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے وہ اپنے خیال میں نیک عمل انجام دیتا ہے، لیکن در حقیقت وہ مرتکب گناہ ہوتا ہے۔اب اگر انسان صحیح طور پر غور و فکر کرے تو اسے اپنی غلطی کا علم ہوگا، اگر چہ بعض اوقات انسان اس قدر آگاہی و بصیرت نہیں رکھتا ہے، حتی اگر غور بھی کرتا ہے تب بھی اپنی غلطی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا؛ اس صورت میں دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ اسے آگاہ کریں کہ یہ ناپسندیدہ عمل ہے اور ایک مطلوب فعل جیسے دوسروں کو خوش کرنا دوسرے انداز میں کہ جو صحیح اور مطلوب طریقہ ہے انجام دیا جاسکتاہے۔ہدایت کے طریقوں کا یکساں نہ ہونا :افراد کو آگاہ کرنے اور انھیں ناپسندیدہ اعمال کے بارے میں متوجہ کرانے کے لئے یکساں طریقہ سے استفادہ نہیں کیاجاسکتاہے۔ جولوگ واجبات اور محرمات سے خاص آگاہی نہیں رکھتے ہیں اور دینی منابع ، جیسے قرآن مجید اور روایات تک جن کی رسائی نہیں ہے، انھیں جھوٹ، چغل خوری اور غیبت کے دنیوی

[1] بحار الانوار ، ج ۱۶، ص ۲۹۸
[2] بحار الانوار ، ج ۵۸، ص ۱۰۷

نقصانات سے آگاہ کرنا چاہئے، یعنی غیبت کرنا مردار کا گوشت کھانے کے برابر ہے وغیرہ لیکن جو ہمیشہ کتاب و سنت سے سروکار رکھتے ہیں ان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہم انھیں ان گناہوں کے نقصانات کی طرف اشارہ کریں، کیونکہ وہ خود آگاہ ہیں بلکہ انھیں ان موارد سے آگاہ کرنا چاہئے جن کے بارے میں وہ غفلت سے دوچار ہوئے ہیں۔ انھیں اس بات سے آگاہ کرنا چاہئے، کہ اگرچہ بعض باتیں صحیح ہیں اور نیک نیتی سے کہی جاتی ہیں لیکن درست نہیں ہے اور اس میں خدا کی مرضی نہیں ہے اور ایسی باتیں سبب بنتی ہیں کہ انسان نقصان اٹھائے۔ جی ہاں، بعض مواقع پر کام ایک دوسرے کے دورخی ہوتے ہیں اور یہ انسان کی نیت اور غرض پر منحصر ہے کہ انھیں پسندیدہ ہویت بخشے یا ناپسندیدہ کبھی اگر کسی کام کو نیک نیتی سے انجام دیا جائے تو وہ کام نیک محبوب ہوتا ہے اور اگر اسی کام کو بُری نیت سے انجام دیا جائے تو وہ کام بُرا اور پست ہوتا ہے، کیوں کہ اسلام میں ہر کام کی اہمیت انجام دینے والے کی نیت پر منحصر ہے۔ ممکن ہے انسان لاعلمی اور غفلت کے عالم میں ایک بُرے کام کو نیک نیتی سے انجام دے اور ممکن ہے اس کی نیت کی بنا پر اسے ثواب ملے، اگر اسے ثواب نہ بھی ملے تو کم از کم معذور ہے۔ لیکن اگر ایک اچھے کام کو بُری نیت سے انجام دے تو اس کا کوئی ثواب نہیں ہے،اور وہ عبادت بھی نہیں ہے، ممکن ہے سزا بھی ہو،کیونکہ اس کا عمل حسن اخلاق پر مبنی نہیں تھا۔ بولنے اور بات کرنے میں ایسی مثالیں زیادہ پائی جا سکتی ہیں۔

کبھی کسی شخص کی بارے میں بات چھڑ جاتی ہے اور انسان اس کی نیکیوں کو بیان کرنا چاہتا ہے اور کبھی اس کی خوشنودی کے لئے، چاپلوسی، مبالغہ اور بے جا تعریفیں کرتا ہے۔ اگر اس سے پوچھا جاتا ہے: تم کیوں اس قدر چاپلوسی، مبالغہ آرائی اور تملّق سے کام لیتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتا ہے: میں دوسروں کا ذکر خیر کر کے تواضع او رانکساری دکھانا چاہتا ہوں! البتہ انسان کی عالی اور ممتاز خصوصیات میں سے ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کو شمار کرے اور کوشش کرے دوسروں کی نیکیوں کا ذکر کرے، روایتوں میں بھی اس نکتہ کی طرف تاکید کی گئی ہے۔ ایسا کر کے ہم ایک مومن کو عزت بخشتے ہیں اور اس کی آبرو بڑھاتے ہیں او ردوسروں کو بھی نیک صفات کے حوالے سے تشویق کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنا چاہئے کہ ہم کس نیت سے دوسروں کی ستائش کرتے ہیں؟ کیا ہم مومن کو

عزت بخشنے کے لئے، خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے اور معاشرت میں نیکی کی ترویج کے لئے دوسروں کی ستائش کرتے ہیں؟ یا اس کے سامنے یا اس کی عدم موجودگی میں اس کی ستائش کرتے ہیں کہ وہ ہم سے خوش ہو اور ہم اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں! اور وہ بھی ہماری اسی طرح تعریف کرے حقیقت میں یہاں پر ہماری مثال: ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کے مانند ہے۔ میں اپنے دوست کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کرتا ہوں او روہ بھی میری عدم موجودگی میں میری ستائش کرتا ہے۔ یہ ایسے مواقع میں جہاں پر شیطان پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اپنے شیشے میں اتار لیتا ہے۔

عوام او رعام افراد کو جو حکم الہی سے آگاہ نہیں ہیں شیطان جھوٹ، غیبت اور معروف گناہوں کو انجام دینے پر اکساتا ہے، لیکن علما کو دوسرے طریقوں سے دھوکہ دیتا ہے۔ جولوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی کی عدم موجودگی میں اس کی تعریف کریں تا کہ وہ بھی مقابلہ میں ان کی ستائش کرے، تو انہوں نے اچھا کام انجام دیا ہے، حقیقت میں یہ اچھا کام نہیں ہے بلکہ یہ ان کے نفس کے مکر و فریب کا نتیجہ ہے۔ لہذا انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے، اگر وہ کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے، تو اسے پہلے اپنے دل میں پوری طرح غور و خوض کرنا چاہئے کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے کونسا مقصد مد نظر رکھتا ہے۔ ہر کام کو انجام دینے سے پہلے اس پر تھوڑا غور کرے اس کے بعد اس کام کو انجام دے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی زبان کو آزاد رکھے اور کسی قسم کی فکر کئے بغیر بات کہے، کیونکہ احمق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو کنٹرول نہیں کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام گفتگو کرنے کے حوالے سے عاقل اور احمق کے درمیان فرق کے بارے میں فرماتے ہیں '': لسان العاقل وراء قلبہ و قلب الاحمق وراء لسانہ[1]'' ''عقلمند کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہے اور بیوقوف کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہے۔'' مرحوم سید رضی رحمۃاللہ علیہ اس عظیم المرتب بیان کی وضاحت میں فرماتے ہیں '': یہ تعجب آور بات ہے کہ امام علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ عقلمند شخص، اپنی زبان کو کھلی ڈھیل نہیں دیتا بلکہ اپنے دل میں غور و خوض کرنے کے بعد اظہار کرتا ہے. اس کے

[1] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی، کلمات قصار، ۴۰، ص، ۳۶۷

مقابلہ میں بیوقوف کی زبان پر جو آتا ہے اسے بولتا ہے اور غور وفکر کرنے سے پہلے بات کہنے کو ترجیح دیتا ہے۔پس گویا عقلمند کی زبان اس کے دل کے تابع ہے اور بیوقوف کا دل اس کی زبان کے تابع ہے''پس ہمیں بات کرتے وقت غور و خوض کرنا چاہئے کہ ہم کس لئے بات کرنا چاہتے ہیں اور ہماری غرض کیا ہے تا کہ خدا کی عنایت سے زبان کی آفتوں اور نفسانی خواہشات اور شیطانی حیلوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ لیکن اگر ہم غور و فکر نہ کریں اور اپنی کام میں ضروری دقت نہ کریں اور تامل کئے بغیر بے حساب بات کریں، تو ہم آہستہ آہستہ شیطان کے پھندے میں پھنس جائیں گے اور غیر شعوری طور پر اس کے مکرو فریب میں گرفتار ہوں گے۔ البتہ یہ لغزشیں اور یہ انحرافات جو غفلت، جلد بازی،امور کی انجام دہی میں غور و فکر نہ کرنے اور صحیح محرک (مقاصد) کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں اور یہ چیز صرف بات کرنے اور گفتگو کی حد تک محدود نہیں ہے۔

بلکہ انسان اپنے بدن کے دوسرے تمام اعضا اور توانائیوں سے استفادہ کرنے میں بھی اپنی لغزشوں اور انحرافات سے دوچار ہوتا ہے۔البتہ اس وقت ہماری بحث کا موضوع ان آفتوں کے بارے میں ہے جو انسان کو زبان کی وجہ سے پیش آتی ہیں اور دوسرے خطرات کی نسبت بیشتر نقصان پہنچانے والی ہے۔ ہمیں بات کرتے وقت خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی فکر میں ہونا چاہیئے نہ یہ کہ اپنی نیت اور ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں رہیں۔ پہلے مرحلہ میں ہماری گفتگو خدا کے نزدیک پسندیدہ او رمطلوب ہونی چاہئے اور دوسرے درجہ میں اس بات کے کہنے میں ہمارے اغراض او رمقاصد صحیح ہونے چاہئے، یعنی فعل بھی نیک ہونا چاہئے اور فاعل بھی ۔ بات کا قالب بھی صحیح ہو اور اس بات کا ہدف اور مقصد بھی، بات کی صورت بھی صحیح ہو اور اس کا مفہوم و معنی بھی ۔

حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالی علیہ اور دوسرے بزرگ بارہا فرمایا کرتے تھے: شیطان ہرگز عالم کو شراب نوشی او رزشت اعمال جو اس کی شایان شان نہیں ہے انجام دینے پر مجبور نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں عالم کے لئے آبرو باقی نہیں رہے گی اور وہ ہرگز ایسا خطرہ اور نقصان اٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔لیکن شیطان علما اور اہل علم کو ایسی لغزشوں اور انحرافات سے دوچار

کرتاہے کہ جو حقیقت میں شراب نوشی سے بھی بدتر ہیں۔وہ عالم کو ایسا کام انجام دینے پر مجبور کرتاہے کہ ظاہر میں وہ کام برا نہیں لگتا ہے اور کوئی اسے مذمت نہیں کرتاہے کہ تم نے کیوں ایسا کیا،لیکن اس کام کا ضرر اور گناہ بہت ہوتاہے اور ممکن ہے خود انسان بھی متوجہ نہ ہوکہ وہ کیسے اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوگیا اور کس قدر اپنی حیثیت سے گرگیاہے!اس لئے بہتر ہے ہم مزید غور فکر سے کام لیں اور اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی کوشش کریں اور اپنی زبان کو لگام دیں،تاکہ ہر بات کو زبان پر جاری نہ کریں اور سوچ سمجھ کر گفتگوکریں ۔جب تک بات کرنے کہ ضرورت نہ ہو زبان نہ کھولیں،چنانچہ سعدی کہتاہے:

ندہد مرد ہوشمند جواب

مگرآنکہ کزاو سوال کنند

''عقلمند تب تک بات نہیں کرتا جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے''،بولنے اور دیگر رفتار کے رد عمل اور نتائج پر ایک نظر: ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ جب ہم گفتگو کرنے میں محو ہوتے ہیں،تو پھر زبان پر قابوپانا مشکل ہے،اس لئے زبان کھولنے سے پہلے جو ہم کہنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں غور کر لیں تا کہ حد سے تجاوز نہ کریں۔ہم اگر اپنی زبان پر قابونہیں رکھتے تو جب ایک مجلس میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں،لوگ دوسروں کی باتیں سن کرہنستے ہیں اور بات کرنے والے کی ہمت افزائی کرتے ہیں،تو انسان کے لئے ایسے ماحول میں خاموش بیٹھنا مشکل ہے۔لہٰذا باتوں باتوں میں انسان مذاق و مسخرہ کرنے پراترتاہے اور ہر طریقہ سے،حتی غیبت کے ذریعہ دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرتاہے۔حقیقت میں ایسی حالت میں زبان کنٹرول میں نہیں رہتی ہے،بلکہ سرکش گھوڑے کے مانند ہے،کہ جو لگام توڑ کر بھاگ جاتاہے تو اسے پھر سے قابومیں لانا دشوار ہوتاہے۔لہٰذاانسان کو ابتدا سے ہی اپنی زبان کوکنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور جو بھی مطالب یا گفتگو پیش کرنا چاہے پہلے اس کے بارے میں فکر کرے کہ وہ بات مناسب وسزاوار ہے یا نہیں اس کے علاوہ گفتگو میں حد سے تجاوز کرنے اور افراط سے بھی پرہیز کرے۔

انبیاء اور اولیائے الٰہی انسانوں کی تربیت کی غرض سے انھیں یاددہانی کراتے تھے کہ ان کے کام کا ایک حساب و کتاب ہے،ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی گفتار و کردار میں جوابدہ نہیں ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ ایک گھنٹہ گفتگو کرنے کے بعد ہم فکر کریں کہ کہیں کوئی اتفاق تو پیش نہیں آیا!بلکہ ہر کلمہ جوانسان کے منہ سے نکلتاہے وہ ثبت ہوتا ہے اور اس کے بارے میں اس سے سوال ہوتا ہے کہ تم نے کیوں ایسا کہا اور کیوں فلاں نیت سے کہا۔اس مطلب کو مد نظر رکھناانسان کے لئے سبب بنتاہے کہ انسان کسی حد تک اپنی آپ کو کنٹرول کرے و رنہ انسان کانفس قوی ہے اور آسانی کے ساتھ قابومیں نہیں آتاہے۔مومن کے نفس کو کنٹرول کرنے کی من جملہ راہوں میں سے ایک راہ یہ بھی ہے کہ وہ اس امر کی طرف متوجہ رہے کہ خدائے متعال حاضر وناظر ہے اور وہ اس کی باتوں کو سنتاہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں سوال کرے گا۔

اس نکتہ کوپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کلام مبارک میں یوں بیان فرمایا ہے ''یا اباذر؛ ان اللہ عزّو جلّ عند لسان کلّ قائلٍ فلیتّق اللہ امرء و لیعلم ما یقول ''''اے ابوذر!خدائے متعال ہر بولنے والے کی زبان کے پاس ہے،پس بات کرنے والے کو خدا سے ڈرنا چاہئے اوروہ جان لے کہ کیا کہتا ہے''اگر انسان اس حقیقت کو مد نظر رکھے کہ اس کی گفتگو کے دوران خدائے متعال حاضر و ناظر ہے اور اس کی کوئی بات خدا سے پوشیدہ نہیں ہے،تو وہ احتیاط سے کام لے گا ہر بات کو زبان پر جاری نہیں کرے گا۔اس کے علاوہ تقوائے الٰہی اس امر کا سبب بن جاتاہے کہ انسان خدائے متعال سے ڈرے،نتیجہ کے طور پر اپنی رفتار کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ سوچے سمجھے بغیر کوئی بات اس کی زبان پر جاری ہوجائے۔

اس طرح اولیائے الٰہی کی تربیت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیرو کار افراد کو نفسانی خواہشات پر کنٹرول کی تاکید کرتے ہوئے انھیں فضول اور بے جا باتوں سے پرہیز کرنے کی تشویق کرتے ہیں اور احتیاج اور ضرورت کے مطابق بات کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ زبان پر کم کلمات جاری کریں۔اگر دو جملوں سے کسی کو کوئی مطلب سمجھا سکتے ہیں تو تیسرا جملہ کہنے سے پرہیز کریں ۔یہاں تک اگر کسی واجب حکم ، جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو کوشش کریں

کہ اپنے مقصود کی حد میں بات کریں اور اضافی بات کرنے سے پرہیز کریں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں ''یا اباذر؛ اترک فضول الکلام وحسبک من الکلام ماتبلغ بہ حاجتک''[1] اے ابوذر! زیادہ بات کرنے سے پرہیز کرو، اتنی ہی بات کرو جس سے تمھاری حاجت پوری ہو جائے'' بعض اوقات جب انسان کسی مجلس میں باتیں کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے، تو غیر شعوری طور پر فضول اور بیہودہ باتیں اس کی زبان پر جاری ہوتی ہیں نہ ان سے اس کا کوئی دنیوی فائدہ ہوتا ہے اور نہ اخروی۔ اپنی زندگی کے ناقابل تلافی سرمایہ کو فضول باتوں میں ضائع کرتا ہے! لہذا مناسب ہے انسان اندازہ کے مطابق بات کرے اور فضول اور اضافی باتوں سے پرہیز کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں ''طوبی لمن طاب خلقہ وطہرت سجیّتہ وصلحت سریرتہ وحسنت علانیتہ علانیہ وانفق الفضل من مالہ وامسک الفضل من کلامہ'' '' کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے اخلاق اچھے، صفات پاکیزہ، باطن شائستہ اور ان کا ظاہر نیک ہے اور وہ اپنے اضافی مال کو انفاق کرتے ہیں اور زیادہ باتیں نہیں کرتے'' ایک بزرگ کا کہنا ہے: مومن وہ ہے، جو بات کرتے وقت پہلے فکر کرتا ہے۔

لہذا اگر بات کرنے میں مصلحت ہے تو بات کرتا ہے ورنہ بات نہیں کرتا ہے۔ لیکن فاسق و فاجر، بات کرتے وقت اپنی زبان کو مکمل طور پر کھلی ڈھیل دیتا ہے۔ جی ہاں، زبان کے نقصانات اور آفتوں کے بارے میں بہت سی باتیں قابل بیان ہیں من جملہ زبان انسان کی شخصیت اور اجتماعی حیثیت کو خراب کرتی ہے آخرت میں اس کی پشیمانی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ جب انسان قابو سے باہر ہو کر باتیں کرتا ہے، خواستہ یا نخواستہ وقت ضائع کرنے کے علاوہ زیادہ اور بیہودہ باتیں کرنے کی وجہ سے گناہوں میں بھی مبتلا ہوتا ہے، لہذا اس طرح اپنے قیمتی وقت کے سرمایہ کو بھی ضائع کرتا ہے اور خدا کے غضب و خشم سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ محققانہ باتوں کو نقل کرنے کی ضرورت اور افواہوں سے پرہیز: حدیث کو جاری رکھتے ہوئے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں ''یا اباذر؛

---

[1] بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۴۰۰

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل مایسمع ‘‘ ’’اے ابوذر ! جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان جو سنے اسے نقل کرے‘‘
زبان کی آفتوں میں سے ایک آفت یہ ہے کہ انسان جو کچھ سنے اس کی حقیقت کی بارے میں تحقیق و تفحص کے بغیر بلافاصلہ اسے دوسروں کے لئے نقل کرے۔اگر چہ وہ جھوٹ بولنے کا مقصد نہیں رکھتا ہے، اور جو کچھ سنا ہے اسے کسی قسم کی کمی بیشی کے بغیر نقل کرتا ہے، لیکن اس کی بات جھوٹ شمار ہوتی ہے، کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے سچ ہونے کے بارے میں اطمینان نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے انسان کو جھوٹ بُری اور ناپسند باتوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے جن کی سچائی کی بارے میں یقین نہیں رکھتا ہے، بلکہ ہمیں ہر بات کی بارے میں پہلے تحقیق کرنی چاہئے اگر اس کی سچائی کی بارے میں اطمینان پیدا ہوا تو اسے نقل کرنا چاہئے۔اس سلسلہ میں شاعر کہتا ہے:

تا نیک ندانی کہ سخن عین صوابست

باید کہ بہ گفتن دہن از ہم نگشائی

گر راست سخن گویی و در بند بمانی

بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

’’جب تک تجھے یقین نہ ہوجائے کہ تیری بات صحیح ہے، اسے کہنے کے لئے اپنا منہ نہ کھولو ۔ اگر سچ کہہ کر تجھے قید وبند میں ڈالاجائے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ جھوٹ تجھے قید سے رہائی بخشے‘‘ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر انسان جو کچھ سنتا ہے اسے نقل کرے تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن کبھی ہم بھی جو کچھ سنتے ہیں اس پر دقت نہیں کرتے ہیں بلکہ ممکن ہے اس میں کمی یا بیشی کرکے دوسروں کے لئے نقل کرتے ہیں جبکہ ۔ ہمیں بات کرتے وقت دقت کرنی چاہئے اور ہر چیز کو نقل نہیں کرنا چاہے، جب انسان جو کچھ سنتا ہے اسے نقل نہیں کرنا چاہئے پس چہ جائے کہ، کوئی بات نقل کرنے میں مبالغہ کرے

اوردوسرے کی بات کو گھڑ کرپیش کرے!! ۔ جھوٹ کے بارے میں جو تصور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پیش کیا ہے، اس کے پیش نظر یقیناً افواہ جھوٹ کا واضح مظہر ہے۔ افواہ شیطان کے کارآمد حربوں میں سے ایک حربہ تھا کہ جب بھی اولیائے دین، بشر کی ہدایت اور سالم معاشرے کے تشکیل کی لئے قدم اٹھاتے تھے، تو خدا او ر دین کے دشمن تمام شیطانی وسائل کے ساتھ من جملہ جھوٹ، تہمت اور افواہ سے ان کا مقابلہ کرتے تھے تا کہ الٰہی قائدین کے گرد جمع ہوئے لوگوں کو متفرق کرکے اپنے شیطانی مقاصد تک پہنچ جائیں۔

تاریخی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں بھی دشمن، مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی حمایت اور دین کی راہ میں پائداری سے روکنے کے لئے ان کے دلوں میں خوف و وحشت ایجاد کرتے تھے اور اس سلسلہ میں افواہ کا سہارا لیتے تھے، چنانچہ خدائے متعال فرماتاہے:(واذا جاء ہم أمر من الأمن أوا لخوف اذا عوابہ ولوردّوہ الی الرّسول والی أولی ألامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم[1]) ''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے فوراً نشر کردیتے ہیں (تاکہ دشمن آگا ہوجائیں) حالانکہ اگر رسول اور صاحبان امر کی طرف پلٹا دیتے تو ان سے استفادہ کرنے والی حقیقت حال کا علم ہوتا''...

یہ آیہ مبارکہ بدر صغریٰ کی داستان بیان کرتی ہے کہ جنگ احد کی روداد کے بعد مسلمانوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کے نتیجہ میں شکست سے روبرو ہونے کے بعد آخر میں اللہ تعالی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی تاکہ وہ اپنے مختصر سپاہیوں کے ذریعہ دشمنوں پر فتح پاسکیں اور اسلام کو قطعی نابودی سے نجات دیں،منافقین دشمن کی طاقت کو بیان کرنے اور جنگ احد میں ان کی فتح یابی کا ذکر کرکے مسلمانوں اور پیغمبر کے اصحاب کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کرنا چاہتے تھے او راپنی افواہ سے مومنوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے،ان کا مقصد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔اس آیہ مبارکہ سے یہ معلوم ہوتاہے کہ خوف و امن کے بارے میں جو کچھ منافقین کو پہنچتا تھا وہ اسے نشر کردیتے تھے،سے مرادوہ افواہ ہیں جو کفار اوران کے چیلوں کے ذریعہ ایجاد کی جاتی تھیں تا

[1] نساء ۸۳

کہ مومنین میں نفاق اور اختلاف پیدا کریں، ضعیف الایمان مومنین بھی انھیں نشر کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ ان خبروں کا پھیلنا مسلمانوں میں سستی اور عدم استحکام ایجاد ہونے کا سبب بنے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ جنگ احد میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد ہمیشہ لوگوں کو کفار سے جہاد کرنے کی دعوت دیتے تھے اور کچھ لوگ اس کوشش میں تھے کہ مومنوں کو جہاد میں شرکت کرنے اور پیغمبر خدا ﷺ کی مدد کرنے سے لوگوں کو روکیں اور اس غرض سے افواہ پھیلاتے تھے کہ مشرکین تمھارے خلاف لشکر جمع کررہے ہیں، خدائے متعال مسلمانوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ یہ ڈرانا اور افواہ شیطان کی طرف سے ہے اور یہ شیطان کی باتیں ہیں جو اس کے دوستوں کے منہ سے باہر آتی ہیں، اور اس کے بعد مومنوں پر واجب کرتا ہے کہ ان افواہ پھیلانے والوں سے نہ ڈرو اگر خدائے متعال پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اسی سے ڈرو[1]۔

آج کل کی دنیا میں، خاص کر انقلابی ممالک بالاخص ہمارے ملک (ایران) میں، جو اکیلے ہی دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں کھڑا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی آزادی کو تحفظ بخشے اور اپنے تمام وجود سے اسلامی اور انقلابی قدروں کی حفاظت کرے، افواہ پھیلانے والوں کا رواج ہے ۔ منافقین او رانقلاب دشمن عناصر، لوگوں کے آپسی اتحاد میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور انھیں انقلاب کے مقاصد اور نتائج سے میں بدظن کرنے کے لئے، افواہ ہیں گڑھتے ہیں اور کر انھیں نشر کرتے ہیں ۔

افسوس ہے کہ جب ناآگاہ لوگ ان افواہوں کو سنتے ہیں تو مخالف اغراض کے لئے ان افواہوں کو دست بہ دست پھیلاتے ہیں ۔ شاید وہ ان افواہوں کو نقل کرنے میں کوئی برا مقصد نہ رکھتے ہوں کوئی شخص کسی دوست کے پاس بیٹھ کر مختلف گفتگو کی بعد ایک افواہ کو بھی نقل کردے۔ انسان اگر افواہ کو نقل کرنے میں کوئی بُرا ارادہ حتی خودنمائی کا مقصد بھی نہ رکھتا ہو،پھر بھی اسے سوچنا چاہئے کہ اس خبر کو نقل کرنے میں کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں، اس کے علاوہ اسے سوچنا چاہئے کہ کیا اس افواہ کی کوئی بنیاد بھی تھی یا نہیں؟ شاید جس نے اس افواہ کو میرے لئے نقل کیا ہے، اس نے غلطی کی ہوگی یا کسی دوسرے نے وہ جھوٹی خبر اسے پہنچادی ہوگی لہذا ہمیں

[1] المیزان (دار الکتب الاسلامیہ ، طبع سوم)ج ۵، ص ۱۸

خبر کو پیش کرنے سے پہلے اس کی حقیقت کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے اور ہمیں دقت اور غور و خوض کے بعد خبر کو نقل کرنا چاہئے تا کہ اگر کوئی ہماری بات کو سنے ہم پر اطمینان کرے اور کہے کہ فلاں کی بات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں پایا جاتاہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ۔ صحیح ہے اور وہ سوچے سمجھے بغیر بات نہیں کرتا ہے۔انسان کو صحیح اور سوچ سمجھ کربات کرنی چاہئے تا کہ لوگ اس پر اعتماد کریں اور وہ لوگوں کے اعتماد کے سائے میں معاشرے میں بلند مقام حاصل کرے۔اگر کوئی معاشرے میں بلند مقام پانے کی فکر میں ہے اسے کوشش کرنا چاہئے کہ اس مقام کومعاشرہ میں اعتماد کے ذریعہ حاصل کرے اور اپنی ایسی حیثیت بنائے کہ لوگ اس کی رفتار و گفتار پر پوری طرح اعتماد کریں او رکہیں : فلاں بیہودہ باتیں نہیں کرتا ہے اس کی باتیں سچی اور صحیح ہوتی ہیں، ایسی حیثیت دنیوی اور اخروی لحاظ سے فائدہ مند ہے، کیونکہ دنیوی پہلو سے صداقت اور راست گوئی کے عنوان سے مشخص ہے اور اخروی لحاظسے بھی خدا کی خوشنودی اور بہشت کے بلند درجات کی صورت میں اس کا نفع ہو گا ۔

لہٰذا ہمیں کسی بھی بہانہ سے سنی سنائی باتوں کو نقل نہیں کرنا چاہئے۔یہی وجہ ہے کہ غور و خوض نہ کرنے کی وجہ سے ہم جو کچھ سنتے ہیں اس میں کچھ تصرف بھی کرتے ہیں یا ان میں کمی کرتے ہیں یااس میں کچھ بڑھادیتے ہیں، ہر صحیح اور درست مطلب کو بیان کرنا بھی صحیح نہیں ہے، ممکن ہے ایک سچی بات کو نقل کرنے میں مصلحت نہ ہو، ممکن ہے اس سے کسی کی آبرو خطرہ میں پڑجائے جو حرام او رناپسندیدہ ہے اور خدائے متعال کے غضب کا سبب بنے ، اس کے علاوہ بعض افواہیں ضعیف النفس اور سست ایمان افراد حکومت اور حکومت کے اراکین سے بدظن کرنے کا سبب واقع ہو لہٰذا بعض خبروں کو نقل کرتے وقت مصلحتوں کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ ہمیں فکر کرنی چاہئے کہ اس کا نقل کرنا کوئی فائدہ رکھتا ہے یا نہیں؟مخاطب خبر کو برداشت اور قبول کرنے کی ظرفیت رکھتا ہے یا نہیں؟اس کے علاوہ کیاوہ خبر کو دوسروں کے لئے نقل کرنے میں احتیاط اور دقت سے کام لیتاہے یا ہر جگہ ضرورت اور بے ضرورت نقل کرتاہے اور خبر کو کسی قسم کی کمی و بیشی کے ساتھ نقل کرتا ہے یا اسے کئی گنا بڑھاکر ہرایک کے لئے نقل کرتا ہے اور اس خبر کے نشر ہونے کے نتیجہ میں حکومت کمزور ہوگی، لوگوں کا حکومت کے بارے میں اعتماد ضعیف ہو جائے گا ۔

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں'' :یا اباذر؛ ما من شی ءاحقّ بطول السجن من اللّسان''' 'اے ابوذر !قید کی جانے والی اشیاء میں زبان سے زیادہ سزاوار کوئی چیز نہیں ہے' 'یہ بیان پیغمبر خداؐ کی طرف سے ایک دستور تربیت ہے جوانسان کوبات کرنے میں زیادہ سے زیادہ دقّت اور احتیاط کرنے اور زبان کو قید میں رکھنے کی تاکید کرتاہے تاکہ وہ بے جا بات نہ کرے ۔بعض علمائے اخلاق فرماتے تھے: خدائے متعال نے زبان کے سامنے دانتوں کو اور دانتوں کے سامنے ہونٹوں کو قرار دیا ہے، حقیقت میں ہونٹوں اور دانتوں کو خلق کرنا ایک اشارہ ہیکہ ہم ان کے پیچھے اپنی زبان کو قید کئے رہیں۔

دسواں درس

خدا کی عظمت وجلالت کے نمونے

خدا کی عظمت وجلالت کے نمونے ''یا اباذر؛ من اجلال اللہ تعالی اکرام ذی الشیبۃ المسلم و اکرام حملۃ القرآن العاملین واکرام السلطان المقسط.یا اباذر؛ لایزال العبد یزداد من اللہ بعدا ما ساء خلقہ''''اے ابوذر ! خدا ئے متعال کی عظمت و جلالت، سن رسیدہ مسلمانوں، قرآن حمل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں نیز انصاف پسند عادل و حاکم کے احترام میں مضمر ہے۔''،پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حدیث کے اس حصہ میں یاددہانی فرماتے ہیں کہ خدا کے بعض بندوں کا احترام کرنا خدا کا احترام کرنے کے برابر ہے۔دانا لوگ اپنی عقل کے ذوق کے مطابق کچھ مقاصد کے پیش نظر بسا اوقات ایک چیز کو دوسری چیز کی منزلت پر یا ایک کام کو دوسرے کام کی منزلت پر یا کسی ایک شخص کوایک دوسرے شخص کی منزلتکے طور پر بیان کرتے ہیں چنانچہ عام گفتگو کے دوران بھی کہا جاتاہے: یہ کام اس کام کے مانند ہے یہ شخص اس شخص کے جیسا ہے۔

یہ تشبیہ اس شباہت اور مشترک صورت کی بنیاد پر ہوتی ہے جو ''مشبہ'' اور ''مشبۃ بہ'' کے درمیان پائی جاتی ہے۔اس تشبیہ کی دلیل یہ ہے کہ جو خصوصیت کسی شخص یا چیز میں پوشیدہ ہوتی ہے و ہی خصوصیت کسی دوسرے شخص یا چیز میں نمایاں ہوتی ہے، پوشیدہ خصوصیت کو آشکار کرنے اور دوسروں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانے کے لئے اسے کسی ایسے با فضیلت شخص یا قابل اہمیت کسی کی طرف نسبت دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں جس کی خصوصیت بلند ترینمرتبہ کی حاملہے۔ہم معروف تشبیہات میں دیکھتے ہیں کہ ایک بہادر انسان کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے جبکہ شجاعت کا جو مرتبہ شیر میں پایا جاتاہے، وہ انسان میں نہیں ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ شیر کی نمایاں خصوصیت شجاعت ہے لہذا اس شخص کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے تا کہ اس کی پوشیدہ شجاعت کو پہچنوا یا جائے اور اس کی بہادری اور شجاعت مکمل طور پر دوسروں کے لئے نمایاں ہوجائے اور نظریں اس پر متوجہ ہو جائیں اور یہ دوسروں کی نظریں اس

پر متوجہ ہونابذات خود کچھ مقاصد کی حاملہیں۔ ہم قرآن مجید کی آیتوں اور روایتوں میں بہت سی ایسی تعبیریں پاتے ہیں کہ بعض افراد کی فضیلت خدائے متعال کی منزلت کے طور پر بیان کی گئی ہے یا بعض لوگوں کے کام خدا سے انجام پانے والے کاموں کے مانند بیان ہوئے ہیں، چنانچہ حاجتمندوں کو قرض دینے سے مربوط آیتوں میں، خدا کو قرض دینے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے، منجملہ : (من ذاالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ و لہ اجرٌ کریم[1]) ''کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کو دوگنا کردے اور اس کے لئے باعزت اجر بھی ہو''، یہ تشبیہ و تنزل اس حالت میں ہے کہ خدائے متعال بے نہایت حدتک تمام کمالات بلکہ بعض بزرگوں کے بقول غیر متناہی اور بے نہایت سے بالا تر کمالات کا مالک ہے۔ جو خدا کو پہچانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے اسے معلوم ہے کہ خدائے متعال غیر متناہی حد تک تصور کئے جانے والے تمام کمالات کا مالک ہے۔

پیغمبر اسلامؐاور ائمہ اطہارؑ کی ناشناختہ عظمت و منزلت:خدائے متعال کے علاوہ مخلوقات میں بھی اگر چہ ان کے کمالات محدود ہیں، لیکن بعض اوقات یہی کمالات اوران کی مقدار دوسروں کے لئے مجہول اور ناشناختہ ہے۔ خدا کے بزرگ ترین اور کامل ترین مخلوقات میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کی قدرو منزلت اوران کے کمالات کی وسعت دوسروں کے لئے ناشناختہ ہے، اس لئے عام انسان انھیں دوسرے لوگوں کی حد میں جانتے ہیں۔ حتی بعض انسان جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے تھے، خیال کرتے تھے کہ آپؐ دوسرے لوگوں کے مانند ایک انسان ہیں، صرف اتنا فرق جانتے تھے کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی: لیکن وہ نہیں جانتے تھے اور اس بات کو نہیں سمجھتے تھے آپؐ کا مقام دوسروں کے مقام سے کس قدربلند و برتر ہے:بامعرفت افراد کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور آپؐ کے مقام و منزلت کی بلندی کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہا ہے کہ آپؐ انبیائے الٰہی میں برترین، بلند ترین اور کامل ترین مقام و منزلت کے مالک ہیں اور بہترین شریعت آپؐ کی شریعت ہے۔ خدائے متعال نے آپ کو پیغمبرؐ مبعوث فرمایا اور آپؐ پر قرآن مجید نازل کیاکہ عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کریں اور خدا کے حکم

[1] الحدید/١١

سے قیام کریں اور لوگوں کی صحیح راستہ کی طرف ہدایت فرمائیں۔ لوگوں کی عقل و شعور کی مطابق استدلال و برہان کے ذریعہ انھیں خدائے متعال اور دنیوی و اخروی مصلحتوں سے آگاہ کریں اور ان کے دین کو مکل فرمائیں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص کی عقل کے لحاظ سے اس کے لئے دلیل و برہان پیش کرتے تھے او ر ان سے بات کرتے تھے تاکہ امت حقیقت سے آگاہ ہوجائے۔آپ اپنے دعوی کے ساتھ حجت و برہان بھی پیش کرتے تھے:(لیھلک من ہلک عن بیّنۃ و یحیی من حیّ عن بیّنۃ[1]) ''جو ہلاک ہو وہ دلیل کے ساتھ اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے ساتھ''۔

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں'': اختارہ من شجرۃ الانبیاء ومشکاۃ الضّیاء وذؤابۃ العلیاء وسرّۃ البطحاء ومصابیح الظّلمۃ وینابیع الحکمۃ[2]''پروردگار عالم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبروں (آل ابراہیم) کے شجرہ نسب سے، کہ جو روشن چراغوں (کہ جن سے ہدایت اور کامیابی کا نور چمکتا تھا)نیز مشہور اور بلند مرتبہ خاندانوں (کہ جو دوسروں سے اشرف و افضل تھے)اور سرزمین بطحاء (قابل فخر اور عظمت والی سرزمین ہے) اور، تاریکی کے چراغوں سے (آپؐ کے آباء و اجداد سرگرداں لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی کے چراغ تھے) اور حکمت کے سرچشموں (کہ سب دین و شریعت والے تھےاور دوسرے ان سے علم و حکمت سیکھتے تھے) سے منتخب فرمایاہے۔ایک اور جگہ فرماتے ہیں:آپ کی قیام گاہ بہترین قیام گاہ اور آپؐ کی پرورش کی جگہ بہترین جگہ ہے۔

کرامت و عظمت کے ٹھکانے او رسلامتی کی آرام گاہ ہیں،نیک لوگوں کے دل آپؐ کے شیدائی بن گئے اور ان کی آنکھیں آپؐ کی طرف خیرہ ہوگئیں، خدائے متعال نے آنحضرتؐ کی برکت سے پرانے اور دیرینہ کینوں کونابود کرکے دشمنی کی آگ کوخاموش کردیا اور مومنین کے درمیان الفت و دوستی ایجاد کی اور اپنے رشتہ داروں (حمزہ اور ابولہب کے مانند) میں دوری ڈال دی،آپؐ کے

[1] انفال/۴۱
[2] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۱۰۷، ص ۳۲۱

ظہور و پیدائش کی برکت سے مومنین کی ذلّت و بیچارگی عزت و سرفرازی میں اور کفار کی بزرگی بد بختی میں تبدیل ہوگئی[1]۔ خدا کے کلام کی بنیاد پر اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم او رائمہ اطہار صلوات اللہ علیہم سے جوروایتیں ہم تک پہنچی ہیں، ان سے خلاصہ کے طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ چودہ مقدس نور ایسے مقامات کے مالک ہیں کہ اگر تمام انسانوں کی عقلیں جمع کی جائیں تب بھی وہ ان مقامات میں سے ایک کو بھی درک نہیں کر سکتے، وہاں تک پہنچنے کی بات ہی نہیں ! یہ معرفت وشناخت ہمیں خدائے متعال کی عنایت سے اور قرآن مجید کی آیات اور روایتوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مقام اور عالی مرتبہ کے پیش نظر آپؐ خدا کی طرف سے بہترین رہنما ہیں۔

اور آپؐ نے اپنے بعد دوبڑی میراث، خدا کی کتاب اور اپنی عترت چھوڑی اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان سے منسلک رہیں تاکہ منحرف نہ ہو جائیں، جیسے کہ فرمایا ''انّی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی ما ان تمسکتم بھمالن تضلّوا ابدا وانّھا لن یفترقا حتی یردا علی الحوض[2]'' ''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خدا او رمیری عترت جو میرے اہل بیت علیہم السلام ہیںیہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔''

خدائے متعال کی اطاعت اور پیغمبرؐ و ائمہ اطہارؑ کی اطاعت کے درمیان رابطہ:پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مقام کو بیان کرنے والی آیتوں میں یہ آیہ شریفہ بھی ہے کہ خدا وند متعال نے فرمایا: (من یطع الرّسول فقد اطاع اللہ[3]) ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''اس آیہ شریفہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی وسعت کے بارے میں کوئی حدبیان نہیں ہوئی ہے، اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی حکم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیں اگرانسان اس کی اطاعت کرے تو اس نے خداوند متعال کی اطاعت کی ہے۔ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ اعلیہ وآلہ وسلم کی عصمت کی ایک دلیل

---

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۹۴، ص ۲۸۳
[2] بحار الانوار . ج ۲۳ص ۱۳۳
[3] نساء/۸۰

شمار ہوتی ہے، کیونکہ یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات ہمیں پیغمبر خداؐ کی بغیر چون وچرا اطاعت کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔اس کا معنی یہ ہے کہ آپؐ خدائے متعال کے حکم کے خلاف اور اس کی مرضی کے خلاف حکم نہیں دیتے ہیں، ورنہ اگر خدائے متعال ایک طرف سے اپنی اطاعت کرنے کا حکمدیتا اور دوسری طرف کسی ایسے کی اطاعت کرنے کا حکم کرتا جو خدا کے حکم کے خلاف ہے، تو اس میں تناقض و تضاد پیش آتا۔یہی برتری اور عظمت جو پیغمبر اسلام کے لئے ثابت ہے، آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہے اور ان کے مقام و منزلت اور عظمت کے پیش نظر ہی خدائے متعال نے ان کے لئے ''اولی الامر'' کا عنوان اطلاق کیا ہے: (یا ایہا الّذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول و اولی الامر منکم[1]'' (...ایمان والو!اللہ کی اطاعت کرواور رسول اور صاحبان امر (اوصیاء پیغمبرؐ) کی اطاعت کرو۔''

جابربن عبد اللہ انصاری کہتے ہیں: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول ! ہم خدا اور اس کے پیغمبرؐ کو پہچانتے ہیں، یہ اولی الامر کون ہیں کہ خدائے متعال نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے؟پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا '':اے جابر! وہ میرے جانشین اور میرے بعد مسلمانوں کے پیشوا ہیں۔''اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کرکے ائمہ کانام ذکر کیا، جب بارہویں امام عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف پر پہنچے تو اس کے بعد فرمایا: (ان میں سے بارہواں) وہ ہے جس کی کنیت اور نام میری کنیت اور نام پر ہے، وہ زمین پر حجت خدا ہے، خدا کے بندوں میں باقیماندہ حجت ہے، وہ حسین (علیہ السلام) کی نسل سے۔ یہ وہی ہے جس کے ہاتھوں خداوند متعال مشرق سے مغرب تک دنیا کو فتح کرے گا[2]۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت خدا کی اطاعت کے ہم پلہ ہونے کے سلسلہ میں ائمہ اطہار علیہم السلام میں ذات مقدس حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی شامل ہے، چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہر وہ کمال جو خدا کی مخلوقات میں

[1] نساء/۵۹
[2] بحار الانوار، ج۲۶، ص۲۵۰

ممکن ہے وہ یہ تمام معنی ان سب میں موجود ہے۔ خدائے متعال کی اطاعت کو ائمہ اطہار علیہم السلام کی اطاعت سے تشبیہ، اور یکسانیت کو بہتر انداز میں درک کرنے کے لئے مناسب ہے ہم زیارت جامعہ کبیرہ میں غور و خوض کریں تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ ان کے بلند مقام و منزلت اور ان کی محبت اور اطاعت کے ضروری ہونے کے بارے میں کیا فرمایا گیا ہے۔ ہم اسی زیارت میں پڑھتے ہیں ''من اطاعکم فقد اطاع اللہ و من عصاکم فقد عصی اللہ و من احبکم فقد احب اللہ و من ابغضکم فقد ابغض اللہ''۔ جس نے آپ لوگوں کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو آپ لوگوں کی نافرمانی کرے اس نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور جو آپ لوگوں سے محبت کرے اس نے خدا سے محبت کی ہے اور جو آپ لوگوں سے دشمنی اور عداوت روا رکھے اس نے خدا سے دشمنی کی ہے۔ یہی معنی مکمل طور پر ایام ماہ رجب کی دعامیں وارد ہوئے ہیں ''اللّھم انّی اسألک بمعانی جمیع مایدعوک بہ ولاۃ امرک'' ''خداوندا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں ان تمام معانی سے جن معنی میں تیرے صاحبان امر تجھے پکارتے ہیں'' یہاں تک فرماتا ہے ''لا فرق بینک و بینھم الا انّھم عبادک و خلقک''، ''تجھ میں اور ان (آیات) میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کے سوا کہ وہ تیرے بندے اور مخلوق ہیں۔''

ان میں کمالات الٰہی کے نمونے موجود ہیں، صرف فرق اس میں یہ ہے کہ ان کے تمام کمالات خدائے متعال سے ہیں اور خدائے متعال نے وہ کمالات انھیں عنایت کئے ہیں اور البتہ یہ فرق اور تفاوت بے نہایت سے بالاتر ہے، اگر چہ اہل بیت اطہار علیہم السلام تمام کمالات اور عظمتوں کے مالک ہیں، لیکن وہ کمالات بنیادی طور پر خدائے متعال سے ہیں اور وہ خود کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں۔ جب ان کا خدا کی دوسری مخلوقات سے موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات ان کے نیازمند ہیں، نہ صرف کوئی ان کی برابری نہیں کرسکتا ہے، بلکہ ان کے اور دوسروں کے درمیان بے نہایت تفاوت ہے۔

لیکن جب ان کا خدائے متعال سے موازنہ کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور خدائے متعال کے درمیان کسی بھی قسم کی نسبت نہیں پائی جاتی، کیونکہ وہ بالکل محتاج و فقیر ہیں، اور جس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا سے ہے۔ بہر صورت پیغمبر و اہل بیت

علیہم السلام کا مقام خدا کے مقام سے تنزیل وتشبیہ مکمل طور پر بجا ہے اور ہم ان کے مقام کو درک کرنے سے عاجز ہیں اور ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور ان کی محبت خدا کی محبت ہے اور ان سے دشمنی اور نافرمانی خدا سے دشمنی اور نافرمانی ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی شان میں فرماتے ہیں ''فاطمة بضعة منّی من سرّہا فقد سرّنی و من ساءہا فقد ساءنی، فاطمة اعزّ الناس علی[1]''''فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے، جس نے انھیں مسرور کیا اس نے مجھے مسرور کیا، جس نے اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ فاطمہ لوگوں میں میرے لئے عزیزترین ہے۔ ''کہا گیا کہ پیغمبر اسلام اور اہل بیت علیہم السلام کا مقام خدا کے مقام کے مانند بیان ہوا ہے، اسی طرح بعض افعال جو بعض لوگوں کے بارے میں انجام پاتے ہیں، دوسرے افراد کے ذریعہ انجام پانے والے افعال کے برابر بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کا ذکر خدائے متعال کے ذکر کے عنوان سے بیان ہوا ہے، خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:(فاذکرونی اذکرکم[2]) ''تم ہم کو یاد کرو تاکہ ہم تمھیں یاد رکھیں'' بیشک خدائے متعال تمام لوگوں کی یاد میں ہے اور کسی چیزاور شخص سے غافل نہیں ہے۔ لیکن آیہ شریفہ میں یاد سے مقصود شرف بخشنا اور وہ یاد ہے جو عنایت وانعام الٰہی کی ساتھ ہو۔ اگر کوئی چاہے کہ خدا اس کی یاد میں ہواور اس سے اپنی نعمت کو فروگزار نہ کرے تو اسے اس کی یاد میں رہنا چاہئے۔

اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ روایت میں اہل بیت کی یاد خدا کی یاد سے تنزیلتشبیہ دی گئی ہے:امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''ان ذکرنا من ذکر اللہ و ذکر عدونا من ذکر الشّیطان[3]'''' ہماری یا دخدا کی یاد ہے اور ہمارے دشمن کی یاد شیطان کی یاد ہے''اہل علیہم السلام کی یا د کو خدا کی یاد سے تنزیل و تشبیہ دی گئی ہے اس جہت سے ہے کہ وہ خدا کے خلفاء ہیں او راپنے لئے دا کے علاوہ کسی شان ومنزلت کے قائل نہیں ہیں، جب ہم پیغمبرؐ اور کسی امام کا نام سنتے ہیں تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ وہ خدا کے نمائندہ ہیں؟ اس بناپر ان کا نام سننا خدا کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے، اس لئے کہ ان کی یاد خدا کی یاد

[1] بحار الانوار ، ج ۷۵ص ۴۶۸
[2] بقرہ /۱۵۲
[3] بحار الانوار ، ج ۷۵، ص ۴۶۸

ہے۔ خدائے متعال نے اپنے مقام جبروت کو تنزیل و تشبیہ اور نمایاں کرنے کے لئے، اہل بیتؑ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے بلند مرتبہ پر فائز کیا لہٰذا وہ خدا کے لئے مکمل نمونے ہیں او رہر لحاظ سے حق کو مکمل طور پر منعکس کرنے کے آئینہ دار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آئینہ اپنی کسی چیز کو نہیں دکھاتا بلکہ جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اس کی جلوہ نمائی کا ایک وسیلہ ہے اور اس تصویر کو واضح طور پر منعکس کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم او ر اہل بیت عصمت و طہارتؑ بھی اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں رکھتے ہیں اور جو کچھ ان کی پاس ہے خدائے متعال سے ہے اور وہ خدائے متعال کو اچھی طرح سے منعکس کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر کہ ائمہ علیہم السلام حق کو مکمل طور پر نمایاں اور منعکس کرنے والے آئینہ ہیں اور تمام معنی میں ربوبیت کے جمال کا محور قرار پائے ہیں، یہاں تک اپنے وجود کے تمام رخ سے حق تعالی کے صفات کو نمایاں کررہے ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''کلّ علم لایخرج من ہذا البیت فہو باطل و اشار الی بیتہ و قال: علیہ السلام، لبعض اصحابہ: اذا اردت العلم الصحیح فخذ عن اہل البیت فأنّنا رویناہ و اوتیناہ و اوتینا شرح الحکمۃ و فصل الخطاب، ان اللہ اصطفانا و آتانا ما لم یؤت احداً من العالمین[1]'' ''جو بھی علم اس گھر سے نشر نہیں ہوگا، وہ باطل ہے یہ فرماتے ہوئے اپنے بیت الشرف کی طرف اشارہ کیا اور مزید اپنے ایک صحابی سے فرمایا: اگر صحیح علم کی تلاش میں ہوتو اہل بیت سے حاصل کرنا۔ بیشک ہم نے اس علم کو بیان کیا ہے۔ اور (آیات الہی میں پوشیدہ) حکمتوں کی شرح اور عدلیہ اور صحیح و عادلانہ فیصلوں کا علم ہمیں عطا کیا گیا ہے اور خدانے ہمیں منتخب کیا ہے اور جو کچھ ہمیں عطا کیا ہے کسی اور کو نہیں دیا ہے

''مومنوں کی عزت و احترام کی ضرورت: معصومین کے مقام کے علاوہ جب ہم ادنی درجے کے افراد پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے جو بھی ان سے بیشتر شباہت رکھتا ہے، یعنی خدا کی بندگی میں راسخ اور پختہ تر ہے اس نے اپنے وجود سے انانیت کے جذبے کو دور کرکے خود کو خدائے متعال کی عبودیت میں محو کر دیا۔ مختصر یہ کہ جس قدر انسان اپنی خود پسندی کو چھوڑ کر خدا کا بندہ بن

[1] بحار الانوار ، ج ۲۶، ص ۱۵۸

جائے اور جس حد تک اپنے آپ کو مستقل تصور نہ کرے، وہ اسی اعتبار سے خدا کی منزلت کی لیاقت رکھتا ہے، یہاں تک امام صادق علیہ السلام مومن کی زیارت کے بارے میں فرماتے ہیں ''؛من زارا خاہ فی اللہ.قال اللہ عز وجلّ: ایای زرت و ثوابک علیّ و لست ارضی لک ثواباً دون الجنۃ[1]'' ''جو خدا کے لئے اپنے مومن بھائی کی زیارت کرے، خدا نے فرمایا ہے: تم نے میری زیارت کی ہے اور اس کی پاداش میرے ذمہ ہے اور میں تمھارے لئے بہشت سے کم تر پاداش پر راضی نہیں ہوتا ہوں۔''ایک روایت میں آیا ہے کہ اگر ایک مؤمن خدا کی لئے اور کسی دنیوی غرض و درخواست کے بغیر ایک مومن بھائی کے گھر جائے تو خدائے متعال ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے تاکہ اس سے سوال کرے: تم کیوں یہاں آئے ہوا ور کیا کام ہے؟ وہ مومن جواب میں کہتا ہے: خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ اور اپنے مومن بھائی کے گھر آیا ہے تاکہ اس سے ملاقات کرے: فرشتہ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کو کوئی کام سپرد کیا تھا اور اب اس کی ضرورت ہے؟ جواب میں کہتا ہے: نہیں۔ فرشتہ پوچھتا ہے: پس اس کی ساتھ تمھارا کیا کام ہے اور کیوں یہاں آئے ہو؟ وہ مومن جواب میں کہتا ہے: میں اسے خدا کے لئے دوست رکھتا ہوں، اس لئے اس کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ پھر وہ فرشتہ خدا کی طرف سے اسے پیغام دیتا ہے کہ: اے بندہ !تم میری ملاقات کے لئے آئے ہوا اور میرے مہان ہو اور تمھاری مہان نوازی میرے ذمہ ہے۔

جی ہاں، جب ایک مومن خدا کی بندگی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، خود پسندی اور انانیت کو چھوڑتا ہے تو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ جہاں پر اس کی زیارت خدا کی زیارت شمار ہوتی ہے۔آیات و روایات پر تحقیق اور غور و خوض کرنے کے بعد ہمیں اس مضمون کی بہت سی آیتیں اور روایتیں ملتی ہیں کہ جن میں مومن کی زیارت اور اس کے احترام کو خدا کی زیارت اور اس کے احترام کے برابر بیان کیا گیا ہے۔ من جملہ اس روایت میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جناب ابوذرؓ کو نصیحت کے طور پر خدا کے بندوں میں سے تین گروہ کے احترام کو خدا کے احترام کے مانند بیان کرتے ہیں ۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اگر خدائے متعال کو

[1] بحار الانوار، ج ۷۴،ص ۳۴۵

دیکھتااور اس کا احترام کرتا، تو انسان کس بلند مقام پر پہنچ جاتا! البتہ ہمیں بندگی و عبادت کے مرحلہ میں خدائے متعال کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے، تب اس کی عبادت کریں، چنانچہ مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام نے فرمایاہے''بلم اکن باالذی اعبد ربالم اره[1]''''میں ایسا نہیں ہوں کہ بغیر دیکھے خدا کی عبادت کروں''مخلصانہ عبادت کرنے والا انسان کبھی خدا کی عبادت و بندگی کے دوران خدائی عظمت کے مقام پر فائز ہوجاتاہے، خدا کے بندوں کے ان تین گروہوں کا احترام کرنے والے کو بھی خدا کے احترام کے رتبوں میں قرار دیا گیا ہے:الف :سن رسیدہ مسلمان کا احترام:پہلا گروہ: وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عمر اسلام اور اس کے بلند احکام کی پابندی میں گزاری ہو او ر ان کی داڑھی اسلام کی راہ میں سفید ہو چکی ہو۔ اس گروہ کا احترام اور اس کی قدر کرنا گویا خدا کا احترام ہے۔ پس ہم نے ایک سن رسیدہ مسلمان کو دیکھا او راس کے مسلمان ہونے اور ایک طولانی عمر اسلام کی راہ میں گزارنے کے ناطے اس کا احترام کیا تو ہم نے خدا کا احترام کیا ہے۔

ہمارے لئے اس امر پر غور کرنے کا مقام ہے کہ خدا کے بندوں میں اس شائستہ اور مومن گروہ میں کیا خصوصیت ہے کہ انہوں نے یہ عظمت پائی ہے کہ ان کا احترام کرنا خدا کے احترام کے برابر ہے۔ شاید اس بوڑھے اور ریش سفید مسلمان کے لئے یہ تنزیل و تشبیہ اور موازنہ اس لئے کہ جب انسان اسے دیکھتا ہے تو اس کے چہرہ پر ایک طولانی مدت بندگی کا مطالعہ کرتاہے۔

اس کا نوارنی قیافہ، سفید ریش، خاص کر اگر پیشانی پر سجدہ کا نشان بھی ہو، یہ سب اس کی ایک عمر خدا کی بندگی کی حکایت کرتے ہیں: (...سیماہم فی وجوہہم من اثر السّجود[2]'''' (...ان کے چہرہ پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں''...خدا کی بندگی کی ایک عمر کو دیکھنا، ایک عمر خدائی کو دیکھنے کے برابر ہے، کیونکہ بندگی کا خدائی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جب ہم ایک عابد بندے کو دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک عمر عبادت میں گزاری ہے،توہم ایک عمر خدائی اور اس کے حکیمانہ تدبیر و رہنمائی کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں، اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ عبودیت و ربوبیت دوسرے تمام لازم و ملزومات مفاہیم کے مانند دو لازم و ملزوم مفهوم ہیں، جیسے باپ

---

[1] بحار الانوار ، ج ۴، ص ۲۷

[2] فتح/ ۲۹

بیٹے، جب انسان باپ کو باپ کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو لازمی طور پر اسے بیٹے کی یاد بھی آتی ہے۔ اسی طرح جب کسی کو بیٹے کے طور پر تصور میں لاتا ہے تو باپ کی یاد بھی آتی ہے۔ جب انسان ایک دل باختہ بندہ کی بندگی کی عمر کو دیکھتا ہے تو اسے خدائی عمر کی ایک یاد ذہن میں آتی ہے اور یہ وہی ربوبیت الہی اور عبودیت الہی کے درمیان ایک نسبت اور رابطہ ہے۔ اس لحاظ سے اس قسم کی تنزیل و تشبیہکے بارے میں بجاہے کہ کہا جائے: جب اس کا احترام کروگے تو گویا خدائے متعال کا احترام کیا ہے۔ نزول اور موازنہ کا معیار دونوں طرف وجہ مشترک کا موجود ہونا ہے، اب اس سے بہتر وجہ مشترک کیا ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کو نمایاں کرنے والا ہو، ایک تصویر کی مانند کہ جب تصویر پر نظر ڈالتے ہیں تو صاحب تصویر کی یاد آتی ہے۔ اس بوڑھے مسلمان نے ایک عمر عبودیت و بندگی کو اپنے قیافہ میں مجسم کیا ہے اور جب آپ اس کی بندگی کے آثار پر نظر ڈالتے ہیں تو خدا کی ربوبیت کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔

پس مذکورہ مطالب کے پیش نظر، اسلام میں سن رسیدہ او ربوڑھے افراد کا احترام اس قسم کی عظمت رکھتا ہے۔ البتہ سن رسیدہ خواتین کا احترام بھی اس زمرے میں آتا ہے، لیکن معاشرے میں معمولاً مرد، عمر رسیدہ مردوں سے اور عورتیں بوڑھی عورتوں سے ملاقات کرتی ہیں اور ان کے در میان احترام میں کوئی فرق نہیں ہے، مجموعی طور پر سن رسیدہ مسلمان افراد کا احترام خدا کے احترام کے برابر ہے۔یہاں پر مناسب ہے کہ اس نکتہ کی طرف ایک اشارہ کریں کہ بعض قدریں، جن کا اسلامی معاشرہ میں اعتبار ہے، غیر اسلامی معاشرے میں بھی ان کو محترم جانتے ہیں لیکن معیار مختلف ہیں۔

بزرگوں کا احترام ایک ایسی قدر ہے جو کم و بیش ہر معاشرے میں رائج ہے، لیکن جس معاشرے میں اسلامی اورالہی نظریہ نہیں ہے، وہاں پر اسی قدر آداب و رسوم کا حصہ مانا جاتاہے، وہاں پر سن رسیدہ افراد کے احترام کا کوئی ثابت او رصحیح معیار نہیں پایا جاسکتاہے۔ لیکن اسلام کے قابل قدر نظام میں اس قسم کی قدریں دوسروں کے نزدیک محترم قراردی گئی ہیں، لیکن معقول معیار او رثابت و پائدار بنیاد کے ساتھ۔ تمام معاشروں میں سن رسیدہ افراد کا احترام کیا جاتاہے، اسلامی نظام میں ایک مسلمان عمر رسیدہ کا

احترام خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک عمر خدا کی عبودیت میں بسر کر چکا ہے، لیکن یہ خصوصیت دوسروں کے وہاں بیان نہیں ہوئی ہے۔ پس توجہ کرنی چاہئے کہ اگر آیات و روایات میں ایسے اقدار کی بات کی گئی ہو جنھیں دوسرے نظاموں میں بھی قابل احترام جانتے ہوں، تو یہ اس معنی و مفہوم میں نہیں ہے اسلام میں شناختہ شدہ قدریں وہی ہیں جو دوسرے معاشروں میں اعتبار رکھتی ہیں، بلکہ ممکن ہے ان قدروں کا معیار اسلام میں بہت مختلف ہو، اسلام کے نزدیک ان قدروں کا معیار بہت بلند ہے۔ مذکورہ بیان شدہ مطالب کے پیش نظر ہمیں معلوم ہوا کہ سن رسیدہ لوگوں کا احترام کیا جانا چاہئے او رہر چھوٹے کو اپنے سے بڑے کا اس لحاظ سے کہ وہ بندہ ہے اور اس نے ایک عمر عبادت میں گزاری ہے احترام کرنا چاہئے، لیکن ایک مسلمان سن رسیدہ کا احترام خاص اہمیت رکھتا ہے اور خدا کے احترام کے برابر ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک مسلمان سن رسیدہ کے احترام کے اخروی نتائج او ررد عمل کے بارے میں فرماتے ہیں ''؛من وقّر ذاشیبۃٍ فی الاسلام آمنہ اللہ من فزعِ یوم القیامۃ[1]'' ''جو کسی مسلمان بوڑھے کا احترام اور عزت کرے گا، خدائے متعال اسے روز قیامت کے خوف سے نجات دے گا''حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسلمانوں کے ساتھ اس کی عمر کے مختلف مراحل میں برتاؤ کے بارے میں فرماتے ہیں ''؛اوصیکم ان تتخذوا صغیر المسلمین و لداً و اوسطھم اخاً و کبیرھم اباً۔ فارحم ولدک وصل اخاک وبرّ اباک[2]'' ''میں تجھے وصیتکرتا ہوں کہ مسلمان بچوں کو اپنا فرزند، جوانوں کو اپنا بھائی اور سن رسیدہ کو اپنا باپ قرار دو او ر(جس طرح اپنے گھر میں برتاؤکرتے ہو) مسلمانوں کے فرزند وں سے مہربانی، دینی بھائیوں سے برادری او ربزرگوں سے نیکی سے پیش آؤ''چونکہ دین اسلام، دین مودت او رمحبت ہے اور اسلام مہر و محبت کو ایجاد کرنے والادین ہے جو اپنے پیرؤں کو برادری و محبت کی دعوت دیتا ہے اور ان سے صمیمیت اور یکجہتی پیدا کرکے رنجش اور کینہ کو دور کرنے کا مطالبہ کرتاہے اور تقاضا کرتاہے کہ محبت آمیز باتوں سے رحمت الٰہی کے سایہ کو اپنے سر پر جاری رکھیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں ''؛من اکرم اخاہ المسلم بکلمۃ یلطفہ بھا

[1] بحارالانوار ، ج ۷، ص ۲۰۲ ۲۔
[2] مرتضی فرید ، الحدیث ، ج ۱،ص ۳۰۶

و فرج عنہ کربتہ، لم یزل فی ظل اللہ الممد ود علیہ الرحمۃ ما کان فی ذلک[1]'' ''جو اپنے مسلمان بھائی کا اپنی محبت آمیز باتوں کے ذریعہ احترام کرے اور اس کے غم کو دور کرے، توجب تک یہ عادت و خصلت اس میں موجود ہے وہ ہمیشہ خدا کے سایۂ رحمت میں ہوگا۔ ''پس ہمیں ان بزرگوں کا احترام کرنا چاہئے ، جنھوں نے ایک عمر اسلام میں گزاری ہے اور ان کی ڈاڑھی سفید ہو چکی ہے،حتی اگر ان کی معلومات ہماری معلومات کے برابر بھی نہ ہوں۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ ہماری عمران کی عمر کے برابر پہنچے گی یا نہیں، یا اگر ہم ان کی عمر تک پہنچے بھی معلوم نہیں اپنے دین کا تحفظ کر سکیں یا نہیں۔ کتنے ہی جوان گزرے ہیں کہ جوانی میں ہی ہدایت کی نعمت سے محروم ہوگئے اور کفر و عناد کے عالم میں اس دنیا سے گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں یہ انسان کہ جس نے دین کی حفاظت کرتے ہوئے ایک عمر گزاری ہے اور اسلام کو اپنے وجود میں تحفظ بخشا ہے، حقیقتاً احترام کا مستحق ہے، اگر چہ وہ علمی مفاہیم کے بہت سے اصولوں سے واقف نہیں ہے اور اس کا علم ہمارے برابر نہیں ہے۔ یہ گروہ اس قدر عظمت و شرافت کا حامل ہے کہ جس نے اسلام میں ایک عمر گزاری ہے ۔

ب۔ قرآن مجید کے حاملین اور اس پر عمل کرنے والوں کا احترام: دوسرا گروہ : قرآن مجید کے حاملین او ر اس پر عمل کرنے والوں کا ہے۔ پہلے درجہ پر ان کا احترام خدائے متعال کا احترام ہے کہ جو حافظ قرآن بھی ہیں اور قرآن مجید پر عمل کرنے والے بھی ہیں اور اس گروہ کے بعد ان کا احترام بھی خدائے متعال کا احترا م ہے جو حافظِ قرآن نہیں ہیں لیکن علوم قرآن کے عالم اور اس پر عمل کرنے والے ہیں، اسی طرح اگر قرآن مجید پر عمل کرنے والے نہیں تھے صرف قرآن مجید کے حامل تھے، پھر بھی وہ احترام کا ایک درجہ رکھتے ہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایاہے'':اشراف امتی حملۃ القرآن و اصحاب اللیل[2]'' ''میری امت کے بزرگ وبرتر افراد قرآن مجید کے حامل (حافظ) اور شب زندہ دار ہیں''اس روایت میں قرآن مجید

[1] بحار الانوار ، ج ۱۶، ص ۸۴
[2] بحا رالانوار ، ج ۸۷، ص ۱۳۸

کے حاملین کے لئے ایک خاص شرافت ثابت ہوتی ہے، لیکن ابوذر کی حدیث کے اس حصہ میں، اصل شرافت کے اثبات کے علاوہ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کا احترام خدا کا احترام ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ قرآن مجید پر عمل کرنے والے ہوں او ر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید کے حامل اور اس پر عمل کرنے والے ظاہر و باطن، گفتار و کردار میں ارادہ الٰہی کا جلوہ کلام الٰہی کے مظہر ہیں، انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کو بھی حفظ کیا ہے اور ان کے ذہنوں میں قرآن کے مفاہیم بھی محفوظ ہیں اور اصطلاح میں ان کے قوہ متخیلہ نے الفاظ کی صورت کو درک کیا ہے، ان کے قوہ عاقلہ نے اس کے مفاہیم کو اور قوہ عاملہ نے قرآن مجید کے حقائق کو عمل کی دنیا میں جلوہ گر کیا ہے، یعنی ان کا وجود سرتا پا خدائی اور قرآنی ہوچکاہے۔ جب ہم ان کے حافظہ پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ حافظ قرآن مجید ہیں، جب ان کے علوم پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن مجید کے حامل او راس کے مفاہیم کو حاصل کرچکے ہیں او رجب ہم ان کے عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کے مطابق عمل کرتے ہیں، اس لحاظ سے ان کا وجود قرآن مجید کا آئینہ ہے، یعنی ان کا وجود کمالِ خدا کا آئینہ ہے اور خدائے متعال نے اپنے کلام سے ان کے وجود میں ظہور کیا ہے، لہذا ان کا احترام خداوند متعال کا احترام ہے۔

قرآن مجید کے بلند مقام کے بارے میں پیغمبر اسلام فرماتے ہیں ''القرآن ہدی من الضلالۃ و تبیان من العمی و استقالۃ من العثرۃ و نور من الظلمۃ و ضیاء من الاحداث و عصمۃ من الھلکۃ و رشد من الغوایۃ وبیان من الفتن و بلاغ من الدنیا الی الآخرۃ و فیہ کمال دینکم و ما عدل احد عن القرآن الاّ الی النار[1]'' ''قرآن مجید گمراہی کے لئے ایک رہنما اور نابینا کے لئے بینائی اور نجات بخش ہے، لغزشوں کو بخشنے کا سبب او رہر تاریکی کے لئے نور اور روشنی ہے، حوادث میں نجات دلانے والا ہے، ہر ہلاکت سے بچانے والا اور ہر گمراہی میں رہنمائی کرنے والا ہے۔ ہر فتنہ وانحراف کو بیان کرنے والا او رانسان کو دنیا سے (پستی سے سعادت) آخرت کی طرف لے جانے والاہے اور اس میں تمہارے دین کا کمال ہے اور قرآن مجید سے کوئی شخص منہ نہیں موڑتا مگر یہ کہ اس نے جہنم کی طرف رخ کیا

[1] اصول کافی ج ۴، ص ۴۱

ہے'' قرآن مجید پر توجہ کرنے، اسے پہچاننے اور اسے ایک سعادت اور نجات بخش کتاب کی حیثیت سے منتخب کرنے کی ضرورت کے بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے'': من اخذ دینہ من کتاب اللہ و سنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم زالت الجبال قبل ان یزول و من اخذ دینہ من افواہ الرجال ردّتہ الرّجال[1]'' ''جو بھی اپنے دین کو خدا کی کتاب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت سے حاصل کرتا ہے وہ پہاڑوں سے مستحکم تر اور جو اپنے دین کو لوگوں کی زبانوں سے حاصل کرتا ہے، وہی لوگ اسے دین سے منحرف کردیں گے'' ایک اور جگہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن مجید اور اہلبیت علیہم السلام کے درمیان رابطہ کے بارے میں فرماتے ہیں'': انا اول رافد علی العزیز الجبار یوم القیامۃ و کتابہ و اہل بیتی، ثم امتی ثم اسالہم ما فعلتم بکتاب اللہ و اہل بیتی[2]''

میں پہلا شخص ہوں جو قیامت کے دن خدائے جبار کے حضور قرآن مجید اور اپنے اہلبیت کے ساتھ حاضر ہوگا، اس کے بعد میری امت (حاضر ہوگی) ، اس کے بعد میں پوچھوں گا: تم لوگوں نے خدا کی کتاب اور میرے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جو کچھ بیان ہوا، وہ اس لئے تھا کہ ہم جان لیں کہ قرآن مجید ، مادی و معنوی دونوں لحاظ سے، بابرکت رکھتا ہے اور انسان جس قدر اس سے زیادہ بہرہ مند ہوگا۔ قرآن مجید کی فضیلت اور عظمت اتنی ہی زیادہ ہوگی اس مضمون کی ایک روایت نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے معصوم سے سوال کیا: دوسرے لوگوں پر آپ کی فضیلت اور برتری کا سبب کیاہے؟ تو معصوم نے جواب میں فرمایا: دوسروں پر ہماری فضیلت اس لئے ہے کہ قرآن مجید کا علم ہمارے پاس ہے۔ پس ہمیں ہمیشہ قرآن مجید کی تکریم و تقدیس کرنی چاہئے اور قرآن مجید کو ہرگز دوسری کتابوں کی طرح نہیں دیکھنا چاہئے اور قرآن مجید کو دوسری تمام کتابوں پر فضیلت دینا صرف قلبی اعتقاد تک محدود نہ ہو، بلکہ قرآن مجید کے بارے میں ہماری رفتار دوسری کتابوں کے مقابلہ میں متفاوت ہونی چاہئے۔ ہمیں قرآن مجید کی نسبت قلبی احترام کے علاوہ اس کا ظاہری احترام بھی کرنا چاہئے یعنی ہماری ظاہری رفتار ، قرآن مجید کے ساتھ ہماری قلبی رفتار کا مظہر ہونا چاہئے ۔ بیشک قرآن مجید کے ساتھ ہماری یہی قابل تعظیم رفتار، ہمارے ایمان میں اضافہ کا سبب بنے گی۔

---

[1] اصول کافی ج ۴، ص ۴۱
[2] مقدمہ اصول کافی ، ص ۷

بعض بزرگان اس کمرے میں نہیں سوتے تھے، جس میں قرآن مجید ہوا کرتا تھا اور حتی اس کمرے میں قرآن مجید کے احترام میں پیر بھی نہیں پھیلاتے تھے۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اور شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ نے مرحوم شیخ محمد تقی آملی سے ایک داستان نقل کی ہے کہ مرحوم آملی نے ایک رات کو قرآن مجید کی تلاوت کے دوران انتہائی تھکاوٹ کی وجہ سے تکیہ سے ٹیک لگایا۔ دوسرے دن جب وہ اپنے استاد مرحوم میرزا علی آقای قاضی کہ علامہ طباطبائی اور دیگر بزرگوں کے بھی استاد تھے۔ کے پاس پہنچے تو استاد نے بغیر کسی مقدمہ کے فرمایا: قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اچھا نہیں ہے کہ انسان تکیہ سے ٹیک لگائے!جی ہاں، قرآن مجید کی تعظیم کے لئے اور معاشرے میں قرآنی ثقافت کو وسعت دینے کے لئے قرآن مجید کے حاملین کا اکرام کرنا چاہئے اور اگر ہم خود قرآن مجید کے حاملین میں ہوں تو دوسرے لوگ ہمارا بھی احترام کریں گے اور ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ چونکہ ہم خود قرآن مجید کے حامل ہیں، اس لئے قرآن مجید کے دوسرے حاملین کا احترام نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ایک شخص حامل قرآن ہو اور دوسرے حاملان قرآن کا احترام کرے ،چنانچہ سادات او راولاد رسول اللہ کا احترام تمام لوگوں من جملہ سادات پر واجب ہے۔

جب انسان ایک سید کودیکھتا ہے اسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم یاد آتے ہیں، اس لحاظ سے اس کا احترام کرنا ضروری ہے، حتیٰ اگر خود بھی سید ہو۔

ج۔باانصاف او رعادل حاکم کا احترام: تیسرا گروہ: تیسرا گروہ جن کا احترام کرنا خدا کا احترام کرناہے، عادل او ربا انصاف حکام ہیں۔ہم عادل حاکم کا احترام ضروروی ہونے کے موضوع پر بحث کرنے سے پہلے معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت اور حاکم کے شرائط پر بحث کریں گے:معاشرے میں حکومت اور قانون کی ضرورت: مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں ''؛ملک ''، سلطنت کے معنی میں ضروریات بدیہیہ میں سے ہے کہ انسان اس سے مستغنی نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کی بشر کو ابتدا میں ضروروت ہے،وہ اجتماع کی تشکیل ہے۔ معاشرے کے افراد کا ایک دوسرے سے ربط اور لگاؤ اس طرح سے کہ معاشرے کا ہر فرد دوسروں کے مقصد اور چاہت کے علاوہ اپنے لئے ایک مقصد اور ارادہ رکھتا ہے، نہ وہ معاشرہ جو کہ فرد فرد کے اعتبار

سے ایک دوسروں سے ربط وضبط کے بغیر ہوتا ہے، کیونکہ ایک ایک فرد مختلف مطالبات اور گوناگوں مقاصد رکھتے ہیں، اس لحاظ سے ان کی ایک دوسرے سے نہیں بنتی ہے، ہر فرد دوسروں کے ماحصل کو چُرا کران پر غلبہ پانا چاہتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو پائمال کرنا چاہتا ہے، جس کے نتیجہ میں معاشرے میں نا امنی پھیلتی ہے اور جس معاشرے کو زندگی کی سعادت کے تحفظ کے لئے تشکیل دیا گیا تھا اسے بد بختی و نابودی کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ معاشر اپنے لئے ایک قہر و غلبہ پانے والی طاقت فراہم کرے تا کہ تمام دیگر قوا اور توانائیوں کو اپنے کنٹرول میں قرار دے۔ تمام لوگوں کو اپنے فرمان کے تحت قرار دے اور نتیجہ کے طور پر دوسروں پر ظلم والی سرکش طاقتوں کو اعتدال میں لایا جائے۔ کمزور افراد کو بھی کمزوری اور سستی کے مرحلہ سے نجات دلاکر درمیانی حد تک پہنچادیں تاکہ سرانجام معاشرے کی تمام توانائیاں قوت و ضعف کے لحاظ سے برابر اور ایک دوسرے کے نزدیک ہوجائیں اور اس کے بعد ہر طاقت کو اس کی خاص جگہ پر معین کر دیا جائے، تو اس صورت میں ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے گا[1]''

واضح ہوا کہ انسان کی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے۔ اب یہ کہ کیوں اس کی زندگی اجتماعی ہے، کیا اجتماعی ہونا جبراً انسان پر مسلط ہے یا انسان کی فطرت پہلے سے اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے اور کیا کوئی عقلائی اور اختیاری عامل اجتماعی زندگی کے انتخاب میں موثر ہے یا نہیں؟ یہ وہ مباحث ہیں جن کے بارے میں فراواں بحثیں ہوئی ہیں، لیکن ہماری نظریہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے انتخاب میں عقلائی عامل مؤثر ہے، چونکہ انسان اجتماعی زندگی میں اپنے لئے منافع دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کی مادی و معنوی ضرورتیں اجتماعی زندگی کے بغیر یا اصلاً پوری نہیں ہوتی ہیں یا مطلوب صورت میں مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی ہیں، اس لئے وہ اجتماعی زندگی کو پسند کرتا ہے اور اس کے شرائط کو قبول کرتا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا لازمی نتیجہ معاشرے کے مختلف افراد کے منافع کے درمیان ٹکراؤ کا پیدا ہونا ہے۔ یعنی جب لوگ اجتماعی زندگی چاہتے ہیں اور آپس میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں ایک دوسرے کے

---

[1] المیزان ، ج ۳، ص ۱۴۴

ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس باہمی تعاون کے ما حصل کو آپس میں تقسیم کرتے ہیں، توان کے منافع اور خواہشات کے در میان ٹکراؤ پیدا ہوتاہے۔ بعض لوگ زیادہ سے زیادہ نفع کے در پے ہوتے ہیں اور الٰہی عطیوں اور نعمتوں سے لامحدود صورت میں فائدہ اٹھا نا چاہتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ برتاؤ کے طریقہ کو اپنی مرضی کے مطابق بر قرار کرنا چاہتے ہیں ا ور ان کا یہ رویہ دوسروں کو پسند نہیں ہوتا ہے۔ پس معاشرے میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے، کہ اس کو روکنے کے لئے حدود او رقوانین مرتب و معین کئے جانے چاہئے یہ بھی ایک بدیہی امر ہے اور اس کا واضح ہونا یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص انسان کی خواہشات خواہ مادی یا معنوی کے بارے میں تھوڑا سا غور کرے (جو اجتماعی زندگی سے مربوط ہے) تو وہ دیکھے گا کہ تمام افراد کی لا محدود خواہشات کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر انسان اجتماعی طور پر زندگی گزارنا چاہے تو اسے اپنی خواہشات کے لئے ایک حد معین کرنا چاہئے او رمن پسند طو رپر عمل نہ کرے۔

پس ٹکراؤ کو دور کرنے یا اسے کم کرنے کے لئے ہم حدود اور قوانین کے محتاج ہیں۔ اگر ہم اجتماعی زندگی میں افراد کے استفادہ کے لئے حدود کے قائل نہ ہو جائیں یا کچھ انسان ان حدود کی رعایت نہ کریں تو اجتماعی زندگی کا مقصد کہ انسان کے معنوی ومادی تکامل و ترقی کے لئے طبیعت کی نعمتوں سے استفادہ کرناہے حاصل نہیں ہوگا۔ پس اجتماعی زندگی اس طرح نظم و ضبط کے ساتھ گزارنا چاہئے کہ معاشرے کے تمام افراد کے لئے روز افزوں ترقی اور تکامل کے مواقع فراہموں۔ صرف اسی صورت میں اجتماعی زندگی کا مقصد صحیح معنوی میں پورا ہوسکتا ہے۔ اسلامی نظام میں، جو اسلامی اصول اور نظریات پر مبنی ہے، ضرورت ہے کہ قانون الٰہی ہو۔ اس امر کی دلیل وہ دعوی ہے جسے اسلام نے معاشرے کے امور کی تدبیر میں ایک ہمہ جہت مکتب کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہم بھی اسلام کے پیرو ہیں اور اس پر عمل کرنے کو عام سعادت کی ضمانت سمجھتے ہیں ہمیں گوناگوں مذاہب و مکاتب فکر کے مختلف رجحانات جنھیں دنیا کے اکثر ممالک نے کم و بیش قبول کیا ہے کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عقیدہ اور ارمانوں کا استدلال و تفکر کے اسلحہ سے دفاع کرنا چاہئے۔

صالح او رشائستہ حاکم کے شرائط:یہاں تک معاشرے میں حکومت اور قانون کے وجود کی ضرورت بیان ہوئی، اور چونکہ حکومت کی تشکیل او رقانون کا نفاذ حاکم کے وجود کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم امور حکومت کو سنبھالنے والے حاکم کے بعض شرائط کی طرف اشارہ کرتے ہیں:ا۔ شناخت قانون: جو شخص قانون کو نافذ کرنا چاہتا ہو، خواہ وہ قانون داخلی امن و سلامتی کے بارے میں ہو خواہ دفاع کے بارے میں یا بین الاقوامی تعلقات، یا دوسری چیزوں کے بارے میں اسے قانون اور ان اصولوں او رقدروں کے بارے میں جن پر وہ قانون استوار ہے، کافی شناخت و معلومات ہونی چاہئے۔

۲۔ تقویٰ : تقویٰ، اسلامی ثقافت میں ایک کلی شرط ہے اور عام لغت میں اسے ''فرضیہ شناسی'' کہتے ہیں۔ جو شخص معاشرے کے امور کا حاکم بن جاتاہے اور لوگوں کی مصلحتوں کو اپنے ذمہ سنبھالتا ہے، اسے ان کی مصلحتوں کو پورا کرنے کی فکر میں ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اقتدار پر پہنچنے کے بعد اپنے ذاتی مقاصد او ردنیوی خواہشات کو پورا کرنے کی فکر میں ہو،ایسی صورت میں اس قسم کا شخص لوگوں کے جان مال،کی حفاظت اور قانون نافذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ قانون کو اس کے بر خلاف اور اپنی خواہشات کے مطابق تفسیر و تاویل کرتاہے یا اسے نسخ کرتاہے اور بعض اوقات واضح طور پر اس کی مخالفت کرتاہے۔ پس حکومتی امور کو سنبھالنے والے کے لئے دوسری شرط اخلاقی اقدار سے برخوردار ہونا، یا قرآن مجید او راسلامی ثقافت کی اصطلاح میں صاحب تقویٰ ہونا ہے۔

۳۔ تجربہ کاری: جو بھی کسی کام کو انجام دینے کی ذمہ داری سنبھالے اس میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہونی اہئے،کیونکہ کسی شخص کے لئے صرف قانون کے بارے میں آگاہی رکھنا او رصاحب تقوی ہونا کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے کافی نہیں ہے،،بلکہ اس کام کے بارے میں مہارت او رتجربہ کاری کا بھی ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے مؤلین (اراکین) کو پیش آنے والے چھوٹے بڑے مسائل و مشکلات کو حل کر سکے۔اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ انسانی معاشرے ٹکراؤاور کشیدگیوں کو دور کرنے شخصی اور معاشرتی منافع کے بارے میں حدود معین کرنے اور بالاخر معاشرتی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے

قانون کے محتاج ہیں، اور اس کو صحیح طو رپر نافذ کرنے کے لئے او رباغیوں اور سرکشوں کودورکرنے کے لئے والی اور حاکم کے محتاج ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ولایت اور سرپرستی کا حق فقط خدائے متعال کوہے اور دوسرے اس کی اجازت سے لوگوں کے والی اور سرپرست ہوتے ہیں؟ یا بعض انسان بنیادی طور پر دوسروں پر ولایت و سرپرستی کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اس کے حواب میں کہا جاسکتاہے کہ کوئی بھی انسان دوسرے افراد پر ولایت و سرپرستی کا حق نہیں رکھتاہے، کیونکہ انسان اسی کی اطاعت کرتا ہے کہ جس سے اس نے اپنے وجود جیسی نعمت کو حاصل کیا ہے، چونکہ عام لوگوں نے نہ انسان کو ھستی عطاکی ہے اور نہ اس کے بقا او ردوام میں مؤثر ہیں اس لئے کسی کا حکم دوسری کے لئے واجب الاطاعت نہیں ہے۔ انسانوں کی عدم ولایت میں پہلی اصل افراد کی پیروی کی عدم ضرورت ہے۔ چونکہ انسان اپنی ھستی کی پوری حیثیت کو خدائے متعال سے حاصل کرتا ہے اس لئے اس پر واجب ہے، صرف اس کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کے علاوہ کسی اور کے حکم کی تعمیل کرنے میں یہ شرط ہے کہ وہ دوسرا خدائے متعال کی طرف سے معین ہونا چاہئے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خدائے متعال باطل ولایتوں کو، یعنی جن ولایتوں پر خداوند عالم نے دستخط نہیں کئے ہیں، مسترد کرتاہے: (یا ایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الیہود والنصاری اولیاء بعضہم اولیاء بعضٍ و من یتولّہم منکم فانّہ منہم ان اللّٰہ لا یہدی القوم الظالمین[1]) ''ایمان والو! یہودیوں او رعیسائیوں کو (کہ اسلام کے دشمن ہیں) اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جوکوئی انھیں دوست بنائے گاتو (کفر و ظلم میں) انھیں میں شمار ہو گا۔ بیشک اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔'' (جملہ '' ان اللّٰہ لایھدی القوم الظالمین'' اس پر دلالت کرتاہے کہ وہ ظالم ہیں اور ظالم کبھی ہدایت سے بہرہ مند نہیں ہوتا، ہرگز مقصد تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ متواتر راستہ میں ہی رہتا ہے۔ پس اگر تم لوگ بھی ان کے ہی زمرہ میں قرار پائے تو مقصد تک نہیں پہنچ پاؤگے) پرودگار عالم ایک دوسری آیت میں حاکم

[1] مائده /۵۱

بر حق کا یوں تعارف کراتا ہے: (انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین آمنوا الذین یقیمون الصلوۃ و یؤتون الزکوٰۃ و ہم راکعون[1]) ''ایمان والو! بس تمھارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول او روہ صاحبانِ ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں (تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آیہ شریفہ کے مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں ''پس معاشرے میں حکومت کی ضرورت کے پیش نظر اسلام میں جو شاہد پیش کئے گئے ہیں ا ور حاکم بر حق کے لئے جو شرائط ذکر ہوئے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے، کہ شخص معصوم کے حضور کی صورت میں (جیسے وجود مقدس روسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم او رمعصوم ائمہ علیہم السلام) وہی حکومت کا والی و سرپرست ہوگا اور فطری بات ہے کہ ایسی حکومت کا فی مطلوب اور مثالی ہوگی۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ ممکن نہیں ہے، حتی امام معصوم کے حضور کے زمانے میں بھی وہ صرف جس جگہ پر تشریف رکھتے ہیں، اسی شہریا صوبے کی حکومت چلا سکتے ہیں اور دیگر تمام شہروں میں اپنے کارندے اور عامل معین کرکے امور کی نگرانی اور نظارت کریں گے۔ عصر غیبت میں امام معصوم تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے، کسی کا اس منصب پر فائز ہونا ضروری ہے تا کہ اسلامی معاشرے کو قوانین الہی او راسلام کے اصولی کی بنیاد پر قیادت و رہبری کرے، اس کے حسب ذیل شرائطھیں۔

ا۔ اسلام کے بارے میں کافی آگاہی : چونکہ رہبری اور حکومت کی مؤلیت میں، قوانین اور اسلامی اقدار کی حفاظت مسلمانوں کے حاکم کے ذمہ ہے اور وہ دین، ناموس اور احکام خدا کا امانت دار ہوتا ہے، اس لئے ان تینوں شرائط یعنی: قانون کے بارے میں آگاہی، تقوی و اخلاقی صلاحیت اور حکومت چلانے کی اہلیت و قدرتکے سلسلہ میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ آگاہی اور مہارت رکھتا ہو۔ایک روایت کا مضمون یہ ہے کہ اگر ایک معاشرے میں کوئی شخص امامت و رہبری کو اپنے ذمہ لے لے، جبکہ دوسرے لوگ حتیٰ ایک آدمی بھی اس معاشرے میں اس سے داناتر و شائستہ تر موجود ہوں تا تو وہ معاشرہ ہمیشہ روبہ زوال ہوگا '':من امّ قوماً و فیھم من ہوا علم منہ او افقہ لم یزل امرہم الی سفالِ الی یوم القیامۃ[2]''

---

[1] مائدہ/۵۵
[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۲۶۶

۲۔ تقوی: رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے صلاحیت رہبری کی شرائط میں سے ایک شرط کہ جو اسے خدا کے حرام سے بچاتی ہے تقوی و پرہیز گاری بیان فرمائی ہے'' :ورع یحجزہ عن معاصی اللہ[1] ''امام حسین علیہ السلام ایک روایت میں معاشرے کی رہبری کے بارے میں اہل کوفہ کو لکھتے ہیں'':ما الامام الا الحاکم بالکتاب، القائم بالقسط، الدائن بدین الحق الحابس نفسہ علی ذات اللہ[2] '''' پیشوا اور امام نہیں ہے مگروہ جس کی حکومت قرآن مجید کی بنیاد پر ہو، عدل و انصاف کو قائم کرتا ہو اور دینِ حق پر پابند ہواور خود کو خدا کی راہ میں وقف کرے۔''

حضرت علی علیہ السلام عثمان سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں'':فاعلم ان افضل عباد اللہ عند اللہ امام عادل ہدی و ہدی فاقام سنۃ و معلومۃ و امات بدعۃ مجہولۃ... و ان شرّ الناس عند اللہ امام جائر ضلّ و ضلّ بہ فامات سنۃ ماخوذۃ و احیا بدعۃ متروکۃ[3] '''' جان لو! خدا کے نزدیک بندوں میں برترین شخص عادل اور نجات یافتہ پیشوا ہے جو ہدایت یافتہ رہنما ہو اور سنت اور معروف طریقہ (پیغمبر اکرمؐ) کو رواج دے اور باطل و غلط بدعت کونابود کرے۔ خدا کے پاس لوگوں میں سے بدترین شخص ظالم امام ہے جو خود گمراہ ہو اور دوسروں کوگمراہ کرنے کا سبب بنے، قبول کی گئی سنت کو نابود کرے او رچھوڑی ہوئی بدعت کو پھر سے زندہ کرے''

۳۔ تدبیر و مدیریت : تیسری شرط امور کو چلانے کی مہارت حسن تدبیر اور معاشرے کے امور کی مدیریت ہے۔ اسلامی حاکم کے لئے، رہبری کی توانائی اور معاشرے کو اسلام کے راستہ پر چلانے کی طاقت کا ہونا ضروری شرط میں شمار کیا گیا ہے اور اس خصوصیت کے لئے بہت سے مقدمات، تجربے، آگاہی اور عوامل کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اجتماعی امور کے بارے میں سیاسی تدبیر و دیانت میں اس حد تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کی مسؤلیت و ذمہ داری کو اسے سونپا جاسکتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ، ج ۸۸، ص ۸۸
[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۲۶۶
[3] نہج البلاغہ (ترجمہ شہیدی) خ ۱۸۳، ص ۱۷۳

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'' :ایہا الناس ان احق الناس بہذا الامر اقواہم علیہ و اعلمھم بامراللہ فیہ[1] ''لوگو! خلافت کا سزاوار وہ شخص ہے جو اس کام کے لئے تواناتر او رخدا کا حکم جاننے میں داناتر ہو۔ ''ولی فقیہ، صالح او رشائستہ ترین فرد :حاکم اسلامی کے لئے بیان کئے گئے معیار و صفات کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں شائستہ ترین فرد کی حکومت کی راہ اور مواقع فراہم ہیں، گزشتہ زمانہ میں ایسے اشخاص کے توسط سے حکومت اختیار میں لینا بہت بعید او ربعض اوقات ناممکن نظر آتا تھا، ایسی بخشیں بھی نہیں ہوتی تھیں او رصرف ''مرجع تقلید'' کا مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اس جہت سے اسلام کے ہمدرد اور مصلحت اندیش کچھ بزرگ تھے جو ''مرجع تقلید'' کے عنوان سے معاشرے کی بہترین خدمت انجام دینے والی فرد کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آج بحمدللہ صالح افراد کے ذریعہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے اسباب وسائل فراہم ہوئے ہیں اور اس عظیم اسلامی انقلاب او رشہیدوں کے مقدس خون کی برکت سے ایسے شرائط فراہم ہوگئے کہ اس نے ہمیں اسلامی نظام میں، رہبری (ولی فقیہ) کی نعمت سے سرفراز فرماکر ہم پر احسان کیا ہے۔ اس نعمت کی شکر گزاری کو صرف ولایت فقیہ کی اطاعت سے انجام دیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمین کی عزت و امت اسلامیہ کی وحدت و یکجہتی کا ضامن ہے۔

حضرت اما خمینی قدس اللہ نفسہ الزکیہ کی حیات میں ہم اس نعمت سے مستفید تھے او رآج بھی افسوس کہ اس عظیم نعمت سے محروم ہوئے ہیں لیکن اس کے با وجو خدائے متعال نے اپنی نعمت کو ہم پر جاری رکھتے ہوئے ولی فقیہ کے سایہ کو ہمارے سروں پر استمرار بخشاہے۔ ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاتے ہیں کہ امت کے ماہر اور داناافراد (خبرگان) نے امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے بہترین اورشائستہ ترین فرد یعنی حضرت آیت اللہ العظمی خامنہ ای مد ظلہ العالی کو ان کا جانشین منتخب کیا اور تمام لوگوں نے خوشی خوشی ان کی بیعت کی ہے اور امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام ساتھیوں نے کمال ہدلی و یکجہتی سے راہ امام کو ثبات بخشاہے اور بحمدللہ امور کو جاری رکھنے میں کسی قسم کی سستی او رخلل کا سامنا نہیں ہوا۔ ہم بارگاہ الہی میں دست بہ دعا ہیں کہ مؤلین

[1] نہج البلاغہ" فیض الاسلام" خطبہ ۱۶۳و ۵۲۶

کا یہ اتحاد و یکجہتی قائم و دائم رہے اور روز افزوں مستحکم اور پائدار تر ہو جائے تا کہ انقلاب اسلامی کی یہ کشتی رہبر معظم کی قیادت میں امن و مقصد کے مطلوب ساحل سے ہم کنار ہوجائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ و آلہ و سلم جناب ابوذر غفاری کو نصیحت فرماتے ہیں کہ قانون الٰہی کے مطابق اور عدل و انصاف کی بنیاد پر حکومت کرنے والے عادل حاکم کا احترام کرو اس لئے کہ اس کا احترام کرنا، خدا کا احترام کرنا ہے، خدا کی صفات میں سے ایک صفت حاکمیت ہے، کیونکہ اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم حاکم و مولا ہے اور خدا کا مولا ہونا اور حکومت الٰہی عملا خدا کے عادلانہ احکام میں ظہور پذیر ہے کہ اس خطیر اور عظیم ذمہ داری کی باگ ڈور حاکم اسلامی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

عادل مسلمان فرمانروا اور ولی امر مسلمین، جو قانون الٰہی کے مطابق حکم دیتا ہے، اور اسلامی معاشرہ میں احکام الٰہی کو نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور اہل بیت علیہم السلام کی ولایت کے ایک مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ ولایت الٰہی در حقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم او رائمہ اطہار علیہم السلام کو سپرد کی گئی ہے[1]۔ اور اس کا ادنی درجہ سلطان عادل اور ولی امر مسلمین کو سپرد کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کا احترام خدا کا احترام ہے۔

اس بنا پر بعض لوگوں کے تصور کے خلاف کہ سوچتے ہیں اسلامی حاکم کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اگر کوئی شخص خدا کے لئے اور اسلام و اسلامی نظام حکومت کے احترام کی نیت سے رہبر معظم اور ولی امر مسلمین کا کسی ذاتی غرض کے بغیر احترام کرے، اور اس کے احترام کی دلیل یہ ہوکہ ولی امر مسلمین اسلامی احکام کو نافذ کرتا ہے اور قرآن مجید کا مروج ہے تو اس کا یہ احترام قابل اہمیت ہے۔ اس مطلب کو ذکر کرنا میں اپنا فرض جانتا ہوں کہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد ولی امر مسلمین کے ہاتھوں جو بہترین اور شائستہ ترین سنتیں ہمارے ملک میں ایجاد ہوئیں وہ قرآن مجید کی قرائت اور حفظ کی سنّت کا احیاء اور زندہ کرنا ہے۔ آپ مشاہدہ فرمارہے ہیں کہ بعض اوقات ٹیلی ویژن چھوٹے چھوٹے کمسن اور نو عمر بچوں کو دکھاتا ہے کہ جو حافظ قرآن ہیں۔ ہم کبھی مشاہدہ کرتے

[1] یہ ولایت اور حکومت سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۵ ہیں واضح طور پربیان ہوئی جہاں پر خدائے متعال فرماتاہے: ''انّما ولیکم اللّٰہ و رسولہ والذین آمنوا''...

ہیں کہ ایک چھوٹی بچی جو ابھی اچھی طرح سے بات بھی نہیں کر سکتی ہے، قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ حفظ کر چکی ہے، وہ بھی عربی لہجہ میں! آپ کو یاد ہو گا کہ انقلاب سے پہلے ہمیں انتہائی محنت کرنا پڑتی تھی تا کہ لوگ حمد و سورہ کو صحیح پڑھ سکیں اور ''سین و صاد'' میں فرق کر سکیں، حتی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی حمد و سورہ کی تجوید سیکھنا مشکل امر تھا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں ایک ٦ یا ٧ سالہ بچی قرآن مجید کے ایک تہائی حصہ کو حفظ کر چکی ہے اور تجوید کے ساتھ ہم سے بہتر تلاوت کرتی ہے! کیا یہ قابل فخر و مباہات نہیں ہے؟ کیا جس نے اس سنت کو زندہ کیا ہے، اس کا احترام نہیں کرنا چاہئے؟ یقیناً ایسے شخص کا احترام خدا کا احترام ہے، قرآن مجید کا احترام ہے، پس ہمیں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہم ان احتراموں کی رعایت نہ کریں تو شعائر اسلامی نابود ہوجائیں گے۔ معاشرے میں دین کی بقا شعائر اسلامی کی بقا پر منحصر ہے۔ اگر یہ احترام کرنا عام ہو کر رواج نہ پائے اور لوگوں میں اس کی تشہیر نہ ہو تو آہستہ آہستہ یہ قدریں فراموش ہوجائیں گی اور یہ کفران نعمت ہوگا۔

ہم اس بڑی نعمت کو درک کرتے ہیں جسے خدائے متعال نے ہمیں عنایت کی ہے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے اور نظام اسلام کی رہبری کا احترام کرنا چاہئے۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس احترام کی قدر اس وقت ہے کہ جب طمع او رلالچ کی غرض سے نہ ہو، بلکہ فریضہ انجام دینے اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہئے اور اس لئے ہو کہ مسلمانوں کے قائد کا احترام، اسلامی نظام کا احترام ہے اور اسلام کا احترام خدا کا احترام ہے۔

گیارھواں درس

زبان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت اور

اس کے آفات کی مذمت" یا اباذر؛ ما عمل من لم یحفظ لسانہ.یا اباذر؛ لاتکن عیابا و لا مداحاً و لا طعاناً و لا ممارياً،یا اباذر؛لایزال العبد یزداد من اللہ بعدا ما ساء خلقہ""اے ابوذر! جو اپنی زبان کو کنٹرول نہ کرتا ،اس کا نیک کا م ضائع ہوجاتاہے۔ اے ابوذر! عیب جوئی ،بے جا تعریف، جھگڑالو،اور طنز گوئی کے مرتکب نہ ہونا ۔ اے ابوذر !جب تک انسان بد اخلاق رہتاہے خدائے متعال سے دور ہوتا ہے۔" پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ زبان سے مربوط ہے۔ (جیسا کہ ملاحظہ ہو رہا ہے کہ یہ فقرے موضوع کے لحاظ سے پہلے او ربعد والے جملوں سے کوئی ربط نہیں رکھتے ہیں، لگتا ہے کہ نقل میں آگے پیچھے ہوگئے ہیں اور ان فقروں کا ذکر زبان سے متعلق نصیحتوں کے بعد آنا چاہئے تھااس سے پہلے جملہ ان من اجلال اللہ ذکر کیا گیا ہے میرے خیال میں لگتا ہے کہ جملہ ان من اجلال اللہ کو نقل کرنے میں مقدم کر دیا گیا ہے)اعمال کا ایک دوسرے کے مقابل اثر یا احباط و تکفیر:ان بیانات میں،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گفتگو کرنے میں احتیاط کی اہمیت کو ایک دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔

یہ اس جہت سے ہے کہ انسان اپنی زبان کو کھلی ڈھیل نہ دے کہ جو جی چاہے بول دے اور جو زبان پر آئے بک دے بلکہ زبان پر تالا لگائے اور فکر کرے۔ چونکہ انسان کے لئے بات کرنا،بہت آسان ہے، کبھی معمولی اور چھوٹے اغراض بھی زیادہ باتیں کرنے اور دوسروں کی بدگوئی کرنے کا سبب بنتے ہیں۔بزرگان دین نے کوشش کی ہے کہ مختلف تعبیروں اور طریقوں سے ہمیں اس بات کی تاکید کریں کہ ہم اپنی زبان کے بارے میں ہوشیار رہیں اور اسے آزادنہ چھوڑیں ۔ انھیں تعبیرات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ نصیحت بھی ہے کہ جس نے اپنی زبان کو کنٹرول نہیں کیا اس نے کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے۔ شاید اس بات میں یہ نکتہ پوشیدہ ہوکہ زبان انسان کی روح میں ایسے شر پسند عناصر کو جنم دیتی ہے کہ جوانسان کے تمام اعمال کو نابود کردیتے ہیں چونکہ آیات و

متواتر روایات میں آیا ہے کہ انسان کے اعمال ایک دوسرے میں اثر ڈالتے ہیں، کبھی انسان ایک فعل انجام دیتا ہے لیکن اس کے بعد جو فعل انجام دیتا ہے وہ پہلے والے فعل کی خاصیت کو بدل کے رکھ دیتا ہے اور اس میں ایک ایسا اثر ڈالتا ہے کہ اس کا اپنا اثر نابود ہوتاہے، خواہ وہ اثر اچھا ہو یا بُرا ۔ علم کلام کی کتابوں میں ''احباط و تکفیر'' کے عنوان سے ایک بحث پیش کی گئی ہے ۔ ''حبط'' نیک کاموں کے بے اثر ہونے کے معنی میں ہیں ۔یعنی انسان کے بُرے کام اس کے اچھے کام کو حبط و ضائع کردیتے ہیں اور انھیں بے فائدہ اور بے نتیجہ کرڈالتے ہیں.اور ''تکفیر'' گناہوں کی تلافی کے معنی میں ہے اور یہ اچھا اور پسندیدہ عمل ہے،اور پہلے والے کام کے نقص کی تلافی کرتا ہے ۔

چونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد ایمان وکفر پر ہے، لہذا ''احباط و تکفیر'' کے واضح ترین مصداق ایمان و کفر ہیں:انسان جو گناہ اور بُرے اعمال کے بعد ایمان اور صالح عمل انجام دیتا ہے، وہ اپنے گزشتہ کفر و ناشائستہ عمل کی تلافی کرتا ہے اور روشن نور کی طرح گزشتہ کی تاریکیوں کو زائل کردیتاہے اور اس کے بر عکس کفر اور ناشائستہ اعمال، گزشتہ نیک اعمال کو نابود کرکے رکھ دیتے ہیں اور انسان کے ریکارڈ کو سیاہ اور اس کے انجام کو تباہ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ خرمن میں لگی آگ کی طرح سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے ۔دوسرے الفاظ میں، ایمان اس نوارنی چراغ کے مانند ہے جو دل اور روح کے گھر کو روشن اور منور کر دیتا ہے اور تاریکیوں اور سیاہیوں کونابود کر دیتا ہے اور کفر اس چراغ کے بجھنے کے مانند ہے کہ جس کی وجہ سے تمام روشنی ختم ہو جاتی ہے اور تاریکیاں پھیل جاتی ہیں ۔ جب تک انسان کی روح اس تغیر ہونے والی شئ سے تعلق رکھتی ہے ہمیشہ روشنی و تاریکی ، نور و ظلمت کی کمی بیشی سے دوچار ہوتی رہتی ہے،یہاں تک اس دنیا سے رخصت ہوجائے اور اس پر ایمان و کفر کو انتخاب کرنے کی راہ بند ہوجائے ، پھر جس قدر بھی دوبارہ اس دنیا میں آکرتاریکیوں کو دور کرنے کی آرزو کرے گا، کوئی فائدہ نہیں ہوگا : (حتی اذا جاء احد ہم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انہا کلمة ہو قائلہا و من وراءہم برزخ الی یوم یبعثون[1]) ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آگئی

[1] مؤمنون /۹۹و۱۰۰

تو کہنے لگا کہ پروردگار مجھے پلٹا دے، شاید میں اب کوئی نیک عمل انجام دوں (ان سے کہا جائے گا) ہرگز نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جو یہ کہہ رہا ہے وہ حسرت کی بنا پر اور اس کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے' 'قرآن مجید کے نقطۂ نگاہ سے ایمان و کفر کے درمیان اس تاثیر وتأثّر میں کسی قسم کے شک اور تذبذب کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مطلب کی دلالت میں فراوان آیتیں موجود ہیں، من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے: (ومن یؤمن باللّٰہ و یعمل صالحاً یکفر عنہ سیئاتہ[1]) ''اور جو اللہ پر ایمان رکھے گااور نیک اعمال انجام دے گا، خدا اس کی برائیوں کو دور کرے گا''ایک اور جگہ پر فرماتا ہے: (ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت و ہو کافر فاولئک حبطت اعمالہم فی الدنیا و الآخرۃ و اولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون[2]) ''اور تم ہی سے جو اپنے دین سے پلٹ جائے اور کفر کی حالت میں مرجائے اس کے سارے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہوجائیں گے اور وہ جہنمی ہوگا اور وہیں ہمیشہ رہے گا''

ایمان و کفر کے درمیان جیسا رابطہ اجمالی طور پر نیک و بد کاموں میں بھی موجود ہے، لیکن کلی طور پر اور ایسا نہیں کہ انسان کے نامہ اعمال میں ہمیشہ یا نیک کام درج ہوں گے اور اس کے گزشتہ بُرے اعمال نابود ہوجائیں گے یا بُرے کام محفوظ ہوں گے اور اس کے گزشتہ نیک اعمال نابود کردیئے جائیں گے، بلکہ اعمال کے بارے میں تفصیل کا قائل ہونا چاہئے، اس معنی میں کہ بعض نیک اعمال اگر قابل قبول اور شائستہ صورت میں انجام پائیں گزشتہ برے اعمال کے آثار کو نابود کردیتے ہیں، جیسے توبہ اگر مطلوب صورت میں انجام پائے، توانسان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے: (ومن یعمل سوءاو یظلم نفسہ ثمّ یستغفر اللّٰہ یجد اللّٰہ غفوراً رحیماً[3]) ''اور جو بھی کسی کے ساتھ برائی کرے گا یا اپنی نفس پر ظلم کرے گا اس کے بعد توبہ و استغفار کرے گاتو خدا کو غفور و رحیم پائے گا''مزید فرماتا ہے: (والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروااللّٰہ فاستغفروا لذنوبہم و من یغفر الذنوب الا اللّٰہ ولم یصرّوا علی ما فعلواوہم

---

[1] تغابن/۹
[2] بقرہ/۲۱۷
[3] نساء/۱۱۰

یعلمون[1]) ''نیک لوگ وہ ہیں کہ جب کوئی نمایاں گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرکے اپنے گناہوں پر ستغفار کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون گناہوں کا معاف کرنے والاہے اور وہ اپنے برے عمل پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے اس لئے کہ گناہ کی پلیدی سے آگاہ ہیں''پس توبہ بالکل نور کی شعاع کے مانند ہے جو درست تاریکی کے نقطہ پر چمکتی ہے اور اسے روشن کرتی ہے۔ پس ایسا نہیں ہے کہ ہرنیک عمل تمام گناہ کے اثر کونابود کردے،اس لحاظ سے ممکن ہے مومن شخص ایک مدت تک گناہ کے عذاب میں گرفتار رہے اور سرانجام ہمیشہ کے لئے بہشت میں داخل ہوجائے۔گویا انسان کی روح کے مختلف اور گوناگوں رخ ہیں اور نیک و بد اعمال کا ہر مجموعہ ان کے ایک پہلو سے مربوط ہوتاہے۔

مثلا جو نیک عمل کا پہلو ''الف'' سے مربوط ہے، وہ ''ب''کے پہلو سے ربط رکھنے والے گناہ کے اثر کو نابود نہیں کرسکتا،مگر یہ کہ عمل صالح اس قدر نوارنی ہو کہ روح کے دوسرے جوانب پر بھی سرایت کرے،یا گناہ اس قدر آلودہ کرنے والاہو کہ روح کے تمام رخ کو بھی آلودہ کردے۔ مثلاً نماز کے بارے میں قرآن مجید میں آیاہے:(وأقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا من اللّیل ان الحسنات یذہبن السیئات[2]) ''اوراے پیغمبر !آپ دن کے دونوں حصہ میں اور رات گئے نماز قائم کریں بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کردینے والی ہیں''عاق والدین اور شراب نوشی جیسے بعض گناہ ایکحد (مدت) تک عبادت کے قبول ہونے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شراب نوشی کے نامطلوب اثر کے بارے میں فرماتے ہیں'':اقسم ربّی جل جلالہ فقال: لایشرب عبدلی خمرا فی الدنیا الا سقیتہ یوم القیامہ مثل ماشرب منہا من الحمیم...[3]'' ''میرے پروردگار نے قسم کھائی اور فرمایا: میرا بندہ دنیا میں شراب نہیں پیتا ہے مگر یہ قیامت کے دن اسے اسی مقدار میں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جتنی کہ اس نے شراب پیہے۔'' مناسب ہے اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ نیک و بد اعمال،بعض اوقات خوشی و غم یا توفیق او رسلب توفیق جیسے اور دوسرے

[1] آل عمران /۱۳۵
[2] ہود/۱۱۴
[3] بحار الانوار ، ج۷۶، ص۱۲۶

امور میں اسی دنیا میں مؤثر ہوتے ہیں، چنانچہ دوسروں کا احسان، خاص کر ماں باپ اور رشتہ داروں کا احسان عمر کے طولانی ہونے اور آفات و بلیات سے دور ہونے کا سبب ہے۔ اسی طرح دوسروں کی بے احترامی خاص کر استاد کی بے احترامی، سلب توفیق کا باعث ہے۔ جی ہاں، بعض اوقات نیک کام، گزشتہ برے کاموں کی تلافی کرتے ہیں اور کبھی برے کام گزشتہ نیک اعمال کونابود کر دیتے ہیں۔ جب تک انسان اس دنیا میں ہے اس کے اعمال میں یہ تاثیر و تاثرات موجود ہیں۔ بعنوان تشبیہ، انسان کے دل و روح کا گھر ایک کمرے کے مانند ہے، کبھی وہ کمرہ تاریک ہے اور ایک نور روشن ہوتاہے اور اس کی تاریکی کو ختم دیتا ہے اور کبھی وہ کمرہ روشن ہے اور ہوا کا ایک جھونکا آتاہے اور اس چراغ کو بجھا دیتاہے۔

پس جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ تحولات اور تغیرات پیش آتے رہیں گے اور ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی نیک کام انجام دیا اس کا اثر ابد تک باقی رہے گا، بلکہ ممکن ہے ایک ناشائستہ عمل سے اس کا اثر ضائع ہو جائے. پس اعمال کا ایک دوسرے پر اثر ڈالنا ایک کلی قاعدہ ہے کہ اس کی بنا پر بعض گناہ گزشتہ نیک اعمال کے اثرات کونابود کر دیتے ہیں یا حتیٰ آئندہ انجام پانے والے نیک کام کے قبول ہونے میں رکاوٹ بنتے ہیں چنانچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ بعض گناہ اس بات کا سبب ہیں کہ انسان کا نیک عمل اور اس کی نمازیں چالیس روزتک قبول نہ ہوں'': من اغتاب مسلما او مسلمۃ لم یقبل اللہ تعالی صلاتہ و لا صیامہ اربعین یوماً و لیلۃ الا ان یغفر لہ صاحبہ'' ''جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرے، چالیس دن رات تک خدائے متعال اس کی نماز وروزے قبول نہیں کرتاہے، مگر جس کی غیبت کی ہو وہ اسے بخش دے۔[1]''

یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے'': اطب کسبک تستجاب دعوتک فان الرجل یرفع اللقمۃ الی فیہ حراما ''فا تستجاب لہ دعوۃ اربعین یوما[2]'' ''اپنے کسب و معاش کو پاک کرتا کہ تمھاری دعا قبول ہو، بیشک انسان جب لقمہ حرام کھاتاہے تو چالیس دن تک اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے ''یا شراب نوشی کے بارے میں فرمایاہے'': من شربھا لم تقبل لہ صلاۃ

[1] مستدرک الوسائل ، ج ۹، ص ۱۲۲
[2] مستدرک الوسائل، ج ۱، ص ۱۶۶

اربعین یوماً[1]؛ ''شراب پینے والے کی نماز چالیس روز تک قبول نہیں ہوتی ''حدیث کے اس حصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا مضمون یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی زبان پر قابو نہ پائے اور جو زبان پر آئے اسے کہہ ڈالے تو کوئی عمل اس کے لئے باقی نہیں بچے گا، یعنی انسان کی زبان میں ایسا اثر ہے کہ انسان کے تمام گزشتہ اعمال کو نابود کردے ۔ یہ انسان کے لئے ایک انتباہ ہے کہ منہ میں موجود اس چھوٹے سے گوشت کے ٹکڑے کو معمولی نہ سمجھے اور بات کرنے سے پہلے اس پر غور کرے اور دیکھ لے کہ جس بات کو کرنا چاہتا ہے اس کا کیا اثر ہوگا، کیا خدا اس سے راضی ہے؟ کیا اس کی یہ بات انسان کی روح پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا بُرا اثر؟ اس کلی نصیحت کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زبان کے بعض گناہوں کو بیان فرماتے ہیں۔

طبعی طور پر زبان کے بعض گناہوں کا ذکر اس کے اس فراوان نقش کے پیش نظر ہے جو وہ انسان کی ہویت میں تغیر پیدا کرنے اور اسے گرانے میں رکھتے ہیں اس کے علاوہ اس لئے بھی ہے کہ انسان کے لئے ہمیشہ اس سے آلودہ ہونے کا خطرہ ہے ۔ دوسروں کی عیب جوئی کی مذمت: بُری صفتوں میں سے ایک صفت، جس کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر فرمایا ہے، دوسروں کی عیب جوئی کرنا ہے ۔ بیشک عیب جوئی ایک ناپسندیدہ اور غیر شائستہ عادت ہے ۔ دشمنی اور حسد کی وجہ سے لوگوں کے عیب اور لغزشوں کی جستجو کرنے اور پھر انھیں بر ملا کرنے کو عیب جوئی کہتے ہیں اور انسان اس کام سے لذت محسوس کرتا ہے ۔ آیات و روایات میں اس پست خصلت کی سرزنش کی گئی ہے،

ہم ان افراد کی تحقیق کریں گے جو مسلمانوں کی عیب جوئی کرکے انھیں رسوا کرنے کے در پے تھے، یہ خبیث ترین اور بدترین لوگ ہیں، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لہم عذاب الیم فی الدنیا والاخرۃ[2]) ''جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ صاحبان ایمان میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں

[1] بحارالانوار ، ج ۷۶، ص ۱۲۶
[2] نور/۱۹

بھی۔ ''اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں'' :من اذاع فاحشۃ کان کمبتدئھا و من عیّر مومناً بشیء لم یمت حتی یرتکبہ[1]'' ۔ ''جو شخص کسی کے ناشائستہ عمل کو ظاہر او رنشر کرے وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے خود اس نے وہ عمل انجام دیاہے اور جو شخص کسی مومن کواس کے عیب کی وجہ سے سرزنش کرے گا وہ شخص تب تک نہیں مرے گا جب تک اسی عیب کا مرتکب نہ ہوجائے گا''

منجملہ محرکات جوانسان کو دوسروں کی عیب جوئی کرنے پر مجبور کرتے ہیں احساس کمتری ہے۔جب انسان میں کوئی کمی ہوتی ہے اور حقیر اور پست ذہنیت کا مالک ہوتا ہے اپنے دل میں اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ دوسروں کے کما لات کو دیکھ کر برداشت کرے، اس لئے کوشش کرتاہے کہ دوسروں کی شخصیت کو داغدار بنائے اوران کے کمالات کو کم کرکے پیش کرے۔ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں میں کوئی کمزور نکتہ پیدا کرے تاکہ اسے لوگوں میں پیش کر سکے۔ جب بھی کسی کی بات چھڑتی ہے، بجائے اس کے کہ اس کی زندگی کے مثبت نکات بیان کرے اس کے عیب بیان کرتاہے۔

جب ایک مجلس میں کسی مومن کانام لیاجاتاہے کچھ افراد اسلامی آداب و تقوی کی بنا پر کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اچھے او رپسندیدہ صفات کو بیان کریں او راس کے مقابلہ میں کچھ افراد اپنے ایمان کی کمزوری، حسد اور احساس کمتری کی بناپر اس کے کمزور اور منفی نکات،اس کی لغزشوں اورکوتاہیوں کو بیان کرتے ہیں۔ حتی کبھی اس سے بڑھ کر مشکوک اور مشتبہ امور کی اس کی طرف نسبت دے کر اسے یقین کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور بعض اوقات تہمت لگانے سے بھی فروگذاشت نہیں کرتے۔یہ ایک بری خصلت ہے کہ انسان دوسروں کے ضعف کو ذکر کرنے کی کوشش کرے۔افسوس ہے کہ اس آفت میں مبتلا افراد فراواں ہیں او رہر ایک اپنے آپ کی آزمائش کرسکتاہے کہ جب کسی مومن بھائی یادوست کانام لیاجاتا ہے، خاص کر اگر اس مومن کے ساتھ اس کی رقابت ہے، وہ مختلف طریقوں سے دوسروں کویہ سمجھانے کی کوشش کرتاہے کہ فلاں شخص میں یہ یہ عیب موجود ہیں!فطری طور پر انسان کو دیکھنا چاہئے کہ جب کسی شخص کانام لیاجاتاہے توکیاوہ اس کی نیک صفات بیان کرکے دوسروں کے سامنے اس کی ستائش کرتاہے

---

[1] بحار الانوار،ج۷۳ص۳۸۴

اور لوگوں کی نگاہوں میں اسے محترم بیان کرتاہے، یا جب کسی کانام لیا جاتاہے تو اس کی بری صفتیں بیان کرکے اسے حقیر بناکرپیش کرتاہے۔ یہاں انسان میں ایک بہت بڑی کمزوری اور اس کا سرچشمہ ،جیسا کہ بیان ہوا، حسد اور احساس کم تری ہے یعنی دوسرے فلاں صفات کے مالک کیوں ہیں وہ اس پر وہ رنجیدہ ہے اور برداشت نہیں کرتاہے کہ دوسرے مالدار ہوں او روہ اس سے محروم رہے۔ ہمیں توجہ رکھنی چاہئے کہ بہت اچھا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو کہ مومن کانام لیتے وقت اس کی خوبیوں کو شمار کرے، اگرچہ بعض اوقات شرائط او رمحرکات کاتقاضا ہوتاہے کہ انسان دوسروں کے عیب ذکر کرے، مثال کے طور پر انسان مشاورت کی ذمہ داری انجام دیتاہے، ایسی حالت میں اگر کوئی کسی کے بارے میں بہ طور تحقیق پوچھ رہا ہے تو یہاں پر اسے اس کا عیب بتانا ضروری ہے، البتہ ایسے موقع استثنا ہیں۔

دوسروں کے پاس مال یا کسی اور صفات کے پائے جانے سے ہمیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے اور ہمیں جاننا چاہئے کہ مومن کا اصل سرمایہ خدا سے رابطہ ہے اور مومن اس کے علاوہ کسی اور سرمایہ کو نہیں جانتا ہے۔ اگر انسان اس قسم کے سرمایہ کامالک ہوگیا تو وہ اپنی روح میں ایک ایسی عظمت کا احساس کرتاہے کہ دوسری عظمتیں اور سرمائے اس کی نظر میں حقیر ہوجاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتاہے جہاں عظمت کے ایک بے انتہا سمندر میں غرق ہوکر ناقابل توصیف مسّرت اور لذت کا احساس کرتا ہے، پھر اس کے لئے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کا احترام کریں یا نہکریں اس کی ستائش کریں یا سرزنش ۔

قیناًاس قسم کا انسان جس کے دل میں ایمان کانور روشنہے، مومنوں کے احترام کی فکر میں ہوتاہے، کیونکہ وہ اس کام کو خدا کی خوشنودی اور اس کے تقرب کاسبب جانتاہے۔ مومن کا سرمایہ صرف ایمان کا ہوناہے۔ اس کی توجہ خدا پر ہوتی ہے وہ نہ لوگوں کے احترام کرنے پر خوش ہوتاہے اورنہ ان کی طرف سے بے احترامی پررنجیدہ ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں جو کمی کااحساس کرتے ہیں او رایمان جیسے سرمایہ سے محروم ہیں، اپنی شخصیت کی عظمت اور اپنے وجودی سرمایہ کو لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے احترام کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ چیز جسے آج کل ''اجتماعی شخصیت'' کہتے ہیں، یعنی اپنی شخصیت کو دوسروں کی جانب سے کئے جانے

والے فیصلہ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور اجتماعی عظمت بخشنے کو اپنا سرمایہ جانتے ہیں اگر دوسرے ان کی تعریف کریں تو اپنے کو محترم تصور کرتے ہیں اور اگر وہ سرزنش اور مذمت کریں تو خود کو گھٹیا اور سماج میں گرا ہوا پاتے ہیں اور جب مشاہدہ کرتے ہیں کہ لوگ ان سے بد ظن ہورہے ہیں تو فکر کرتے ہیں کہ سب کچھ لٹ گیا ہے۔ اب جو مال اور مادی کمیوں سے دوچار ہیں۔ جیسے علم، کمالات، ثروت اور دنیوی وسائل ۔وہ دوسروں کی برتری کو نہیں دیکھ سکتے، اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کے کمالات کو شک و شبہ میں ڈال کر خدشہ دار کریں، یہ عیب جوئی کرنے والے کی فطری خصلت ہے کہ وہ دوسروں کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے ایسا شخص اپنی دنیوی و اخروی سعادت کو خطرہ میں ڈالتا ہے اور ایک مومن کے عیب کو برملا کرکے قہر الٰہی میں مبتلا ہوجاتاہے۔ حضرت علی علیہ السلام دوسروں کی عیب جوئی اور غیبت کی نہی کرتے ہوئے انسان کی اپنی کمیوں سے غفلت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''یا عبداللہ لا تعجل فی عیب احد بذنبہ فلعلّہ مغفور لہ، و لا تامن علی نفسک صغیر معصیتک فلعلک معذّب علیہ فلیکفف من علم منکم عیب غیرہ لما یعلم من عیب نفسہ...[1]''

اے بندہ خدا! گناہ انجام دینے والے کے عیب کو بیان کرنے میں جلدی نہ کرنا، شاید اسے بخش دیا گیا ہو اپنے چھوٹے گناہ کے بارے ہوشیار رہنا، شاید تجھے اس کے لئے عذاب میں مبتلا کیا جائے، پس اگر تم میں سے کسی دوسرے کے عیب کے بارے میں علم رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ میں پائے جانے والے عیب کے پیش نظر اس کو بیان کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں '':من نظر فی عیب نفسہ اشتغل عن عیب غیرہ[2]'' ''جو اپنے عیب پر نظر ڈالتا ہے وہ دوسروں کے عیب کو نہیں دیکھتا ۔''مذکورہ مطالب کے پیش نظر بجاہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے پرہیز کریں اور دوسروں کی شخصیت کو داغدار نہ بنائیں ۔ہمیں جاننا چاہئے کہ معاشرے میں عیب جوئی کو رواج دینے سے معاشرے کی بنیاد متزلزل ہو کر اس کا شیرازہ بکھر جاتاہے۔اسی طرح عیب جوئی معاشرے میں بد ظنی، عداوت، دشمنی نیز

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۱۴۰، ص ۴۲۹
[2] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۱۴۰، ص ۴۲۹

عزت کو پامال کرنے کا باعث بنتی ہے، اس کی وجہ سے انسان اتنا گرجاتاہے کہ وہ دوسروں کی شخصیت کو پامال کرنے ہی کو اپنی عظمت اور بزرگی سمجھتا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں عیب جوئی کی آفت کے پھیلنے سے اخلاقی حدود پارہ پارہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ آفت گناہ کرنے پر اکساتی ہے ان تمام لوگوں میں جو سماجی لحاظ سے بہت سے گناہوں سے پرہیز کرتے تھے مشتعل کرکے انھیں قوت بخشتی ہے۔

چاپلوسی اور بے جاستائش کی مذمت: جن ناپسندیدہ صفات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیان فرمایاہے ان میں سے ایک دوسروں کی ستائش اور بے جا تعریف کرنا ہے۔ کا سہ یسی اور خوشامد بھی عیب جوئی کی طرح انسان کی شخصیت کی کمزوری او راحساس کم تری کی پیداوار ہے۔ حقیقت میںیہ ان لوگوں کی خصلت ہے جو اپنی احساس کم تری کی تلافی کی جستجو میں دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ شاید دوسروں کی بے جا ستائش سے اپنے لئے ایک برتر حیثیت پیدا کرسکیں۔ یہ خصلت خود فروش اور کمزور ایمان والے افراد کی ہے کہ پروردگار عالم کی لازوال قدرت و مملکت پر نظر نہیں رکھتے، اس لئے دوسروں پر طمع آمیز نظریں رکھتے ہیں اور اپنی عزت و سرداری کی درخواست بارگاہ الٰہی کے حقیقی فقیروں سے کرتے ہیں۔ اگر کسی نے غنی مطلق کی بارگاہ کی طرف رخ کیا اور سرچشمہ ھستی سے مدد طلب کی تووہ لالچ، چابلوسی او ردوسروں کی ستائش کا سہارا نہیں لیتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں کہ صرف خدائے متعال حمدو ستائش کا سزاوار ہے، فرماتے ہیں ''،اللّٰھم انت اہل الوصف الجمیل و التعداد الکثیر ان تومل فخیر مؤمل وان تُرجَ فاکرم مرجو، اللھم و قد بسطت لی فیما لا امدح بہ غیرک ولا اثنی بہ علی احد سواک... و عدلت بلسانی عن مدائح الآدمیّین و الثناء علی المربوبین المخلوقین...''[1] ''خداوندا! صرف تو ہی نیک اوصاف کی ستائش اور بی انتہا نعمتوں کو گننے کا سزوار ہے۔ اگر تجھ سے امیدیں باندھی جائیں توتویقیناً بہترین ہے کہ جس سے امیدیں باندھی جائیں او

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خ ۹۱، ص ۲۶۹

راگر تجھ سے امیدوار ہوا جائے تو تو محترم ترین ہے کہ جس سے امید کی جائے۔ خدواندا !تم نے مجھ کو اپنی بہت سی نعمتوں سے نوازا اور مجھی ایسی زبان عطا کی کہ اس سے تیرے سوا کسی کی ستائش نہ کروں لوگوں کی ستائش اور مخلوق کی ثنا خوانی سے میری زبان کو محفوظ رکھ۔ ''کبھی انسان خدا کی خوشنودی اور مومنوں کے احترام کے لئے کس مومن کی ستائش کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے، لیکن کبھی لالچ اور نفسانی خواہشات کی بنا پر دوسروں کی ستائش کرتا ہے تاکہ اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر سکے اور ضرورت کے وقت وہ اس کی مادی مدد کرے، ایسا شخص در حقیقت اپنے عمل سے دوسروں کو بہ طور قرض روٹی دیتا ہے۔ چاپلوسی کی ذہنیت انسان کی بُری صفتوں میں سے ایک ہے اور یہ صفت خدا پر ایمان رکھنے سے ہماہنگ و سازگار نہیں ہے ۔چونکہ جب انسان اپنے مقدر کو دوسروں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہے تو اس غرض سے کہ وہ کسی طرح اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے تو تملق اور چاپلوسی کرنے لگتا ہے، یہ اس حالت میں ہے کہ انسان کو اپنے مقدر کو خدا کے ہاتھ میں دیکھنا چاہئے۔

جیسا کہ بیان ہوا کہ اس صفت کا روحی اور نفسیاتی سرچشمہ احساس کم تری ہے کہ انسان احساس کرتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خود کو دوسروں سے وابستہ کرے اور اس وابستگی کے نتیجہ میں تملق اور چاپلوسی کے ذریعہ ممکن ہے وہ اسے کوئی مدد اور بھلائی پہنچا دے ؟مناسب ہے کہ ہم معاشرے میں تملق و چاپلوسی کی ذہنیت کے وسیع رد عمل پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ دوسروں کی چاپلوسی اور افراد کی حد سے زیادہ ستائش ان پر کیا اثر ڈالتی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دوسروں کی ستائش ان کے لئے غرور و تکبر کا سبب بنتی ہے اور افراد کو بگاڑ کر انھیں پر توقع بنا دیتی ہے اور ان میں خودستائی و بزرگ بینی کی حس کو اجاگر کر دیتی ہے، اور ظالموں کے بارے میں ستائش ان کے اعمال کی ایک طرح سے تائید و تشویق ہے۔

دوسروں کی چاپلوسی اور ستائش اس امر کا باعث ہے کہ وہ اس ستائش کو اپنے لئے خوبی اور جنبہ مثبت تصور کریں اس کے علاوہ اپنی کوتاہیوں کو بھول جائیں اور دوسری طرف سے یہ کہ، جن بُرے اور غیر شرعی اعمال کے وہ مرتکب ہوئے ہیں، وہ ان کی نظر میں پسندیدہ کام شمار ہوگا۔ تملق اور چاپلوسی،اس کے علاوہ بعض اخلاقی اصلاحات میں رکاوٹ بنتی ہے تنگ نظر اور خودخواہ افراد کی راہ کو

الٹ پلٹ کر دکھ دیتی ہے اور انھیں اپنی اخلاقی کمزوریوں، ظالمانہ اور خلاف عقل و شرع تمام روش کونمایاں کرنے میں گستاخ بنادیتی ہے۔ اسی لئے دین کے پیشوا خود عملا اس قابل مذمت روش سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف سے اپنے پیرؤں کو اشتباہ کے ساتھ اس سے مبارزہ کرنے کی تاکید فرماتے تھے ۔چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم فرماتے ہیں ''احثوالتراب علی وجوہ المداحین[1] '' ''چاپلوسوں اور بے جا تعریف کرنے والوں کے چہروں پر مٹی پھینک دو '' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم کا یہ بیان اس شخص کے بارے میں ہے جو ایک مسلمان کی چاپلوسی کرے ،ورنہ کافر کی چاپلوسی کرنے کا حکم اس سے شدید تر ہے۔ یہ تعبیر اس لئے ہے کہ معاشرے میں چاپلوسی کی ذہنیت کے رواج اور اس کے پھیلنے کو روک دیا جائے ،یہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام جیسے شخص جو تمام انسانی فضائل وکمالات کے جامع تھے اور عمومی انسانوں سے بلند تر اور جمال و جلال الہی کے مظہر تھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ان کی ستائش کرے۔

جب ایک گروہ نے حضرت علی علیہ السلام کی آپؑ کے سامنے ستائش کی تو حضرت نے فرمایا '' :خداوندا! تو میرے بارے میں مجھ سے بہتر جانتا ہے اور میں اپنے بارے میں ان سے بہتر جانتا ہوں، خدایا! مجھے اس سے بہتر قرار دے جو یہ میرے بارے میں گمان کرتے ہیں، اور جو میرے بارے میں (برائیوں کو) نہیں جانتے ،مجھے بخش دے[2] ''مرحوم الہی قمشہ ای صاحبان تقوی کے متعلق دوسروں کی ستائش کے خوف کے بارے میں فرماتے ہیں:

چو آنان را بہ نیکویی ستائی

بیندیشد و بر نیکی فزاید

ہمی گویند در پاسخ ما را

[1] بحار الانوار،ج ۷۳، ص ۲۹۴
[2] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۹۶، ص ۱۱۳۱

بہ خود مایيم دانا تر ز اغیار

سریرت ہست بر خویش آشکارا

زما بہ داند آن دانای اسرار

جب ہم ان (صاحبان تقوی) کی ستائش کرتے ہیں تو، تصور کرتے ہیں کہ ان کی نیکیوں میں اضافہ کر رہے ہیں، لیکن وہ (صاحبان تقوی) ہمارے جواب میں کہتے ہیں : ہم اپنے بارے میں غیروں سے بہتر جانتے ہیں ۔ اپنا باطن اپنے لئے واضح ہے ہمارے بارے میں ہم سے بہتر ہمارا خدا جانتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام انھیں یہ سمجھا نا چا ہتے تھے کہ انھیں ان کی ستائش کی ضرورت نہیں ہے اس لئے وہ انھیں ستائش کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہ رہے تھے تاکہ یہ ناشائستہ صفت یعنی چاپلوسی کی ذہنیت اسلامی معاشرہ میں رواج نہ پائے کیونکہ اگر اُس دن علی علیہ السلام کی ستائش کررہے تھے تو دوسرے دن دوسرے حاکم کی بھی ستائش کریں گے ، سب معصوم نہیں ہیں کہ ان کی چاپلوسی کے دھوکے میں نہ آئیں بلکہ بعض لوگوں پیآہستہ آہستہ یہ چاپلوسیاں اثرڈالتی ہیں اور وہ تصور کرتے ہیں کہ جو کچھ دوسرے لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں وہ سچ ہے اور یہ ایک بہت بڑی آفت ہے کہ انسان دوسروں کو جہل پر مجبور کرے اور دوسروں کے لئے سبب بنے اور لوگ خلاف واقع اس کو اس کی حیثیت سے بلند تر تصور کریں اور جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے وہ رفتہ رفتہ یقین میں تبدیل ہو جائے ،اس طرح سے انسان اعتدال سے خارج ہوکر اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے بالا تر تصور کرے گا اور اس بڑی آفت کا سبب بے جا ستائش کے علاوہ تملق اور چاپلوسی ہے اور تملق نفاق او ر دورخی کی نشانی ہے، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''؛الثناء بأکثر من الاستحقاق ملق''[1] ''دوسروں کی اس کے استحقاق سے زیادہ ستائش کرنا چاپلوسی ہے'' دوسری جگہ فرماتے ہیں '':من مدحک بما لیس فیک فھو خلیق ان یذمک بما لیس فیک''[2]؛ ''جو شخص کسی

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۳۳۹، ص ۱۲۴۹
[2] غرر الحکم ص، ۶۷۱

ایسی فضیلت پرکہ جو تجھ میں نہیں ہے جھوٹی تیری ستائش کرے وہ دوسرے دن ایسی بری صفت پر تیری سرزنش کرنے کا سزوار ہے جو تجھ میں نہیں ہے''حضرت علی علیہ السلام کا بیان اس نکتہ کو آشکار کرتاہے کہ چاپلوس حق و حقیقت کہنا نہیں چاہتاہے، بلکہ اس کے ذاتی اغراض نے اسے دوسروں کی ستائش پر مجبور کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ایک دن پاساالٹ گیا اور چاپلوس نے اپنے ذاتی منافع کو اس شخص کی تذلیل و تحقیر دیکھا کہ جس کی اس سے پہلے بے جا ایسی فضیلتیں بیان کرکے ستائش کرتا تھا جو اس میں موجود نہیں تھی، تو وہ اس کی سرزنش اور مذمت میں ایسی غلط باتوں کی نسبت دے گا جو اس میں موجود نہیں ہے، تاکہ اس طرح سے اسے کوئی نفع ملے یا کسی حیثیت کا مالک بنے۔

پس اسلام اجازت نہیں دیتاہے کہ انسان چاپلوس بنے، کیونکہ چاپلوسی اور ستائش کرنے کی ذہنیت، چاپلوسی کرنے والے اور وہ شخص کہ جس کی ستائش کی جارہی ہے کی روح اور معاشرے میں بُرے اثرات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ حقیقت میں ستائش کرنے والا اس قدر پست و حقیر اور خود فروش بن جاتا ہے کہ خلاف واقع کلمات کو زبان پر جاری کرتاہے۔ خدائے متعال قطعاراضی نہیں ہے کہ مومن اپنی عظمت اور عزت نفس کو پامال کرکے اس قدر اپنے آپ کو ذلیل و حقیر بنالے تاکہ دوسروں کی چاپلوسی کرے۔ تملق چاپلوسی کا مد مقابل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود کو بھول جاتاہے اور خیال کرتا ہے کہ ایسے مقام ومنزلت کا مالک ہے کہ وہ دوسروں کی ستائش کا سزاوار ہے۔

نتیجہ کے طور پر اپنی کوتاہیوں، کمیوں اور کمزوریوں کو فراموش کرتاہے اور اپنی زندگی و رفتار کو برجستہ اور مثبت پہلوؤں سے لبریز تصور کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں'':اذا مدحت اخاک فی وجہہ امررت علی حلقہ موسی''[۱]''اپنے بھائی کی اس کے سامنے ستائش کرنا اس کی گردن پر چھری پھیرنے کے مانند ہے''مذکورہ مطالب کے علاوہ ،بد ذات اور فاسد انسانوں کی چاپلوسی و ستائش کرنا ،انھیں گستاخ بنا کر دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور لوٹ مار کرنے کی جرأت بخشتاہے۔ چاپلوسی کرنے والا،اس

[۱] جامع السعادات، ج ۲ ، ص ۳۲۷

کے علاوہ کہ نفاق و جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے، اپنی بے جا تعریف و تمجید سے، سرکشی، انتہا پسندی، بے راہ روی اور فاسدوں خاص کر باطل حکام کو تجاوز کرنے کے لئے مناسب موقع فراہم کرتا ہے اور حقیقت میں وہ خود لوگوں کے خلاف فساد پھیلانے والوں کے جرم و نقصانات میں شریک بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم فرماتے ہیں "؛اذا مدح الفاجرا ھتزّ العرش و غضب الرّب[1]"، "جب فاجر کی ستائش کی جاتی ہے تو عرشِ خدا کا نپنے لگتا ہے ور خدائے متعال غضب ناک ہوتا ہے" آنحضرتؐ فرماتے ہیں: عیب جو نہ بنو کہ صرف لوگوں کی کمزوریوں کو پاکر انھیں بیان کرکے ان کی عزت و آبرو کو طشت از بام کرو، کیونکہ خدائے متعال راضی نہیں ہے کہ لوگوں کی آبرو ریزی کی جائے، حتی وہ عیب جو اس میں موجود ہیں وہ بھی فاش نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے لوگوں کے عیبوں پر پردہ کھینچا ہے تا کہ وہ آپس میں الفت کے ساتھ زندگی گزاریں اور اجازت نہیں دیتا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے عیبوں کو فاش کریں، حتی اجازت نہیں دیتا ہے کہ مومن اپنے ذاتی عیب کو بھی دوسروں سے بیان کریں، کیونکہ انسان حق نہیں رکھتا ہے کہ وہ اپنی آبروریزی کرے۔

اس طرح آنحضرتؐ مزید فرماتے ہیں: تملق اور چاپلوسی کیذریعہدوسروں کو اُن اچھے صفات سے منسوب کرنا جو ان میں موجود نہیں ہیں۔در حقیقت یہ افراط و تفریط ہے جو مومن کے لئے مضر ہے اور انسان کو اعتدال سے خارج نہیں ہونا چاہئے۔اگروہ دوسروں کی اچھی صفتوں کو بیان کرنا چاہتا ہے تو حقیقت کی حد میں اور خیرو مصلحت پر اکتفا کرے، نہ یہ کہ ان صفات کو بیان کرنے میں اپنے لئے نفع کی فکر میں ہو یا اعتدال کی حد سے خارج ہوجائے۔

دوسروں کی طعنہ زنی اور زخم زبان کی مذمت: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے حن ناپسند صفات کا ذکر فرمایا ہے، ان میں لوگوں کی طعنہ زنی کرنا اور ڈنک مارنے والی زبان کا ہونا بھی ہے طعنہ زن اور دلخراش باتوں سے مؤمن کو تکلیف پہنچانے کو زخم زبان کہتے ہیں، کہ انسان کوشش کرتا ہے دوسروں کی ناکامیوں او رکمزوریوں کو اس پر تھونپ دے اور اس طرح اس کے دل کو مجروح

[1] بحار الانوار ، ج، ۷۷، ص، ۱۵۲

کرے ۔ مناسب ہے کہ انسان دوسروں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرے اور اگر ان کی زندگی میں کچھ ناکامیاں ہوئی ہوں تو بھی اپنی باتوں سے ان کے دل کے زخموں پر مرہم رکھے،نہ یہ کہ انھیں ان نقصانات کا مستحق و سزاوار جانے اور زخم زبان سے ان کے دل دکھائے، حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''حد اللسان امضی من احد السنان''[1] ''زبان کی تیزی اور شدت نیزہ سے زیادہ ہے'' طعنہ زنی کا سرچشمہ ، عداوت و کینہ اور بعض اوقات حسد ہے کہ طعنہ دینے والے کو مجبور کرتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ بات کرتے وقت اس کی بات دلخراش ہو۔ ممکن ہے ظاہری بات اور اس کا مفہوم حق ہو، لیکن اسے دلخراش اور تکلیف دہ انداز میں پیش کیا جائے کہ جو مخاطب کی رنجش و تکلیف کا سبب ہو۔ جب انسان کسی سے بحث و مباحثہ کرتا ہے، اگر مخاطب مطلب کو پیش کرنے میں غلطی کرتا ہے،تو اس نرم لہجہ میں سمجھایا جاسکتا ہے کہ فلاں عبارت کو آپ نے صحیح نہیں پڑھا اور فلاں مطلب کو صحیح بیان نہیں کیا، لیکن کبھی وہ اسے طنزیہ کلمات کہ جو اذیت کا باعث ہیں سمجھاتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے، تو اسے ایسے لہجہ میں کہنا چاہئے کہ جو اس میں اثر کرے اور اس طرح اسے سمجھائے کہ وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہوجائے اور ہٹ دھرمی نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار کرے اور پہلی غلطی کے اوپر اس کے غلط رویہ کی وجہ سے دوسری غلطی کا بھی مرتکب ہوجائے کہ جس کے نتیجہ میں وہ صحیح راستہ سے منحرف ہو جائے اور غلط طریقہ کار کے سبب جہل اور من مانی کرنے لگے اور اس کی اصلاح دشوار ہوجائے۔

بعض افراد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ مخاطب کی اصلاح نہیں کرتے اور اسے معروف اور نیکیوں کی طرف کھینچ کر نہیں لاتے بلکہ نصیحت کے غلط طریقہ کار بلکہ ملامت و سرزنش کے ذریعہ اسے دوسری برائیوں میں مبتلا ہونے پر مجبور کردیتے ہیں ، اس لئے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''ایاک ان تعاتب فیعظم الذنب و یہون العتب ''[2] ''ملامت و سرزنش سے پرہیز کروکہ یہ کام گناہ کو بڑھاچڑھا کر پیش کرتاہے اور ملامت کو بے اثر کرڈالتا ہے۔ ''یا افراد کی

---

[1] غرر الحکم، ص ۳۸۲
[2] بحارالانوار ، ج ۷۷، ۲۱۶

سرزنش کرنے اور ملامت کی تکرار کے بارے میں فرماتے ہیں'' :الافراط فی الملامۃ یشب نیران اللجاج [۱] '' ''ملامت و سرزنش میں افراط و زیادتی ، ہٹ دھرمی کی آگ کو شعلہ ور کرتا ہے۔ '''' ''ایاک ان تکرر العتب فان ذالک یغری بالذنب و یھون بالعتب'' [۲]'' باربارر سرزنش سے پرہیز کرو، کیونکہ سرزنش کی تکرار گناہ گار کو اس کے ناپسندیدہ فعل کے انجام دینے میں گستاخ بنادیتی ہے اور اس کے علاوہ خود ملامت و سرزنش کو پست اور حقیر بنادیتی ہے۔ ''پس جب کسی کو اس کی کمزوری کے بارے میں توجہ دلانا چاہتے ہو تو اس کے ساتھ ہشاش بشاش مہربانی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ نہ یہ کہتمھاری زبان بچھوکی طرح ڈسنے والی ہو۔ اس طرح بات کرو کہ وہ شخص اپنی کمزوریوں کی تلافی کرنے پر آمادہ ہو جائے ورنہ اگر اسے کہوگے کہ تم نے غلطی کی ہے،یا تم نہیں سمجھتے ہو،یا اس جیسے کلمات تو فطری بات ہے کہ وہ اسے پسند نہیں کرے گا اور رنجیدہ ہوگا ۔

اور اس ردعمل کے طور پر اس کے برخلاف انجام دے گا ،سواء اس کے کہ کوئی اہل تقویٰ ہو جو بزرگی کے پاس و لحاظ میں سکوت اختیار کرے اور کوئی جواب نہ دے ۔پس جب ہم ناشائستہ او رتند برتاؤ کو پسند نہیں کرتے، کس طرح توقع کریں گے کہ طعنہ زنی والے کلام سے دوسروں کی اصلاح کریں۔ ہمیں ہرحالت میں دوسروں کے ساتھ نیکی اور اچھائی کی فکر میں رہنا چاہئےاور ہماری بات او ر رفتار نیک انسانی اخلاق کی ترجمان اور اس بات کی دلیل ہونی چاہئے کہ ہم اس وصف کے حامل ہیں۔ سعدی کہتا ہے:

آنکس کہ بہ دینار و درم خیر نیندوخت سر عاقبت اندر سرِ دینا رو درم کرد خواہی کہ متمتع شوی از دنیی و عقبی با خلق کرم کن چو خدا با تو کرم کرد (جس نے دینار و درہم سے نیکی ذخیرہ نہ کی، اس کا سرانجام دینارو درہم ہی ہوگا،اگر دنیا و آخرت سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہو، تو لوگوں کے ساتھ اسی طرح نیکی کرو جس طرح خدانے تمھارے ساتھ نیکی کی ہے)اپنی بات پر اصرار کرنے کی مذمت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جس چوتھی ناپسندیدہ صفت کا ذکر کیا ہے وہ مراء اور خطا پر اصرار ہے۔ مراء یعنی دوسروں کی بات کو مسترد کرکے اپنی برتری کو ثابت کرنا، اس طرح کہ جب انسان کوئی غلطی کرتاہے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے

---

[۱] بحار الانوار، ج ۷۷، ۲۳۲
[۲] غرر الحکم ، ص ۲۷۸

آمادہ نہیں ہوتاہے اور اپنی باتوں کی دوسرے نادرست مطالب سے توجیہ کرتاہے اور اسے ترمیم کرنے لگتا ہے اور اس کام کو مسلسل انجام دیتا ہے، جب انسان ہر بار اپنی غلطی پر اصرار کرتاہے اور مد مقابل شخص بھی دیکھتا ہے کہ یہ آدمی ایک باطل مطلب کو حق کے طور پر پیش کرنا چاہتاہے تو وہ اس کی بات کو مسترد کرنے میں اصرار کرتاہے۔ جب جدال اور اصرار کی ذہنیت انسان میں پیدا ہوجاتی ہے تووہ متواتر کوشش کرتاہے تاکہ اپنی بات کا سکہ دوسرے پر بٹھائے اور اس ذہنیت کا سرچشمہ اس کی خود خواہی اور خود پسندی ہے۔

یعنی انسان یہ کہنا چاہتاہے کہ میں نے غلطی کی اور وہ اپنی غلطی کے اعتراف میں کسر شان سمجھتا ہے۔ باوجود اس کے وہ جانتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے، لیکن نہیں چاہتا کہ دوسرے یہ سمجھ لیں کہ اس نے غلطی کی ہے، اس لئے جب مطلب کی وضاحت کرکے اسے اپنی غلطی کے بارے میں متوجہ کرنا چاہیں تو وہ ہٹ دھری سے اسے مسترد کرتا ہے اور اپنی بات کو حق جتاتے ہوئے کہتا ہے: جو کچھ میں نے کہا وہی صحیح ہے!

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اصرار،اور پے در پے ایک بات کی رٹ لگانامد مقابل کے، غصہ کو برانگیختہ کرنے میں کلیدی رول انجام دیتاہے، اس لئے اصرار سبب بنتا ہے کہ اصرار کرنے والے ایک دوسرے سے لڑپڑیں اور ہر کوئی کوشش کرے کہ اپنی بات کو برتری بخشے اس لئے پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں ''؛ذروا المراء فانّہ لا تفہم حکمتہ و لا تؤمن فتنتہ[1]'' ''ہٹ دھرمی کو چھوڑ دو اس لئے کہ اس کی حکمت روشن نہیں ہے (یعنی اس میں کوئی حکمت نہیں ہے) اور کوئی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہے''

اپنی غلط بات پر ہٹ دھرمی اور اصرار، ایک بری صفت ہے، افسوس ہے کہ بعض اہل علم بھی اس سے آلودہ ہوتے ہیں۔ بحث کے دوران جب کوئی شخص ایک غلط نظریہ پیش کرتاہے، تو وہ اپنے نظریہ پر اصرار کرتاہے اور اگر دوست کے سامنے ہتھیار ڈالنا چاہے تو احساس ناکامی کرتاہے، خاص کر اگر کوئی تیسرا آدمی بھی ان کی گفتگو کا مشاہدہ کررہاہو تواپنی آبرو کو بچانے کے لئے کوئی کسر

---

[1] بحار الانوار ، ج ۲، ص ۱۳۸

باقی نہیں رکھتا ہے اور اپنی بات کا دفاع کرتاہے، خاص کراگر وہ تیسرا شخص اس کا مرید بھی ہو؛ آخر کار یہ سب چیزیں انسان کو حق قبول نہ کرنے اور نا حق پر ترجیح دینے کے محرک بن جاتے ہیں۔ ہٹ دھرمی اور اصرار کے نتیجہ میں جن آفات سے انسان دوچار ہوتا ہے ان کے پیش نظر مناسب ہے انسان اس صفت سے مبارزہ کرنے کی ہمت کرے۔ اصرار اور ہٹ دھری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آفتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان خلاف حقیقت نظریات پیش کرنے پر مجبور ہوتاہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''اللّجاج یفسد الرّای''[1] ''ہٹ دھرمی انسان کی رای کو فاسد کردیتی ہے(اور اسے خلاف حقیقت اظہاررای کرنے پر مجبور کرتی ہے)ہٹ دھرمی کی من جملہ آفتیں جو حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں موجود ہیں، انسان کی روح کا مریض ہونا بھی ہے:

''اللّجاج یشین العقل''[2]ہٹ دھرمی روح کو ناقص اور زخمی کردیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں ذکر ہوئی آفتوں میں انسان کی فکر ونظر میں زوال بھی ہے ''اللجوج لا رای لہ''[3]ہٹ دھرم صاحب عقل و نظر (اور صحیح نظر) نہیں ہے۔ لیکن غلط نظریہ پرہٹ دھرمی اور اصرار کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ، اظہار فضیلت کا باعث بننے والے تکبر کی اپنی اندر سے بیخ کنی کی جائے اور جان لے کہ ہٹ دھرمی دشمنی اور کدورت کا سبب بنتی ہے اور الفت و برادری کو نابود کردیتی ہے۔

اسی طرح یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے شائستہ ہے کہ وہ کوشش کریں کہ جدال و اصرار سے پرہیز کرکے اس کے ہٹ دھرمی پر مبنی رویہ پر کنٹرل کریں اور ہمیشہ حرف حق کے تابع رہیں اور نیک گفتار اپنا شیوہ قرار دیں تا کہ اس کے نتیجہ میں احترام و حق قبول کرنے کی ذہنیت ان میں ملکہ بن جائے اور اصرار و ہٹ دھرمی کی ناشائستہ صفت ان کے دل سے نابود ہو جائے۔ دال او راصرار سے پرہیز کرنے کے لئے انسان کو اپنے آپ کو باور کرانا چاہئے کہ ہرکوئی خواہ نخواہ غلطیوں اور لغزشوں سے دوچار ہوتا ہے اور ایسا

---

[1] غرر الحکم، ص ۳۶
[2] غرر الحکم، ص۱۷
[3] غرر الحکم، ص۳۱

نہیں ہے کہ تمام انسان غلطیوں سے محفوظ ہیں۔ صرف معصومین غلطیوں سے محفوظ ہیں اور دوسرے افراد ممکن ہے غلطی کریں، یا کسی چیز کے بیان اور نقل کرنے میں غلطی کریںیا ان کے فہم و درک کرنے میں۔ یہ چیز خلاف توقع نہیں ہے اور ہر ایک کے لئے پیش آسکتی ہے، پس اسے عیب شمار نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ انسان کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے کم غلطیاں سرزد ہوں، خاص کر درس و مباحثہ کے لئے زیادہ مطالعہ کرے تا کہ کم تر غلطی کرے، لیکن اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو اسے اپنے لئے بڑا عیب نہیں سمجھنا چاہیے اور فکر نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی عزت ختم ہوگئی اور وہ ناکام ہوگیا۔

دوسرے مرحلہ میں جب انسان سمجھ گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، اسے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور آپ حق پر ہیں البتہ ابتدا میں اپنی غلطی کا اعترا ف کرنا مشکل ہے لیکن اس کے بعد جب اپنی غلطی کے اعتراف کی حلاوت کو درک کرتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ نظریہ کے مطابق غلطی عیب نہیں ہے، تو اس کے لئے غلطی کا اعتراف کرنا آسان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے: ''میں انسان ہوں اور انسان خطا سے محفوظ نہیں ہے اور کبھی میں خطا کرتا ہوں اور دوسرا صحیح سمجھتا ہے اور کبھی اس کے بر عکس۔

''کیا اچھا ہے اپنے اس دوست کا شکریہ بجالائے، جس نے اسے اس کی غلطیوں کے بارے میں متوجہ کیا ہے اور اسے صحیح راستہ و نظریہ دکھایا ہے، اس کے سامنے صرف خاموش رہنے پر اکتفا نہ کرے، چونکہ اگر ہم جدال اور اصرار کی خصوصیت اور اس کی آفتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے نقطہ مقابل کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے اور جدال و اصرار کا نقطۂ مقابل غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ اپنے دوست سے کہے: آپ نے مطلب کو اچھا سمجھا ہے اور میں متوجہ نہیں تھا۔ اس شیریں اور ائستہ برتاؤ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ شکست و کمی کا احساس نہیں کرتا ہے بلکہ یہ مناسب برتاؤ تفاہم اور ایک شیریں زندگی کے ایجاد کا سبب بنتا ہے اور انسان دوسروں کے دل میں بیشتر جگہ پاتا ہے او رلوگ اس کی بات پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

اگر انسان اپنی غلطیوں کی توجیہ کرنے کی کوشش کرے گا او ران پر پردہ ڈالنے کی جستجو کرے گا، تو لوگوں کے دلوں میں اس کا اعتماد ختم ہوجائے گا اور اگر وہ کبھی صحیح بات بھی کہے گا تو لوگ اس پر اعتماد نہیں کریں گے، لیکن جب اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتاہے اور دوسروں کے صحیح نظریہ کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے، تو اس کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں، چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ یوں ہی بات نہیں کرتا ہے، اور اس رفتار کے نتیجہ میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بہتر ہوجاتی ہے، البتہ مومن کو اپنی اجتماعی حیثیت کی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے، لیکن اس رفتار او رحق کو قبول کرنے کے ایسے آثار بھی ہوتے ہیں۔ اس کی نسبت دوسروں کا اعتماد بھی بیشتر ہوتا ہے اور وہ ان میں محبوب بھی ہوتاہے او ربہتر اجتماعی مقام بھی پاتا ہے، اس کے علاوہ بُرے اور ناپسند اخلاق سے نجات بھی پاتاہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز سے وابستگی نہیں رکھنی چاہئے بلکہ خدا سے دل لگا نا چاہئے اور ہر کام میں انسان کا محرک خدا کی مرضی حاصل کرنا چاہئے اور مذکورہ آثار مؤمن کے رفتار کے اضافی منافع ہیں۔

بارہواں درس

بادتوں کے جلوے اور اسلام میم سجدوں کا نقش

''یاابا ذر!الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ وکل خطوۃ تخطوھاالی الصلوٰۃ صدقۃ۔یاابا ذر!من اجاب داعی اللہ واحسن عمارتمساجد اللہ کان ثوابہ من اللہ الجنۃ فقلت :بابی انت وامیّ یا رسول اللہ کیف تعمر مساجد اللہ؟قال لا ترفع فیھا الا صوات ولا یخاض فیھا بالباطل ولا یشتری فیھا ولا یباع واترک اللغو مادمت فیھا فان لم تفعل فلا تلومن یوم القیامۃ الا نفسک۔یاابا ذر! ان اللہ تعالی یعطیک مادمت جالسا فی المسجد بکل نفس تنفّست درجۃ فی الجنہ و تصلی علیک الملائکۃ وتکتب لک بکل نفس فیہ عشر حسنات وتمحی عنک عشر سیات۔یاابا ذر !أتعلم فی ایٔ شیٔ انزلت ھذہ اآایۃ:(اصبروا ورابطوا واتقوااللہ لعلکم تفلحون) قلت:لا،فداک ابی وامی۔قال:فی انتظارالصلوٰ تخلف الصلوٰۃ'' یا اباذر!اسباغ الوضوء فی المکارہ من الکفارات وکثرۃ الاختلاف الی المساجد فذلکم الرباط۔یاابا ذر!یقول اللہ تبارک وتعالی:ان احب العباد الی المتحابون من اجلی،المتعلقۃ قلوبھم بالمساجد والمستغفرون بالاسحار اولئک اذا اردت باھلا الارض عقوبۃذکرتھم فصرفت العقوبۃ عنھم۔''یاابا ذر!کل جلوس فی المسجد لغو الآ ثلاثۃ:قراءتمصل اوذکر اللہ او سائل عن علم '' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ابو ذرؓ سے کی گئی پند و نصائح کے بعض حصوں پر بحث و تحقیق کے بعد اب ہم اس کے ایک اور حصہ کی بحث و تحقیق کریں گے جس کا موضوع مسجد،مسجد میں حاضر ہونے کے آداب اور نماز کی اہمیت ہے۔

عبادت کا مفہوم اور اس کی وسعت:ابتدا میں ہم عبادت کے مفہوم اور اسکی وسعت کے بارے میں بحث کریں گے ۔چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے کہ انسان کا حقیقی کمال قرب الہی میں ہے اور اس قرب الٰہی یا حقیقی تکامل کو حاصل کرنے کا وسیلہ عبادت ہے ۔عبادت و پرستش کہ جس کے بہت ہی وسیع اور عمیق مفاہیم ہیں اور یہ ایک ایسے جاذبہ سے بہرہ مند ہے کہ جو حیرت و پریشانی کے سمندر میں پھنسے ہر شخص کو آرام و سکون کے ساحل سے ہم کنار کر دیتا ہے اور آخر کار فنا فی اللہ کے مقام تک پہنچا تا ہے

حقیقت میں کوئی قلم اور بیان، عبادت و پرستش کے ملکوتی جاذبہ کی بلندی و گہرائی کی توصیف نہیں کر سکتا ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ بلند مفہوم الٰہی الفاظ وبیان کے قالب میں نہیں آسکتا ہے ۔صرف وہ امام بر حق سخی و جوانمرد نیز اطاعت وعبادت کے شیدائی حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام ہیں کہ جو فرماتے ہیں ''الٰہی کفی بی عزا ان اکون لک عبد اوکفی بی فخرا ان تکون لی ربا[1]'' ۔ آل عمران،٢٠٠ ''پرور دگارا!میری عزت کے لئے کافی ہے کہ تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لئے کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے''یہ بات اللہ کی عبودیت و بندگی کے عشق میں غرق شدہ روح سے نکلی ہے،اس بلند روح سے کہ فرماتا ہے: ''۔ولا لفیتم دنیا کم ھذہ ازھد عندی من عفطتعنز[2]'' تم جانتے ہو:کہ یہ تمہاری دنیا میری نظروں میں بکری کی چھینک سے پست تر ہے؟

بندگی درکوی عشق ازپادشاہی خوشتر است

بستگی صدرہ در این دام ازرہائی خوشتر است

تجربت ہا کردم از روی حقیقت چند بار

دلق درویشی زتاج پادشاہی خوشتر است

یک نظر دربارہ صافی کن ودر جام می

تا بینی بی خودی از خودنمائی خوشتر است

ذوق شبہای درازونالہ ہای جان گداز

[1] بحارالانوار،ج٧٧ص٤٠٢
[2] نہج البلاغہ(فیض الاسلام)خ٣،ص٥٢

گر چشی دانی کہ شاہی ازگدائی خوشتر است

(کوی عشق میں بندگی کرناپادشاہی سے بہتر ہے ۔اس بندگی کے پھندے میں سو بار پھنسنا رہائی سے بہتر ہے ۔ میں نے حقیقت کی رو سے کئی بار تجربہ کیا ہے کہ درویشوں کا لباس تاج پادشاہی سے بہتر ہے۔لمبی راتوں کے ذوق اور جانسوز نالہ و فریادوں کو اگر چکھ لوگے تو سمجھ لوگے کہ یہ (بندگی) ایسی شاہی ہے کہ جو اس گدائی (ظاہری پادشاہی) سے بہتر ہے۔)جی ہاں، عبادت و پرستش کاایک پائدارااور ثابت نظام ہے کہ بشریت کی پیاسی روح اسکے علاوہ کسی اور چیز سے سیراب نہیں ہوتی ہے اور مادی جاذبے اور مادی ترقیاں اس میں اثر نہیں ڈال سکتی ہیں اور نہ اس کے خلاکو پر کر سکتے ہیں،کیونکہ بشر جس قدر صنعت اور ٹیکنا لوجی کے میدانوں میں ترقی کرے اور مادیات کے میدانوں کو فتح کرلے ،نہ صرف غنی مطلق سے بے نیاز نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی احتیاج اور ضرورت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

الف۔عبادت کی ایک تقسیم بندی:ایک عام اور وسیع نقطہ نگاہ سے عبادت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ا۔ عبادت بہ معنی خاص جو کہ افعال عبادی سے عبارت ہے، جیسے نماز،روزہ وحج و...

٢۔ عبادت بہ معنی عام سے مراد ہر وہ اچھا کام جو خدائے متعال کی اطاعت کی نیت سے انجام دیا جائے۔اس تعریف میں حتی کھانا،بیٹھنا،اٹھنااور بات کرنا اور دیگر وہ تمام کام جنھیں خدائے متعال نے نیک کام شمار کیا ہے اور اس کی اطاعت وبندگی کے قصد سے انجام پاتے ہیں ۔ پس اس لئے کہ انسان کی عمر ایک صحیح راستہ پر صرف ہو اور بیہودہ طور پر صرف نہ ہواور اس کا سرمایہ ضائع نہ ہو،اسے کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی زندگی کے لمحات کو زیادہ سے زیادہ خدائے متعال کی عبادت خواہ بہ معنای خاص یاعام میں گزارلیا جو کچھ شرع میں عبادت کے طور پر بیان ہوا ہے اسے انجام دیں اور فرائض نیزافعال توصلی کو قصد قربت سے انجام دینے کی کوشش کریں۔اگرانسان سے کوئی چھوٹا بڑا کام انجام پائے اور وہ کام مذکورہ عبارت کے زمرے میں نہ آتا ہو یعنی اس پر عبادت

کا خاص یا عام عنوان صدق نہ آتا ہو،تو وہ کام بیہودہ اور لغو ہے اور قیامت کے دن انسان کے لئے حسرت کا باعث ہے ۔اگر نعوذ باللہ،گناہ ہو تو دنیا وآخرت میں خسارت کا باعث اور ابدی عذاب کا سبب ہو گااور اگر گناہ نہ بھی ہو بلکہ مباح یا مکروہ ہو،تو بہر حال انسان کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے چلا گیاہے اور ایک ایسی چیز پر خرچ ہوا ہے کہ اس کے لئے کوئی نفع نہیں ہے ۔ شرع میں بہت سے ذاتی طور پر مباح کام انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے اور یہی تشویق اور تاکید موجب ہوتی ہے کہ انسان انھیں انجام دے،اب اگر وہ کام اسی امر کی اطاعت کے قصد سے ہو کہ جس عمل عبادی سے اس کا تعلق ہے انجام دیا جائے تو عبادت ہے۔ انسان کی زندگی سے مربوط اسلامی اور قرآنی نظریہ زندگی کا مقصد اور سعادت اور اس کے اعمال و رفتار کے پیش نظر فطری بات ہے کہ اسلام کی دعوت یہ ہو نی چاہئے کہ انسان سے جس قدر زیادہ اوربہتر ممکن ہو سکے عبادت کرے :کمیت اور مقدار کے لحاظ سے، انسان کے انجام دئے جانے والے تمام کام عبادت ہو سکتے ہیں ۔

اور حقیقت میں عبادت میں اس قدر وسعت پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کی پوری زندگی کو احاطہ کر سکتی ہے۔ لیکن کیفیت کے لحاظ سے (عبادت کی کیفیت انسان کی نیت و معرفت سے وابستہ ہے)جس قدر انسان کی معرفت خدائے متعال کے بارے میں زیادہ ہو گی ،جس قدر خدا کے بارے میں اس کی محبت میں اضافہ ہو گا اسی اعتبار سے،عبادت کو انجام دینے میں اس کا قصد خالص تر ہو گا اور عبادت کے دوران بیشتر حضور قلب کی کیفیت پیدا ہوگی اور عبادت کی کیفیت بھی بہتر ہوتی جائے گی۔

کبھی اگر انسان دو رکعت نماز با کیفیت انجام دے تو ،اس کا ثواب ہزاروں رکعت نماز سے بیشتر ہے ،یہ وہ چیز ہے جس کو ہم سب جانتے ہیں اور اسی لئے اسلام نے ہمیں اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس قدر زیادہ کوشش کریں گے ہمارے کام میں خدائی رنگ اتنا ہی زیادہ ہوگا اور ہماری زندگی سراسر خدا کی بندگی میں تبدیل ہو جائے گی،کیونکہ انسان کا کمال خدا کی بندگی میں ہے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں'' :افضل الناس من عشق العباد ةفعانقھا واحبھا بقلبہ وباشرھا بجسدہ وتفرغ لھا فھو لایبالی علی ما اصبح

من الدنیا علی عسر ام علی یسر"[1]"لوگوں میں سب سے قابل قدر وہ ہے جو عبادت کے ساتھ عشق رکھتا ہے،عبادت سے بغل گیر اور ہم آغوش ہوتاہے اور دل سے اس کے ساتھ محبت کرتے ہوئے اپنے اعضاوجوارح کے ذریعہ اس سے لمس کرتاہے اور اپنے تمام ہم وغم کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے اوراس کے لئیدنیاوی آرام یا تکلیف کو اہمیت نہیں دیتاہے ۔"مذکورہ مطالب کے پیش نظر،فطری بات ہے کہ پروردگار جس نے انسان کے لئے ایسے مقصد کو مد نظر رکھاہے اور اس کیلئے ایسے اسباب فراہم کئے ہیں کہ وہ اپنے تمام کاموں کو عبادت اور خدائی رنگ دے سکتا ہے،تمام وہ وسائل اس کے لئے فراہم کئے ہیں، جن سے لوگ مدد لے کر بہتر اور زیادہ تر خدا کی عبادت کر سکیں اوراس سے قریب ہو جائیں،کیونکہ خدائے متعال کی رحمت سب سے زیادہ ہے اور وہ دوسروں سے زیادہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس سے قریب ہو جائیں۔جس طرح اس کا وجود اور علم لامتناہی ہے،اسی طرح اس کی خیر خواہی بھی لامتناہی ہے ۔

خدائے متعال کے تمام اوصاف لامتناہی ہیں،اپنے بندوں کے ساتھ اس کی الفت و محبت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔جو اس قدر بے انتہارحمت کا مالک ہے اور اپنے بندوں کے لئے اس قدر خیر خواہ ہے تشریعی مراحل میں اس نے ایسے احکام صادر فرمائے ہیں تاکہ اس کے بندے اس سے زیادہ قریب ہو جائیں۔ اس لئے شرعی احکام،عبادت،خواہ واجب یا مستحب اور ان کی کیفیت و آداب،سب الطاف الٰہی ہیں۔خدا وند متعال چاہتاہے کہ ہم اپنے ارادہ و اختیار سے کمال وسعادت تک پہنچیں اور بیشتر تکامل وارتقاء حاصل کریں،اسی لحاظ سے اس نے ہمارے لئے ضروری تکوینی و تشریعی وسائل فراہم کئے ہیں۔

ب:نماز،کمال بندگی اور تقرب الٰہی:تکوینی مراحل میں،خدائے متعال جس قدر اپنے بندوں پر زیادہ لطف وعنایت کرے گا،اتنی زیادہ انھیں توفیق ہوگیکہ وہ فرائض اور عبادات کوانجام دیں،البتہ جو کچھ خداوند کریم انجام دیتا ہے وہ بیہودہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص قوانین الٰہی کے تابع ہے۔ تشریعی مراحل میں تشویق کرتاہے اورایسے احکام جعل کرتاہے کہ لوگ ان احکام کو انجام دے کر زیادہ

[1] اصول کافی،ج ۳،ص ۱۳۱

سے زیادہ خدا سے نزدیک ہو جائیں ۔ من جملہ نماز کو شرعاًواجب فرمایا ہے کہ جوتقرب الٰہی کے لئے بہترین وسیلہ ہے ،چنانچہ معصوم نے فرمایا ہے ''؛الصلوۃ قربان کل تقی''[1] ''نماز ہر باتقوی مؤمن کے لئے وسیلۂ تقرب ہے''البتہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ نماز کی ظاہری صورت قرب الٰہی نہیں ہے ،بلکہ نماز کی حقیقت اور اس کا باطنی صورت خدا کے قرب کا سبب ہے اورآیات و روایات کے لحاظ سے یہاں نماز کی حقیقت مراد ہے نہ اسکی ظاہری صورت ۔خدائے متعال فرماتا ہے: (اقم الصلوۃ لذکری[2]) ''نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو'' (اس آیت میں تعبیر ''اقامہ''نماز کی حقیقت کے ساتھ تناسب رکھتی ہے ،نہ اس کی ظاہریصورت سے) خدائے متعال مزید فرماتاہے: (واقم الصلٰوۃ ان الصلوٰۃتنھی عن الفحشاء والمنکر[3]) ''اور نماز قائم کریں کہ نماز ہر برائی اور بد کاری سے روکنے والی ہے۔''

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:سیاق آیت اس بات کی شاہدہے کہ نماز کا بد کاریوں سے روکنے سے مراد ،طبیعت نماز کا بدکاریوں او ر منکرات سے روکنا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ نماز کیسے بدکاریوں اور منکرات سے روک سکتی ہے ؟جواب میں کہتے ہیں:اگر خدا کا بندہ روزانہ پانچ بارنماز بجالائے اور پوری عمر میں اس کام کو جاری رکھے،خاص کر اگر اسے ایک صالح معاشرے میں بجالائے اور اس معاشرے کے افراد بھی ہر روز نماز کو بجا لائیں اور اسی کی طرح اس کا اہتمام کریں توفطری طور پر وہ نماز گناہان کبیرہ سے موافقت و میل نہیں کھائےگی ۔

جی ہاں ،بندگی کے عالم میں خدا کی طرف توجہ ،وہ بھی ایسے ماحول اور ایسے افراد میں کہ جو،انسان کو ہر اس گناہ اور عمل سے کہ جس کو دینی ذوق ناپسندیدہ اور گھناؤنا عمل جانتا ہے ،جیسے قتل نفس ،یتیموں کے جان و مال پر تجاوز کرنا اور زنا وغیرہ سے باز رکھے بلکہ نہ صرف ان کے ارتکاب سے روکے بلکہ ان کے بارے میں تصور کرنے سے بھی منع کرے ۔چونکہ نمازذکر خدائے متعال پر مشتمل

---

[1] ۱بحارالانوار ج۱۰،ص۹۹
[2] طہ ,۱۴
[3] عنکبوت ,۴۵

ہے ،لہذا سب سے پہلے خدائے متعال کی وحدانیت ،رسالت اور روز قیامت کے جزا پر ایمان کو نماز گزار کے لئے تلقین کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتاہے کہ اپنے خدا کو ایمان و اخلاص کے ساتھ خطاب کرے،اس سے مدد طلب کرے اور درخواست کرے کہ اسے سیدھے راستہ پر ہدایت کرے اسی طرح گمراہی اور اس کے قہر و غضب سے پناہ طلب کرے دوسرے یہ کہ اسے برانگیختہ کرتاہے کہ اپنی روح وبدن کو خدائے متعال کی عظمت و کبریائی کی طرف متوجہ کرے ،اپنے پروردگار کو حمد وثنا ، تسبیح و تکبیر سے یاد کرے ۔[1] لیکن روایات کے نقطہ نظرسے،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت نقل ہوئی ہے کہ خدائے متعال اس نماز پر نظرنہیں ڈالتا،جس میں نمازی اپنے دل کو اپنے بدن سے ہم آہنگ نہ کرے اور اس کا دل اس نماز کے پاس نہ ہو ۔بالکل واضح ہے کہ یہ روایت نماز کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو وہی ذکر اور خدا کی یاد ہے ،کیونکہ ذکر اورخدائے متعال کی یاد عبادت کا مقصد ہے اور انسان کے دل کو جلا وروشنی بخشتا ہے اور اسے تجلیات الہی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے ۔

حضرت علی علیہ السلام یاد حق جو عبادت کی روح ہے کے بارے میں یوں فرماتے ہیں ''،ان اللہ سبحانہ وتعالی جعل الذکر جلاء للقلوب ،تسمع بہ بعد الوقرۃوتبصربہ بعد العشوۃوتنقاد بہ بعد المعاندۃ [2]'' ''خدائے متعال نے اپنی یاد کو دلوں کے لئے صیقل و جلا قرار دیاہے کہ اس کے سبب (اس کے اوامرونواہی)بہرے پن کے بعد سنتے ہیں اور تاریکی (نادانی)کے بعد دیکھتے ہیں اور جنگ و دشمنی کے بعد فرمانبردار ہو جاتے ہیں ۔''سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:خدائے متعال کے لئے ہمیشہ جس کی نعمتیں اورکرم فرمائیاں بلند ہیں ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں اور اسے زمانے میں جب شریعتوں کے آثار گم ہو جاتے ہیں ،کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خیالات و تصورات میں اس کے ساتھ رازونیاز کرتے ہیں اور حقیقت میں عقلیں ان کے ساتھ باتیں کرتی ہیں ۔نماز کی حقیقت و اہمیت کاعالم یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جنگ صفین میں دشمن سے جہادو برسرے پیکار ہونے کے ساتھ سخت گرمی کی حالت میں سورج کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تاکہ اگر ظہر کاوقت آپہنچا ہے تو نماز کے لئے کھڑے جائیں ۔ابن عباس سوال

---

[1] المیزان ،ج۱۶(طبع اسما عیلیان)ص۱۳۳

[2] نہج البلاغہ(فیض الاسلام)خ۲۱۳،ص۷۰۳

کرتے ہیں،کیا کر رہے ہو ؟ حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں'' :انظر الی الزوال حتی نصلی''(آسمان کی طرف) دیکھ رہا ہوں کہ اگر وقت زوال ہوگیا ہے تو نماز پڑھوں۔ابن عباس کہتے ہیں : کیا یہ نماز پڑھنے کا وقت ہے؟اس وقت تو جنگ و جہاد نے نماز پڑھنے کیلئے کوئی فرصت باقی نہیں رکھی ہے !حضرتؑ جواب میں فرماتے ہیں'' :علی مانقا تلہم؟ انما نقاتلہم علی الصلوٰۃ[1]''مگر ہم ان سے کس لئے لڑرہے ہیں ؟ہم تو ان کے ساتھ نماز کے لئے ہی تو لڑرہے ہیں''!جی ہاں، علی علیہ السلام کی نظر میں نماز کی اتنی عظمت و بلندی ہے کہ کوئی چیز ان کے لئے نماز سے منہ موڑنے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔اس کے علاوہ آپؑ کی نظر میں عالم عبادت ،لذتوں سے لبریز ہے،ایسی لذت جو مادی لذتوں سے قابل موازنہ نہیں ہے۔آپؑ کی نظر میں،عالم عبادت سراسر نور ہے،اس میں تاریکی،کدورت اور اندوہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے اور عبادت بالکل نورانی اور خلوص ہے۔

آپؑ کی نظر میں خوش قسمت وہ ہے جو اس بے انتہا دنیا (دنیائے بندگی) میں قدم رکھے اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جان کو اس جان بخشنے والی حقیقت (ذات خدا) کے سپرد کردے،کیونکہ جس نے اس لامتناہی دنیا (دنیائے عبودیت) میں قدم رکھا ،اس کی نظر میں دنیا چھوٹی اور حقیر بن جاتی ہے ،یہاں تک وہ دشمن سے جنگ کی حالت میں نماز کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے،کیونکہ وہ ہر چیز کو نماز کے لئے چاہتا ہے اور نماز کو اس لئے چاہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ راز و نیاز اور گفتگو کرتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام عثمان بن حنیف انصاری کو ایک خط میں لکھتے ہیں'' :خوشا نصیب اس شخص کا کہ جس نے اللہ کے فرائض کو پورا کیا ۔ سختیوں اور مصیبتوں میں صبر کیا ،راتوں کو اپنی نیدوں سے پہلو تہی اختیار کی اور جب نیند کا غلبہ ہوا تو زمین کو بچھونا اور اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا لیا قیامت کے خوف نے جن کی آنکھیں بیدار پہلو بچھونوں سے الگ اور ہونٹ یاد خدا میں زمزمہ کرتے رہتے ہیں اور کثرت استغفار سے جن کے گناہ (پراگندہ بادلوں کی طرح)چھٹ گئے ہیں[2]''یہی اللہ کا گروہ ہے۔اور بیشک اللہ کا گروہ ہی

---

[1] بحار الانوار، ج، ۸۰، ص، ۲۳

[2] نہج البلا غہ(فیض الاسلام مکتوب نمبر ۴۵ ،نمبر ۱۵ ،ص۹۷۴

کامیاب کامران ہونے والاہے[1] ج۔مقدمات شرعی ہونے کا فلسفہ اور نماز کی طرف متوجہ کرنے والے عوامل نماز کی اہمیت اورانسان ومعاشرہ کی سلامتی میں اس کے مؤثر ہونےکے پیش نظر،خدائے متعال نے اس کو بہتر صورت میں انجام دینے کے لئے بعض مقدمات قرار دئے ہیں اور اس کے لئے بعض آداب معین کئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بندے اس کو یاد کریں اور اس کی عبادت کی اہمیت کو درک کریں ۔انسان کو کسی کار خیر کو انجام دینے کے لئے، پہلے جاننا چاہئے؛کہ وہ کام خیر ہے کہ نہیں اس کے بعد اس کے بارے میں فکر کرے.ہم بہت سے امور کے نیک ہونے کے بارے میںآگاہ ہیں۔

لیکن ان کو وقت پرانجام دینا بھول جاتے ہیں ہمیں نماز کو بھولنے سے بچانے کے لئے، خدائے متعال نے بعض مقدمات معین کئے ہیں، مثلا اذان کو نماز کے لئے واجب قرار دیا اور تاکید فرمائی کہ اسے ترک کرنے سے اجتناب کریں ۔اس کے علاوہ ایک اور عبادت کو اذان کے نام پر معین فرمایا،یہ نماز کا مقدمہ اور اس کی یاددہانی کرنے والی ہے اور فرمایا کہ اذان کو بلندآواز میں کہوتاکہ دوسرے لوگ نماز اور اس کے وقت کے ہو جانےکے بارے میں متوجہ ہو جائیں اور ان میں نماز کو قائم کرنے کے لئے شوق پیدا ہو جائے۔

اگر چہ نماز کے شرعی ہونے کی بنیاد اور اس سلسلہ میں نقل ہوئی آیات وروایات ،سب انسان کو نماز کی اہمیت اور موقعیت کو سمجھنے کے لئے مدد کرتی ہیں ،لیکن جب نماز کے وقت اذان کی آواز بلند ہو تی ہے تو لوگوں کی توجہ نماز کے وقت اوراس کی اہمیت کی طرف مبذول ہو تی ہے اور یہ لوگوں کو نماز کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک مؤثر سبب ہے ۔یہاں تک بہت سے ایسے لوگ جو نماز کو اول وقت پر پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں ،جب کسی کام کو انجام دینے میں سرگرم ومشغول ہوتے ہیں تو ممکن ہے نمازکو انجام دینے سے غافل ہوجائیں اور بھول جائیں کہ نماز کا وقت آپہنچا ہے،لیکن جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو خواہ نخواہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔پس شریعت میں اذان اوراس کو بہ آواز بلند کہنے کی تاکید، دوسروں کو نماز کی طرف توجہ اور تذکر دلانے کے لئے ہے

[1] مجادلہ،۱۲۲

اور یہ بذات خود دوسروں کو اول وقت پر عبادت انجام دینے کی دعوت ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اول وقت میں نماز پڑھنے کی فضیلت کے بارے میں فرماتے ہیں'':اذا صلّیت صلاۃ فریضۃ فصلھا لو قتھا صلاۃ مودّع یخاف ان لا یعود الیھا ابدا''[1] ۔''جب تم واجب نماز پڑھنا چاہو تو اسے اول وقت میں اس شخص کی طرح بجالاؤ جس کا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آپہنچا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں پھر سے نماز پڑھنے کی اسے فرصت میسر نہ ہو،اسی طرح ابن معود سے نقل ہوا ہے'' : سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :ایّ الاعمال احب الی اللہ عز وجل ؟قال :الصلوۃ لوقتھا[2]'' ''میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا :کونسا عمل خدائے متعال کے نزدیک بہتر و محبوب تر ہے ؟تو حضرت نے فرمایا (محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک) اول وقت میں نماز پڑھنا ہے ۔''پھر بھی خدائے متعال نے لوگوں میں عبادت اور بندگی کی روح کو ایجاد کرنے کے لئے مزید تشویق کی خاطر نماز کے لئے خاص زمان ومکان معین فرمائے ہیں ۔مثلا شب اور روز جمعہ کو عبادت کے لئے معین فرمایا ہے اور خود روز جمعہ کو عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے،انسان کو عبادت انجام دینے اور بیہودہ کاموں سے پرہیز کرنے کی طرف ترغیب و تلقین کرتا ہے۔

اسی طرح جو فضیلت خدائے متعال نے ماہ ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے لئے قرار دی ہے وہ بذات خود خدا کی عبادت کی یاد دہانی ہے کیونکہ ان چالیس دنوں (ایک ماہ ذی القعدہ اور دس روز ذی الحجہ)تک حضرت موسی علیہ السلام کوہ طور پر عبادت پروردگار میں مشغول رہے ہیں خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا ہے:(وواعدنا موسی ثلثین لیلۃواتممناھا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ وقال موسی لأخیہ ہرون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین[3]) ''اور ہم نے موسیؑ سے تیس راتوں کا وعدہ لیا اورپھر مزید دس راتوں کا اضافہ کیا تا کہ اس طرح ان کے رب کا وعدہ چالیس راتوں کا مکمل ہو جائے اور انھوں نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم قوم میں میری نیابت کرو اور اصلاح کرتے رہواور خبر دار مفسدوں کے راستہ کا اتباع نہ کرنا ''حضرت موسی

[1] بحار الانوار،ج۸۰،ص۱۰
[2] بحارالانوار ، ج۸۰، ص۱۳
[3] اعراف ۱۴۲

علی نبینا وعلیہ السلام نے چالیس دن عبادت میں گزارے وہ (اربعین کلیمیہ) کے نام سے مشہور ہیں اور اہل سیر وسلوک ان کیلئے فراوان اہمیت کے قائل ہیں اور ان کے لئے خاص آداب واحکام ذکر کئے ہیں اور اس کے دوران بیشتر عبادت میں مشغول رہتے ہیں،چونکہ ہماری احادیث کے منابع میں اربعین کے بارے میں ایک خاص اہمیت ذکر ہو ئی ہے، مثلا ایک روایت میں آیا ہے'' :من أخلص للہ اربعین یوما فجر اللہ ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ''[1] اجوچالیس روز تک خدائے متعال کی مخلصانہ عبادت کرے ،خدائے متعال اس کے دل سے حکمت کے چشمے زبان پر جاری فرمائے گا ۔ (چالیس دن تک عبادت کرنا یا چالیس حدیث حفظ کرنا وغیرہ کے بارے میں فراوان فائدے ذکر کئے گئے ہیں۔)اسی طرح مبارک ایام ،عیدیں، احیاء (بیداری)کی راتیں اور ماہ رمضان المبارک ایسے امتیازات اور خصوصیات رکھتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ اور ان زمانوں سے مربوط مواقع کو درک کرنا لوگوں کو بیشتر خدا کی یاد میں مشغول کرے اور وہ زیادہ سے زیادہ عبادت کریں اور وہ سمجھ لیں کہ ان کی سعادت خدا کی بندگی اوراس کی عبادت میں ہے،اور شائستہ نہیں ہے کہ انسان خدائے متعال سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ کرے ۔

ما در خلوت بہ روی خلق ببستیم

از ہمہ باز آمدیم وباتو نشستیم

ہرچہ نہ پیوند یار بود بریدیم

وآنچہ نہ پیمان دوست بود شکستیم

در ہمہ چشمی عزیز ونزد تو خواریم

[1] بحار الانوار،ج۷،ص۲۴۹

در ہمہ عالم بلند وپیش تو پستیم (ہم نے خلوت اور تنہائیوں میں لوگوں سے منہ موڑ لیا ہے ۔ سب کو چھوڑ کے تیرے حضور آبیٹھے ہیں ۔جو بھی دوست کاپیوند نہ تھا اسے ہم نے پھاڑ دیا ۔اور جو بھی دوست کا عہد و پیمان نہ تھا اسے توڑدیا ، ہم سبھی کی نظروں میں عزیز ہیں لیکن تیرے حضور میں ذلیل وخوار ہیں،تمام دنیا میں بلند لیکن تیرے سامنے پست ہیں)مسجد، لقاء اللہ کے عاشقوں کے کی معراج:خاص زمانوں کے علاوہ خدائے متعال نے عبادت کیلئے چند خاص مکان بھی عبادت کے لئے معین فرمائے ہیں،کہ جب لوگ ان مکانوں کو دیکھتے ہیں اور ان میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں خود بخود خدا اوراس کے عبادی فریضہ کی یاد آتی ہے اس لحاظ سے ان مکانوں کا وجود ،خدا کے طرف توجہ کرنے اور اس کی بندگی کے لئے زیادہ شوق پیدا کرتا ہے،کلی طور پر مسجدیں اس قسم کا رول ادا کرتی ہیں۔اگر چہ انسان کے لئے نماز کو بجالانا ہر جگہ پر غصبی جگہوں یا ایسی جگہوں پر، جہاں کسی وجہ سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے،کے علاوہ جائز ہے، لیکن اسلام میں سخت تاکید کی گئی ہے کہ انسان واجب نمازوں کو مسجد میں پڑھے اور مسجد میں رفت وآمد کے لئے پابند رہے،خاص کر ہمسایہ کی مسجد میں،چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''لا صلوۃ لجار المسجد الا فی مسجدہ''[1] ''مسجد کے ہمسایہ کی نماز قبول نہیں ہے،مگر مسجد میں ۔ ''روایتوں میں کی گئی تاکید وں کے پیش نظر فقہا نے مسجد کے ہمسایوں کے لئے مسجد میں نماز پڑھنے کو مستحب موکد اوراس کے ترک کرنے کو مکروہ جانا ہے۔

مرحوم آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی فرماتے ہیں:مسجد کے ہمسایہ کے لئے عذر کے بغیر اس مسجد کے علاوہ کہیں اور نماز پڑھنا مکروہ ہے[2]۔ پس انسان کو ہمیشہ مسجد میں حاضر ہونا چاہئے تاکہ نماز کو مسجد میں پڑھے اور مسجد کے مقام ومنزلت اور اس کے آداب و احترام کی رعایت اور اس میں عدم حضور کی قباحت کے بارے میں فکر کرے اور یہ بھی سوچ لے کہ مسجد میں حاضر ہونے اور وہاں پر نماز پڑھنے کے ثواب کے علاوہ خدائے متعال نے مسجد کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور اپنے بندوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت دیکر انھیں اپنا مرہون منت بنایا تاکہ وہ اس میں حاضر ہوکر مستفید و باریاب ہوں،کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے ۔

---

[1] وسائل الشیعہ ،ج ۳، ص ۴۷۸

[2] عروۃالوثقی ،امام خمینی رضوان اللہ تعالی علیہ کے حاشیہ کے ساتھ ،ص ۲۱۱

فطری بات ہے کہ تمام زمین خدائے متعال کے نزدیک یکساں ہے اور کوئی ایک جگہ دوسری کی نسبت خدا سے زیادہ نزدیک نہیں ہے پس کعبہ اور مسجد کے خدا کا گھر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ خداوند متعال کا ان مکانات کے ساتھ برتاؤویسا ہی ہے جیسا ہم اپنے گھروں سے رکھتے ہیں ۔یعنی خدائے متعال نے ان مکانات کواپنی ملاقات اور انس اور زیارت کی جگہ قرار دیا ہے اور اپنے بندوں اور زائرین کو وہاں پر اپنی ملاقات سے سرفراز کرتا ہے اور ان سے بات کرتا ہے اس کے علاوہ جس جگہ کے بارے میں ہم مسجدبنانے کا ارادہ کریں اور اسے خدائے متعال سے منسوب کریں اورجس جگہ کو بھی ہم اسکی ملاقات اس کے وہاں حاضر ہونے اور اسکی زیارت کے لئے قرار دیں وہ اسے قبول کرتاہے اور یہ اس معنی میں ہے کہ ملاقات اور زیارت کی جگہ کو معین کرنا بھی ہمارے ذمہ رکھا ہے اور یہ خدائے متعال کی طرف سے ہمارے لئے سب سے بڑی سخاوت اور مہربانی ہے۔پس مسجدوں کا سب سے بڑا رول ،انسان کا خداوند متعال کی طرف توجہ کرنا اور ان میں عبادت و بندگی کی حس کو اجاگر کرناہے ،اگر چہ سب مسجدیں رتبہ اور مقام کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور اہمیت کے لحاظ سے بعض مسجدوں کی عظمت بلند ہے ۔

حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''مذہب اسلام میں تاکید کی گئی ہے کہ نماز کو مسجد میں پڑھا جائے،تمام مسجدوں میں سب سے بہتر مسجد الحرام ہے، اس کے بعد مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،اس کے بعد مسجد کوفہ ،اس کے بعد بیت المقدس، اس کے بعد ہر شہر کی جامع مسجد اسکے بعد محلہ کی مسجد،اور اس کے بعدبازار کی مسجد ہے[1]۔''

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''اربعۃمن قصور الجنۃ فی الدنیا :المسجدالحرام،و مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ومسجد بیت المقدس ومسجد الکوفہ[2]'' یہ چار مسجدیں دنیا میں قصر بہشت ہیں، مسجد الحرام، مسجد النبی، مسجد بیت المقدس، مسجد کوفہ ۔یہ چار مسجدیں اس قدر عظیم اور مقدس ہیں کہ حتی بعض روایتوں میں تاکید کی گئی ہے کہ انسان دور ونزدیک راستوں سے سفر کر کے ان مساجد کی زیارت کرے اور ان میں اعتکاف کرنے کا ثواب ہے ۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں ''لو یعلم الناس مافی مسجد الکوفہ لأعدوالہ الزاد والرواحل من

[1] رسالہ توضیح المسائل،مسئلہ ۸۹۳
[2] وسائل الشیعہ،ج۳ ص۵۴۵

مکان بعید ان الصلاۃ فریضۃ فیہ تعدل حجۃ وصلاۃ نافلۃ فیہ تعدل عمرۃ[1]''اگر لوگ مسجد کوفہ کو پہچانتے،تو دور دراز منزلوں سے اس مسجد میں پہنچنے کے لئے زاد راہ اور سواری کا انتظام کرتے ۔اس مسجد میں ایک واجب نماز کا ثواب حج کے ثواب کے برابر اور ایک مستحب نماز کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہیں۔یا یہ کہ مسجدالحرام کی اس قدر عظمت ہے کہ مسلمانوں کی قبلہ گاہ یعنی کعبہ اسی میں قرار پایا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نماز کو اس مسجد اور خانہ کعبہ کی طرف بجا لائیں۔ اس کے علاوہ مستطیع ہونے والوں پر اسکا حج کرنا واجب ہے اوراس مسجد میں ایک رکعت نماز کا ثواب دوسری مسجدوں میں دس لاکھ رکعتوں کے ثواب کے برابر ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے'':صلاۃ فی مسجدی تعدل الف صلاۃ فی غیرہ وصلاۃ فی المسجد الحرام تعدل الف صلاۃ فی مسجد[2]'''' میری مسجد میں ایک رکعت نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ہزار رکعتیں پڑھنے کے برابر ہے اور مسجد الحرام میں ایک رکعت نماز پڑھنا میری مسجد میں ہزار رکعتیں نماز پڑھنے کے برابر ہے''اس کے علاوہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اس مسجد مقدس کی فضلیت میں فرماتے ہیں'':من صلّی فی المسجد الحرام صلاۃمکتوبۃ قبل اللہ منہ کل صلاۃ صلاہا منذیوم وجبت علیہ الصلاۃ وکل صلاۃ یصلیہاالی ان یموت[3]'''' جس شخص نے ایک واجب نمازکو مسجدالحرام میں بجا لایا،تو خدائے متعال اس پر واجب ہونے کے دن سے پڑھی گئی تمام نمازوں کواور آئندہ مرتے دم تک پڑھی جانی والی تمام نمازوں کو قبول فرماتاہے ۔''

مذکورہ مسجدوں کے علاوہ کچھ اور مسجدیں بھی بافضیلت ہیں،یہاں تک حدیث قدسی میںآیا ہے'':قال اللہ تبارک و تعالیٰ:ان بیوتی فی الارض المساجد ،تضیٔ لاہل السماء کما تضیٔ النجوم لاہل الارض۔ الا طوبیٰ لمن کانت المساجد بیوتہ الا طوبیٰ لعبد توضأ فی بیتہ ثم زارنی فی بیتی الاان علی المزور کرامۃالزائر۔ لابشر المشائین فی الظلمات الی المساجد بالنور الساطع یوم القیامۃ[4]''پروردگار عالم فرماتاہے:زمین پر مسجدیں میرا گھر ہیں جو اہل آسمان کے لئے اسی طرح چمکتی ہیں جس طرح اہل زمین کے لئے ستارے چمکتے ہیں ۔خوشا نصیب ان کیلئے

[1] وسائل الشیعہ،ج۳ ص۵۲۵
[2] وسائل الشیعہ، ج۳،ص ۵۴۵
[3] وسائل الشیعہ، ج۳،ص ۵۳۶
[4] وسائل الشیعہ ،ج۱،ص۲۶۸

جنھوں نے مسجدوں کو اپنے گھر قرار دیا ہے ۔ خوشا نصیب اس بندے کے لئے ،جو اپنے گھر میں وضو کرتا ہے اور اس کے بعد میرے گھر پر میری زیارت کرتا ہے ۔آگاہ ہوجاؤ کہ جس کی زیارت کی جاتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زائر کا احترام کرے اور اس پر احسان کرے ۔جو لوگ رات کی تاریکی میں مسجد کی طرف قدم بڑھاتے ہیں انھیں قیامت کے دن ایک چمکتے نور کی بشارت دو ۔ مسجدوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی حکمتیں:لوگوں کو مساجد کی طرف متوجہ کرنے کی فراوان حکمتیں ہیں،ان کو کلی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۱۔اجتماعی حکمتیں:جب کی مسجد کو مرکزیت مل جائیگی اور روزانہ چند مرتبہ لوگ وہاں جمع ہوں گے یا جمعہ کے دن لوگوں کاایک پر شکوہ اجتماع مسجد میں اکٹھا ہوگا تو معاشرے کو بہت ساری اجتماعی،اقصادی اور سیاسی برکتیں نصیب ہوں گی۔ اور مسلمان صدر اسلام سے آج تک ان منفعتوں اور برکتوں سے بہرہ مند ہوتے آئیں ہیں۔

مسجد، پوری تاریخ میں فکری ،مذہبی ،سیاسی اور اقصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مرکز رہی ہیں اس کے علاوہ مساجد اسلام کی غنی ثقافت کی ترویج اور معاشرے کے لئے ضروری علوم سیکھنے کا مرکز رہی ہیں۔ اس کے علاوہ مسجدیں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے جنگجوؤں اور مجاہدین کا مرکز رہی ہیں۔ ہم کلی طور پر مسجد کے لئے چار اہم نقش کے قائل ہو سکتے ہیں:الف۔عبادت اور خداکی یاد کا مرکز

ب۔ فکری جہاد اور تعلیم و معارف اسلامی سیکھنے کا مرکز ۔

ج۔ مسلمانوں کی وحدت اورآشکار و مخفی دشمنوں سے مقابلہ کے لئے اتحاد و یکجہتی کے مظاہرہ کا مرکز ۔

د ۔ لشکر اسلام اور مجاہدین کے جمع ہونے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے ان کو محاذ جنگ پر روانہ کرنے کا مرکز ۔

۲۔انفرادی حکمتیں: مذکورہ مطالب کے علاوہ ،مسجد خود ایک فرد کے لئے بھی بہت سی برکتیں رکھتی ہے.جب کوئی شخص مسجد سے گزرتا ہے اور اس میں داخل ہوتا ہے تو اس میں عبادت کے لئے مزید آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ پس مسجد تذکر دینے کی جگہ ہے جو انسان

کو خدا اور عبادت کی یاد دلاتی ہے۔ حتی اگر انسان یاد خدا سے غافل بھی ہو، جب وہ مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے یا مسجد کے گنبد یا مینار کو دیکھتا ہے،تووہ متوجہ ہوتا ہے کہ یہاں پر خدا کا گھر ہے اور فوراً اسے خدا کی یاد آتی ہے۔جو خدائے متعال کی بندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں، ان میں عبادت کے شوق کو اجاگر کرنے والے عوامل پیدا ہوتے ہیں اس لحاظ سے وہ عوامل، اس کے تکامل وارتقاء کے لئے بہترین وسیلہ ہیں،اور انسانوں کو زیادہ سے زیادہ خدا اور اس کی عبادت کی طرف مائل کرنے والے عوامل میں عبادت وبندگی کے لئے مشخص کئے گئے مخصوص مکان بھی ہیں۔اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ انسان اپنے گھر میں بھی نماز خانہ یا مصلی کے طورپر ایک جگہ کو معین اور مشخص کرلے اور اس بات کا دھیان رکھے کہ وہ جگہ نجاست سے آلودہ نہ ہو،جب انسان نماز کے لئے مخصوص کی گئی اس جگہ یا نماز کے لئے بچھائی گئی جانماز کو دیکھتا ہے،اسے خدا کی یاد آتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '':کان علی علیہ السلام قد جعل بیتا فی دارہ لیس بالصغیر ولا بالکبیر لصلاتہ وکان اذا کان اللیل ذہب معہ بصبی لا یبیت معہ فیصلی فیہ[1]'' ''امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے گھر میں ایک متوسط قسم کا کمرہ نماز کے لئے قرار دیا تھا اور جو بچہ شب میں بیدار ہوتا تھا اسے ساتھ لے کرنماز پڑھنے کے لئے اس کمرہ میں جاتے تھےاور نماز پڑھتے تھے۔'' گھر کے نمازخانہ کے علاوہ،شہر اور محلہ کی مسجدیں بھی یاد دہانی کرانے والی ہیں اور انسان کوخدا کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ان وسائل میں سے ہیں کہ جنھیں خدائے متعال نے انسان کے لئے کمال وسعادت کی راہ میں قرار دیا ہے۔

اس لحاظ سے جب کسی جگہ پر مسجد تعمیر ہوتی ہے،تو لوگوں کو اس میں جانے کی تشویق کرنا چاہئے اور مسجد میں جانے کاثواب اور مسجد کی طرف جانے کے لئے ہر کے لئے جو ثواب ہیں،انھیں بیان کیا جاناچاہئے تا کہ لوگوں میں مسجد میں جانے کاشوق پیدا ہو، انھیں کہنا چاہئے کہ مسجد میں حاضر ہونا ثواب میں اضافہ ہونے اور گناہ کے نابود ہونے کا سبب ہے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '':قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ومن مشی الی مسجد یطلب فیہ الجماعۃ کان لہ بکل خطوۃ سبعون الف حسنۃ ویرفع لہ من

[1] وسائل الشیعہ،ج ۳ ،ص ۵۵۵

الدرجات مثل ذلک[1]،'' ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو نماز میں شرکت کرنیکی نیت سے مسجد کی طرف قدم بڑھا تا ہے ،خدائے متعال اس کے ہر قدم کے عوض میں ستر ہزار ثواب پاداش (جزا) کے طور پر دیتا ہے اور اسی قدر اس کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں'' مساجد کی اہمیت کو درک کرنے کی ضرورت اور ان میں حاضر ہونے کے آداب: پیغمبر اکرم ﷺ کی اس حدیث میں نصیحتوں کا ایک حصہ مومنین کو مسجد میں حاضر ہو کر اس کے معنوی برکات سے بہرہ مند ہونے کے لئے تشویق کرنے پر مشتمل ہے۔

اس کا ایک اور حصہ مسجد میں حاضر ہونے کے آداب سے مربوط ہے کہ کس طرح مسجد سے بہتر استفادہ کیا جائے، ہمیں کن قواعد وضوابط پر عمل کرنا چاہئے تاکہ خدا نخواستہ اس الہی اور عظیم نعمت سے محروم نہ ہو جائیں، کیونکہ بعض اوقات انسان اس قدر غفلت اور شیطان وسوسوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ خیر و سعادت کے وسائل کو اپنے ہی ہاتھ سے شر اور تاریکی کے وسائل میں تبدیل کر دیتا ہے :(الم تر الی الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا[2]۔) ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفران نعمت سے تبدیل کر دیا'' جی ہاں،انسان کے لئے یہ خطرہ موجود ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے خدا کی ایک نعمت کو کفران نعمت میں تبدیل کردے اور خیر ونیکی کے وسیلہ کو شر کے وسیلہ میں تبدیل کرے ۔

لہذا جب لوگ مسجد میں جانے اور مسجد کی طرف قدم بڑھانے کے ثواب شمار کرتے ہیں تو چاہئیے کہ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی یاد دہانی کرائی جائے کہ وہ مسجد سے مناسب استفادہ کرنے کی کوشش کریں اور اس بات کی طرف متوجہ رہیں کہ کس لئے مسجد میں آئے ہیں تاکہ خدا نخواستہ دنیوی امور ، خرید و فروش، گران وارزان،ڈالر اور زمین کی قیمت جیسی چیزوں کی گفتگو میں مشغول نہ ہو جائیں اور اس بات کو بالکل ہی فراموش کرجائیں کہ کہاں ہیں اور کس لئے آئے ہیں !اس لحاظ سے مسجد کے لئے کچھ مخصوص آداب معین ہوئے ہیں تاکہ ان کی رعایت سے انسان غفلت میں مبتلا نہ ہو اور مسجد کی برکات سے محروم نہ رہے ۔

---

[1] وسائل الشیعہ ،ج ۵،ص ۳۷۲

[2] ابراہیم ۲۸

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات پر غور و تحقیقات سے پہلے ہم ایک نکتہ کی طرف یاد دہانی کرانا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے جب انسان مسجد جانیکا ارادہ کرتا ہے، تواسے اپنی استعداد کے مطابق مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کو جاننے کی کوشش کرنا چاہئے، کیونکہ جس قدر معرفت ہوگی، اسی قدر عمل کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوگا اور ادب کی رعایت خود بندہ کے لئے خدائے متعال سے قریب ہونے کا سبب ہے، اس کے علاوہ جو شخص مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کی رعایت کرتا ہے، اس کا عمل قرب الٰہی اور اعمال کے قبول ہونے کا سبب واقع ہوتا ہے ہمیں جاننا چاہئے کہ جب ہم مسجد میں حاضر ہوتے ہیں تو گویا ہم خدائے متعال کی چوکھٹ پر وارد ہوتے ہیں اور اس کے حضور میں ہوتے ہیں اور مناسب ہے حضرت حق کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے آداب کو اپنے بزرگوں اور محترم شخصیتوں کے وہاں حاضر ہونیکے آداب کو معیار قرار دیں اور دیکھیں کہ جب ہم کسی محترم بزرگ شخصیت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، تو کس طرح خضوع و خشوع کے ساتھ نیز انکساری اور احساس کم تری کی کیفیت ہم پر طاری ہوتی ہے عع۔ اس کے پیش نظر کہ بزرگوں کی عظمت خدائے متعال کی عظمت سے قابل موازنہ نہیں ہے اور اسی طرح خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کی نسبت بزرگوں کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب سے قابل موازنہ نہیں ہے ۔مذکورہ مطالب کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کے حق کی رعایت کرنے کی طاقت نہیں رکھتاہے ۔

اس لحاظ سے ہم خدا کے حضور میں حاضر ہونے کے آداب کی رعایت نہیں کر سکتے ہیں پس کم از کم اتنا تو دیکھ لیں کہ ہماری رفتار کیسی ہے اور اپنی کوتاہیوں کو مد نظر رکھیں کہ یہی مختصر اقدام ہمارے لئے خدا کے کرم کا دروازہ کھلنے کا سبب بنے گا ۔

حضرت امام صادق علیہ السلام ایک مفصل حدیث میں، مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کو یوں بیان فرماتے ہیں: جب کسی مسجد کے دروازہ پر وارد ہو، تو جان لو کہ تم نے ایک ایسے سلطان وبادشاہ کی ملاقات کا ارادہ کیا ہے جس کی بساط پر پاک و پاکیزہ لوگوں کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا ہے اور اس کی مصاحبت کے لئے صدیقین اور اچھے کردار والوں کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں

دی گئی ہے اور جب اسکی بساط پر قدم رکھو ،تو جان لو کہ اگر معمولی سی غفلت تم سے سر زد ہوئی تو تم ایک بڑے خطرے اور خطرناک گڑھے کے دہانے پر واقع ہو اور یہ بھی جان لو کہ وہ اپنے عدل یا فضل سے تمھارے ساتھ معاملہ کرے گا ۔پس اگر اس نے مہربانی کی اوراپنے فضل و رحمت سے تمھارے ساتھ معاملہ کیا تو وہ تمھاری معمولی اطاعت کو بھی قبول کرلے گا اور اس کے مقابلہ میں تجھے ثواب دے گا اور اگر وہ تجھ سے اپنے عدل سے معاملہ کرنا چاہے اور جس چیز کے تم مستحق ہو وہ تمہیں عطا کرے تو وہ تمہیں تمہاری اطاعت سمیٹ واپس کردے گا چاہئے جس قدر بھی زیادہ ہو، مسترد کر دے گااوروہ جو چاہے گا وہ انجام دیگا ۔پس اسکی بارگاہ میں اپنی عاجزی،کوتاہی اور فقر کا اعتراف کرو،کیونکہ تم نے اسکی عبادت اور اس سے انس کی نیت کی ہے ۔

اپنے اسرار کواس کے سامنے پیش کروا اور جان لوکہ وہ تمام مخلوقات کے پنہاں وآشکار امور کے بارے میں علم رکھتاہے اور ایک ذرہ بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور تم اس کے حضور میں ایک فقیر ترین بندہ کے مانند رہو اوراپنے دل کو ان تمام چیزوں سے پاک کر و جو تجھے اپنی طرف مشغول کرے اور تیرے اوراس کے درمیان حجاب اور مانع ہو، کیونکہ وہ پاکیزہ ترین اور مخلص ترین دلوں کے علاوہ کسی کو قبول نہیں کرتا ہے اور اچھی طرح دیکھ لو کہ تمھارا نام کس رجسٹر میں درج ہے۔پس اگر تم نے اس کے ساتھ مناجات کی حلاوت کو چکھا اور اسکے ساتھ گفتگو میں لذت کا احساس کیااور اس کی رحمت وکرامت کے جام نوش کئے،تو یہ اسکی طرف تجھے قبول کرنے اور تیری دعوت کو اجابت کرنے کی نشانی ہے اوراس صورت میں جان لوکہ تم اس کی خدمت میں جانے کے سزاوار ہوپس تم مسجد میں داخل ہوجاؤ کہ تجھے پروانہ اذن وامان مل گیا اور اگر ایسا نہ ہوا تو تم ایک ایسے دربدر شخص کی طرح ہو کہ جس کے لئے تمام دروازے بند کردیئے گئے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے ۔

تمھیں جان لینا چاہئے کہ اگراسے معلوم ہو جائے کہ تم نے حقیقت میں اس کے یہاں پناہ لی ہے، تو وہ تجھے مہربانی، رحمت اور کرم کی نگاہ سے دیکھے گا اور تجھے اپنی مرضی سے کامیاب بنا دے گا،کیونکہ وہ کریم اور عظمت والا ہے اور اپنے ایسے بندوں سے عطوفت و محبت کرتاہے جو بے چارہ مضطرب حالت میں اس کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر اس کے لطف وکرم کے لئے امید وار

ہوتے ہیں،کیونکہ وہ خود فرماتاہے'':امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء[1] ۔'' ''بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتاہے؟ جب وہ اس کو آواز دیتاہے اوراسکی مصیبت کو دور کردیتاہے ۔ ' پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں حاضر ہونے کی تشویق کے لئے فرماتے ہیں '':یا اباذر!الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ وکل خطوۃتخطوہا الی الصلوٰۃ صدقۃ'' ''اے ابوذر !نیک گفتاراور جو بھی قدم نماز کیلئے اٹھاؤ گے وہ صدقہ ہے'' ''صدقہ '' ان عناوین میں سے ہے جس کو اسلامی ثقافت میں مختلف صورتوں میں پیش کیا گیاہے اور اس کی اہمیت واضح ہے،جب کہتے ہیں کہ فلاں کام صدقہ ہے ،تو اس کا مفہوم و معنی یہ ہو تا ہے کہ اس کام کی غیر معمولی اہمیت ہے اوراس کا بہت زیادہ ثواب ہے ۔

اس لحاظ سے جب کسی چیزکی عظمت کو بیان کرنا چاہتے ہیں توکہتے ہیں : یہ کام صدقہ ہے ۔ من جملہ جب نیک اور شائستہ بات ہم کسی سے کہنا چاہتے ہیں،تو کہتے ہیں صدقہ ہے،تاکہ اسے کم اہمیت نہ سمجھیں اور توجہ رکھیں کہ ہم نے جب کسی سے اچھی بات کہی جواس کے کام کی تھی اور اسے خدا کی طرف متوجہ کرنے والی تھی نیز ،برے کام سے باز رکھنے والی تھی یا ایسی بات جو ایک غمزدہ اور پریشان مومن کے لئے خوشنودی کا باعث ہو اور اس کی ناامیدی اور افسردگی کو برطرف کردے تو ایسی بات مطلوب اور خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے اگر خدا وند عالم کی اطاعت کے قصد سے انجام دی جائے تو عبادت ہے ۔ پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہرنیک بات صدقہ ہے اور اس کے بعد فرماتے ہیں جو بھی قدم مسجد کی طرف اٹھاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے اور اس کے بعد بحث کا محور مسجد ہے ۔

فطری بات ہے کہ جب ایک انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان کے مفہوم و معنی سے آگاہ ہوگیااور اس نے یقین کر لیا کہ جو بھی قدم وہ مسجد کی طرف اٹھائے گا وہ صدقہ ہے اور اس بہت زیادہ اجر اور ثواب ہے ،تو مسجد اس کے گھر سے چاہے جتنی دور ہو پھر بھی مسجد میں جانے کے لئے وہ عجلت کرے گااور اس کے لئے مسجد میں جانا مشکل نہیں ہوگا اور بہانہ نہیں کرسکتا کہ مسجد

[1] نمل،۶۲

دور ہے، چونکہ وہ جانتا ہے کہ جتنی زیادہ مسجد اس کے گھر دور ہوگی اتنی زیادہ وہاں جانے کا ثواب زیادہ ہوگا ۔اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں حاضر ہونے کے آداب کے بارے میں فرماتے ہیں ''یا اباذر !من اجاب داعی اللہ و احسن عمارۃ مساجد اللہ کان ثوابہ من اللہ الجنۃ''اے ابو ذر !جو شخص خدائے متعال کی طرف دعوت کرنے والے کی بات پر لبیک کہے اور مسجد کو آباد کرنے میں اچھی طرح حصہ لے، تو خدا کی طرف سے اس کی پاداش (جزا)بہشت ہے۔ظاہراً خدا کی طرف بلانے والے سے مقصود وہ مؤذن ہے جو اذان کہتا ہے،کیونکہ وہ خدا کی طرف سے لوگوں کو خدا کے گھر کی جانب دعوت دیتاہے اور اس کا کام یہ ہے کہ بلند آواز میں اذان کہے اور اعلان کرے کہ نماز کا وقت آپہنچا ہے تاکہ لوگ عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہو جائیں۔ اگر کسی نے اس کی دعوت قبول کی یعنی اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف روانہ ہوا ،تو اس نے مسجد کو آباد کرنیکی کوشش کی،اس کی پاداش بہشت ہے۔ابتدا میں کسی مسجد کو تعمیر کرنے سے مراد یا اس کو آباد کرنے کسی ویران ہونے والے کی مسجد کی حفاظت اور مرمت کا مسئلہ انسان کے ذہن میں آتا ہے،لیکن اس معنی کا گزشتہ جملہ کے ساتھ کوئی تناسب نہیں ہے۔

اس بناپر عمارت یعنی مسجد کو آباد کرنے کا معنی، تعمیر اور مرمت کے معنی سے وسیع تر ہونا چاہئے ۔(عمارت مسجد)کا عنوان جو قر آن مجید اور روایا ت میں استعمال ہوا ہے ،لغوی معنی میں مسجد کی ابتدائی تعمیر بھی ہے اور اس کی محافظت بھی ہے اور اس کے علا وہ اس کی زیا رت کرنے اور مسجد میں رفت و آمد کے معنی میں بھی آیا ہے، ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل کی گئی ایک روایت میں ان تینوں معنی کے بارے میں تاکید کی گئی ہے:مسجد تعمیر کرنا،اس کی مرمت کرنا مساجد میں رفت وآمد کی مزید تاکید کی گئی ہے ۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر لگتا ہے کہ جناب ابوذر بھی متوجہ ہوئے کہ ''عمارت مسجد '' کے عنوان سے مسجد تعمیر کرنے، ظاہری طور پر آباد کرنے اور مرمت و محافظت کے علاوہ کوئی دوسرا معنی بھی مد نظر ہے اور اسی لئے کیفیت عمارت کے بارے میں سوال کرتے ہیں ۔چونکہ اگر عمارت سے مسجد کو تعمیر کرنا مقصود ہوتا تو جناب ابوذر کے لئے کوئی ابہام باقی نہ تھا کہ سوال کرتے۔جناب ابو ذرؓ پوچھتے ہیں :اے اللہ کے رسول !میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں،ہم مسجد کو کیسے آباد کریں ؟پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم جواب میں فرماتے ہیں'' :لا ترفع فیہا الاصوات ولا یخاض فیہا بالباطل ولا یشتری فیہا ولا یباع واترک اللغو ما دمت فیہا فان لم تفعل فلا تلوا من یوم القیامۃ الا نفسک'' (مسجد کو آباد کرنا اس معنی میں ہے کہ) اس میں آواز بلند نہ ہو،باطل اور بیہودہ کام کو انجام دینے سے پرہیز کیا جائے،اس میں خرید فروخت نہ کیا جائے اور جب تک مسجد کے اندر ہے لغو بیان سے پرہیز کرے ورنہ قیامت کے دن اپنے علاوہ کسی اور کی سرزنش نہ کرے ۔مذکورہ جملوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کے لئے چار اخلاقی اور تربیتی قواعد وضوابط کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:ا۔مسجد میں شور مچانے اور بلند آواز سے بات کرنے سے پرہیز !کیونکہ مسجد عبادت کی جگہ ہے ممکن ہے اونچی آواز میں بات کرنا دوسروں کے ہواس کے مختل ہونے کا سبب ہوتا ہے اور ممکن ہے عبادت گزار نماز و عبادت میں اپنی فکر کو متمرکز نہ کرسکیں۔

اس کے علاوہ کسی اجتماع میں اونچی آواز میں بولنا ایک قسم کی بے ادبی شمار ہوتا ہے اور مناسب ہے انسان مسجد میں شائستہ رفتار کا مظاہرہ کرے اور جو کام انسانی آداب کے متناسب نہ ہو اس سے پرہیز کرے ۔اس بنا پر مسجد کی آبادی کاری کا ایک مصداق یہ ہے کہ انسان اس میں وقار اور سنجیدگی کے ساتھ رہے اور خاموشی کی رعایت کرنیکی کوشش کرے اوراگر بات کرنا چاہتا ہے تو آہستہ بولے تاکہ دوسروں ۔جو نماز یا دوسرے کام میں مشغول افراد کے لئے رکاوٹ نہ بن جائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں آواز کو بلند کرنے سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں'' :اذا فعلت امتی خمس عشرۃ خصلۃ حل بہا البلاء۔قیل:یا رسول اللہ ما ہن؟قال:اذا ارتفعت الاصوات فی المساجد[1] ''جب میری امت میں پندرہ خصلتیں رائج ہو جائیں ان پر بلا نازل ہوگی،ان خصلتوں میں سے ایک مسجد میںآواز بلند کرنا ہے''

۲۔باطل اور بیہودہ گفتگو سے پرہیز کرنا :مسجد خدا کا گھر اور عبادت کی جگہ ہے اور مسجد میں باطل اوربیہودہ باتیں کرنا اورایسی نا مناسب باتیں کرنا جو بالکل نا جائز ہیں،ان کی مذمت کی گئی ہے،کیونکہ یہ مسجد کے لئے ایک قسم کی بے احترامی اور اس کی شأن کی

[1] تحف العقول،باب مواعظ النبی وحکمہ،ص۵۲

رعایت نہ کرنے کے برابر ہے۔ جیسا کہ کوئی کسی کے گھر میں مہمان ہو اور میزبان کے دشمنوں کی بات کرے اور ان کی ستائش کرے اور ایسے موضوعات پر بات کرے کہ میزبان کے لئے اذیت و تکلیف کا باعث یا ایسا کام انجام دے جو صاحب خانہ کو پسند نہ ہو یقیناًاس قسم کی رفتار انسانی ادب کے خلاف ہے۔

مہمان کو میزبان کے حقوق کی رعایت کرنی چاہئے اور ایسا برتاؤ کرے کہ جس سے میزبان کو خوشی و مسرت ہو،خدائے متعال یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کے بندے ایسی بحثیں اور گفتگو کریں جو ان کیلئے مضر ہوں اور ان کی سعادت کو خطرہ میں ڈالتی ہو اس کے علاوہ مسجد میں بیہودہ کام کرنا اورباطل باتیں کرناکہ جو،مسجد کی حیثیت کو فراموش اور مائمال کرنے کا سبب ہے،کیونکہ جب مسجد میں بیٹھ کر بیہودہ باتیں کرتے ہیں،تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہاں پر مسجد ہےاور کس لئے وہاں گئے ہیں۔

۳۔مسجد میں خرید و فروخت سے پرہیز کرنا :خرید و فروخت اور وہ امورجو مشغلہ شمار ہوتے ہیں،جیسے :آہنگری، بخاری اور نائی وغیرہ کاکام،مسجد میں انجام دینا ممنوع ہے ۔حضرت امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں ‘‘:جنبوا مساجد کم البیع والشراء[1] ’’‘‘اپنی مسجدوں کو خرید و فروخت کی جگہ قرار نہ دو’’تجارت،خرید و فروخت اور معاشرے کی ضروریات نیز اپنے مشغلوں کو انجام دینے کے لئے بازار بنائے گئے ہیں اور مسجد عبادت کے لئے مخصوص ہے اور اس میں دنیوی کام جیسے،خرید و فروخت انجام نہیں دینا چاہئے ۔ فطری بات ہے جب مسجد بھی خرید وفروخت اور تجارت کی جگہ ہو جائےگی تو وہ یاد دہانی اور موعظہ و نصیحت کے پہلو سے عاری ہو جائے گی اور نہ صرف یہ کہ انسان کو خداکی یاد نہیں دلائےگی بلکہ اس کی توجہ دنیا اور کسبِ معاش اورآمدنی کی طرف زیادہ مشغول کردے گی،اس لحاظ سے مسجد کو بازاراور محل تجارت میں

تبدیل کرکے اس سے مناسب استفادہ نہیں کیا جاسکتاہے ۔مسجد خدا وند متعال کے ذکر کی جگہ ہےاوراسلام کی اس پر تاکید ہے کہ یہ مکان مقدس ہر اس کام سے خالی ہو جانا چاہئے جو لوگوں کی توجہ کو غیر خدا کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنے ۔تاکہ اس میں ذکر

[1] وسائل الشیعہ ، ج۳، ص۵۰۷

وعبادت کا موقع مکمل طورپر فراہم ہوسکے ۔ اس لئے کسبِ معاش والے کام، جیسے آہنگری اور نجاری وغیرہ بھی مسجد میں انجام دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے،ایک روایت میں آیا ہے ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرّ برجل یبری مشاقص لہ فی المسجد فنہا ہ و قال :انہا لغیر ہذا بنیت[1]''''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں ایک آدمی کو اپنا تیر تیز کر تے ہوئے دیکھا آپؐ نے اسے اس کام سے منع کرتے ہوئے فرمایا :مسجد کوان کاموں کے لئے تعمیر نہیں کیا گیا ہے''حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '': ان امیر المؤمنین علیہ السلام رأی قاصا فی المسجد فضر بہ بالدرۃ وطردہ[2]'''' امیرالمومنین نے مسجد میں ایک نائی کو کہ جو حجامت بنانے میں مشغول تھا کوڑے مارکر مسجد سے نکال باہر کیا''

۴۔مسجد میں لغو کام انجام دینے سے پرہیز :پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفارش کرتے ہیں کہ مسجد میں بیہودہ باتیں نہ کرو اور لغو کام انجام دینے سے پرہیز کرو ۔کوشش کروکہ مسجد میں تمھاری رفتار مطلوب ہوتاکہ خدائے متعالی کو پسند آئے اورپاداش،ثواب اور کمال کا سبب بنے ۔جو کام تمھارے نفع میں نہ ہو،کم ازکم انھیں مسجد میں انجام نہ دو اس کے علاوہ انسان کو ہر جگہ پرلغوگفتار ورفتار سے پرہیز کرنا چاہئے اور مومنین کے اوصاف یہ ہیں کہ وہ لغویات سے پرہیز کرتے ہیں:(قد افلح المومنون الذین ہم فی صلاتہم خاشعون والذین ہم عن اللغو معرضون) ''یقیناً صاحبان ایمان کامیاب ہوگئے ،جو اپنی نمازوں میں گڑ گڑانے والے ہیں، اور لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں''،مومن کوبنیادی طور پرلغوکام انجام نہیں دینا چاہئے اوراسے اپنی عمر کو بیہودہ ضائع نہیں کرنا چاہئے، لیکن چونکہ عام لوگ کم وبیش بیہودہ کام بھی انجام دیتے ہیں اورکم ازکم ایسے مباح کام بھی انجام دیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، انھیں کوشش کرنی چاہئے کہ ان کاموں کو مسجد میں انجام دینے سے پرہیز کریں اور مسجد کو عبادت سے مختص رکھیں تاکہ مسجد کی شان و عظمت محفوظ رہے اور خود اس سے زیادہ تر معنوی استفادہ کریں ،تاکہ مسجد کے حوالے سے موعظہ و نصیحت اور ہدایت کرنے کا پہلو باقی رہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ،ج۳ص۴۹۶

[2] وسائل الشیعہ،ج۳ص۵۱۵

حدیث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :اگر تم مسجد کے آداب کی رعایت نہیں کی تو قیامت کے دن صرف اپنی مذمت کرنا ۔ اس دن انسان کو سمجھ میں آئے گا کہ مسجد سے کونسے فائدے اٹھا سکتا تھا ۔انہی لمحات سے کہ وہ جب مسجد میں بیٹھتا تھا ،کس قدر اپنی آخرت کے لئے استفادہ کر سکتا تھا ،لیکن نہ صرف اس نے اس سے استفادہ نہیں کیا بلکہ اس کے بر عکس ایسا کام انجام دیا کہ جس سے اپنی آخرت تباہ کر لی ۔اس وقت وہ ایک ایسی حسرت سے دو چار ہو گا کہ جو قابل توصیف نہیں ہے ۔مسجد میں حاضر ہونے اوراس میں عبادت کرنے کی فضیلت ''یا اباذر!ان اللہ تعالی یعطیک مادمت جالسا فی المسجد بکل نفس تنفست درجۃ فی الجنۃ''اے ابو ذر !جب تک تم مسجد میں ہو ،خدائے متعال تمھاری ہر سانس کے بدلے میں بہشت میں تمھارے لئے ایک درجہ عطا کرتا ہے ۔ہمارے گھر سے نکلنے اور مسجد کیطرف روانہ ہونے کے بعد جب ہم مسجد کے آداب کی رعایت کرتے ہیں اور اپنی نماز پڑھتے ہیں،تو ہمیں مزید تاکید کی گئی ہے کہ نماز تمام کرنے کے فورا بعد اٹھ کر نہ چلے جائیں ،بلکہ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ وقت تک مسجد میں رہیں ،کیونکہ جب تک ہم مسجد میں ہیں خدائے متعال ہماری لی گئی ہر سانس کے بدلے میں بہشت میں ہمارے لئے ایک درجہ عنایت کرتا ہے ۔

اگر ہم نے وہاں پر قرآن مجید کی تلاوت کی ،خدا کا ذکر کیا اور عبادت و سجدہ میں مشغول رہے تو ان اعمال کے ثواب بھی ہمیں ملیں گے اور اس کے علاوہ مسجد میں ہمارا سانس لینا بذات خود سبب بنتا ہے کہ خدائے متعال ہمارے لئے بہشت میں ہر سانس کے بدلے میں ایک درجہ عطا کرے کیونکہ یہی ہمارا سانس لینا خدا کی عبادت کی نیت سے تھا اور اس غرض سے تھا کہ ہم خدا کی خوشنودی کے لئے مسجد اوراس کے گھر میں ٹھہرے ہیں اور جو بھی کام ہم خدا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اور اس کی اطاعت کی غرض سے انجام دیتے ہیں ،وہ عبادت ہے اور ہر عبادت کے بدلے میں بہشت میں ایک درجہ ہے ۔

لیکن ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ اس سانس لینے کا ثواب جو عبادت کے عالم ہو نہ کہ دنیوی امور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سانس لینا عبادت ہے ۔کہا گیا کہ مسجد میں رکنا اور وہاں پر سانس لینا مستحب ہے اور اس کا ثواب ہے،لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے

ہم اپنے تمام کارو بار کو چھوڑ کر مسجد میں معتکف (اعتکاف کرنے والا)بن جائیں ۔ ممکن ہے دو مستحب کاموں کے درمیان تزاحم و تضاد وجود میں آئے،اس معنی میں کہ انسان ان دو میں سے صرف ایک کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہو ،اس صورت میں ہمیں جو زیادہ مستحب کام ہے اس کو انجام دینا چاہئے، بعض او قات ممکن ہے مستحب اور واجب کے درمیان تزاحم وتضاد پیدا ہو تو اس صورت میں واجب کو انجام دینا چاہئے اور مستحب کو چھوڑ نا چاہئے ۔ اس بنا پر اگر کسی مستحب عمل کو بہت زیادہ بجالانے کی سفارش کی گئی ہے،تو وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر کسی واجب کام سے مزاحم و معارضہو تو بھی و اجب کو چھوڑکر مستحب کو انجام دیں ،ہمیں اس مطلب کی طرف توجہ رکھنی چاہئے ۔

جب کسی عمل کے حسن کو بیان کرتے ہیں تو وہ حسن اس عمل کی ذات سے مربوط ہوتا ہے یعنی دوسرے عمل سے تزاحم اور مزاحمت کے بغیر ،اس لحاظ سے ممکن ہے ایک بات یا اس کا بیان کا ظاہرا مطلق ہو،لیکن دوسری عبادت سے یا کسی دوسرے واجب عمل سے تزاحم وتضاد رکھتا ہے تو اس صورت میں وہ مستحب کام مطلوبیت سے گرتا ہے اوراسے انجام نہیں دینا چاہئے ۔پس اگر اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ انسان زیادہ دیر تک مسجد میں ٹھہرا رہے ،تو یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ درس و بحث اوراپنے ضروری کام کو چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جائے اور ذکر خدا کرتا رہے ۔

واجب درس و بحث کو مسجد میں بیٹھنے یا ذکر کرنے یا مستحب عبادت انجام دینے کے لئے نہیں چھوڑا جاسکتاہے اور یہ درس و بحث کے جانشین نہیں بن سکتے ہیں اور کسی بھی وقت کوئی مستحب عمل واجب کی جگہ نہیں لے سکتا ہے ،ضروری اور واجب تکالیف اور فرائض اہمیت کے حامل ہوتے ہیں انھیں مسجد میں بیٹھنے اورذکر کے بہانے سے ترک نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ ''وتصلی علیک الملائکۃ وتکتب لک بکل نفس فیہ عشر حسنات و تمحی عنک عشر سیئات''، 'اور فرشتے تجھ پر درود بھیجتے ہیں اور تیری ہر سانس کے بدلے دس حسنات لکھے جاتے ہیں اور دس گناہ زائل کئے جاتے ہیں'' جو کچھ بیان ہوا وہ مسجد میں بیٹھنے کے فائدے سے مربوط تھا ،چونکہ مسجد عبادت کی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر انسان خدا کی طرف توجہ کرتا ہے ۔

اس لحاظ سے روایتوں میں مسجد کوآخرت کا بازار کہا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ انسان دوسروں سے پہلے مسجد میں داخل ہو اور سب سے آخرمیں مسجد سے خارج ہو ''؛ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم لجبرئیل:ای البقاع احب الی اللہ تعالی؟قال: لمساجد واحب اہلہا الی اللہ اولہم دخو لا الیہا وآخرہم خروجا منہا '' ''پیغمبر اسلامؐ نے جبرئیل سے سوال کیا: کونسی جگہ خداکے نزدیک محبوب تر ہے؟ جبرئیل نے عرض کی :مساجد،اور اہل مسجد میں سے محبوب ترین بندہ وہ شخص ہے جو سب سے پہلے مسجد میں داخل ہو تاہے اور سب سے آخرمیں مسجدسے خارج ہوتاہے ''''یاابا ذر!اتعلم فی ای شی ء انزلت ہذہ اآایۃ:((اصبروا و صابروا ورابطواواتقوا اللہ لعلکم تفلحون))قلت:لا فداک ابی وامی۔قال : فی انتظار الصلوٰۃ خلف الصلوٰۃ ''''اے ابوذر !کیا تم جانتے ہو کہ آیۂ مبارکہ: اے ایمان والو !صبر کرو،صبرکی تعلیم دو، جہاد کے لئے تیاری کرو اور اللہ سے ڈرو شاید تم فلاح یافتہ اور کامیاب ہو جاؤ ''،کس سلسلہ میں نازل ہوئی ہے ؟میں نے کہا : نہیں معلوم،میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپؐ نے فرمایا :نماز کے بعد نماز کے لئے انتظار کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے''آیہ مبارکہ میں '' مرابط '' کے معنی ومفہوم کے بارے میں گوناگوں تفسیریں کی گئی ہیں۔

اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ چونکہ ''مرابط '' لفظ ''ربط ''باندھنے کے معنی میں بھی اور لفظ ''رباط '' کسی چیز کو کسی جگہ پر باندھنے کے معنی میں بھی آیا ہے،جیسے: گھوڑے کو ایک جگہ پر باندھنے اوراس کے بعد گھوڑوں کو قطار میں کھڑا کرنے اورانھیں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرنے کے معنی میںآیا ہے۔اس لحاظ سے ''مرابط ''سرحدوں کی حفاظت اور ہوشیاری اوردشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہونے کے معنی میں ہے،لیکن اس آیت اوراس سے قبل والی آیتوں پر دقت کرنے سے آیت کا ایک وسیع تر معنی معلوم ہوتا ہے جو اسلامی ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور دفاع کے معنی کو بھی شامل ہے اور ایمان وعقائد کی سرحدوں کے مقام کے معنی میں بھی آیا ہے،اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض احادیث میں علمااور دین کے دانشمندوں نے اسکی تعبیر ''مرابطوں ''یعنی سرحد وں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '':علماء شیعتنا مرابطون

بالثغر الذی یلی ابلیس وعفاریتہ ویمنعونہ عن الخروج علی ضعفاء شیعتنا وعن ان یتسلط علیہم ابلیس[1]''''ہمارے شیعہ (پیرو) علماء ان سرحد ی محافظوں کے مانند ہیں جوابلیس کی فوج کے سامنے صف بستہ کھڑے ہیں اور اپنے دفاع کی طاقت نہ رکھنے والے افراد پر ان کے حملوں کو روکتے ہیں''دانشمندوں اور علما کے علاوہ ایسے محافظ بھی ہیں جو سرحدوں کی محافظت کرتے ہیں چونکہ جغرافیائی سرحدوں کے محافظ ہیں اور علماء عقائد اسلامی ثقافت کے محافظ ہیں ،اور یقیناً جس امت کی ثقافت اور عقائد کی سرحدوں پر غیروں کا حملہ ہو اوروہ اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں، تو انھیں مختصر مدت کے اندر عقیدہ وثقافت کے لحاظ سے شکست اٹھانا پڑے گی اور اس کے علاوہ سیاسی اور عسکری حاظ سے بھی انھیں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ ''مرابط''جسکے بارے میں کی گئی تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ ہر نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا اور پے در پے نماز بجالانا،اس کے علاوہ ''مرابط'' مسجد میں رفت وآمد کے معنی میں بھی آیا ہے،چونکہ

مساجد میں رفت وآمد انسانوں اور مومنوں کے دلوں کے درمیان روابط کا سبب بنتا ہے۔

''یااباذر!اسبا غ الوضوء فی المکارہ من الکفّارات وکثرۃ الاختلاف الی المساجد فذلکم الرباط''''اے ابوذر! مشکلات میں (جیسے سردیوں میں) ٹھیک طرح سے وضوکرنا کفارات میں سے ہے اور مسجدوں میں زیادہ جانا ''رباط''ہے کہ آیت میں اس کا حکم ہواہے''،جب موسم سرد ہو تو وضو کرنا مشکل ہے،اگر کوئی شخص اس حالت میں ہمت و شادابی کے ساتھ وضو کرنیکی کوشش کرے تو اس کا یہ وضوگناہوں کا کفارہ ہوتاہے ۔یہ سرد موسم میں سرد پانی سے وضوکی فضیلت کے پیش نظر ہے،چنانچہ ایک اور روایت میں بھی آیا ہے'': قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ألاادلّکم علی شی یکفر اللہ بہ الخطایا ویزید فی الحسنات ؟قیل:بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال اسباغ الوضوء علی المکارہ وکثرۃ الخطا الی ہذہ المساجد وانتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ[2]''''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیاتم آمادہ ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی چیز کی راہنمائی کروں جو گناہوں کے بخش دیئے جانے اور حسنات اور خوبیوں کی افزائش کا سبب ہو؟

---

[1] بحا رالانوار،ج۲،ص۵
[2] وسائل الشیعہ،ج۱،ص۲۶۷

عرض کی :جی ہا یا رسول اللہ، فرمایا: مشکلات میں صحیح طریقہ سے وضو کرنا مساجد میں بہت زیادہ پیدل جانا اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ''خدا کے محبوب ترین بندے:پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں ''ا:یا اباذر! یقول اللہ تبارک وتعالی:ان احب العباد الی المتحا بون من اجلی،المتعلقة قلوبہم بالمساجد والمستغفرون بالاسحار اولئک اذا اردت باہل الارض عقوبة ذکرتہم فصرفت العقوبة عنہم''''اے ابوذر!خدائے متعال فرماتا ہے :میرے نزدیک محبوب ترین بندے وہ لوگ ہیں جو میرے لئے ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرتے ہیں۔

وہ جن کے دل مسجدوں سے وابستہ ہیں اور سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں ۔یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر اہل زمیں پر کوئی عذاب نازل کرنا چاہتا ہوں تو ان لوگوں کی وجہ سے اس عذاب کو روک دیتا ہوں''جی ہاں،خدائے متعال اپنے محبوب ترین بندوں جن کے دل مسجدوں سے وابستہ ہیں اور مسجد میں جانیکی فرصت کے انتظار میں ہوتے ہیں اور نصف شب کو اپنے پروردگار سے راز ونیاز کرتے ہیں،ان کی وجہ سے معاشرے سے بلاؤں اور عذاب کو اٹھا لیتا ہے۔اس کے علاوہ کہ وہ قیامت کے دن بلند مقامات اور بے شمار ثواب حاصل کریں گے ،ان کے وجود کے آثار میں معاشرے سے عذاب کا دور ہونا بھی ہے ۔اس کے علاوہ معاشرے کے حوالے سے اس گروہ کے اور بھی بہت سے آثار ہیں کہ یہ سب آثار مسجد میں رفت وآمد اور خدائے متعال کی طرف توجہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔

انسان کو مسجد سے انس و محبت اور رفت وآمد کے نتیجہ میں جو فائدہ نصیب ہوتا ہے ،وہ صرف ثواب اخروی اور دوسری دنیا میں نعمت الٰہی تک ہی محدود نہیں ہے،بلکہ مسجد میں رفت وآمد کے طفیل میں اسی دنیا میں بھی انسان کے لئے اخلاقی، علمی ،تربیتی،اجتماعی وسیاسی حتی فراوان مادی فوائد ہیں ۔ امیرالمومنین علیہ السلام،مسجد میں رفت و آمد کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے بعض قابل قدر اور تعمیری آثار کے بارے میں فرماتے ہیں'':من اختلف الی المساجد اصاب احدی الثمان:اخاً مستفاداً فی اللہ اوعلما مستظر فا اوآیة

محکمتا و یسمع کلمۃ تدل علی ہدی او رحمۃ او کلمۃ تردہ عن ردی او یترک ذنبا خشیتا وحیاء[1] '' جو مسجد میں رفت وآمد کرتا ہے (کم از کم) درج ذیل آٹھ امور میں سے ایک اسکے نصیب میں ہوتا ہے:ا۔ مومنین کے درمیان اخوت و برادری جس سے خدا کی راہ میں استفادہ کرے۔

۲۔ جدید علم و دانش تک رسائی۔

۳۔ قرآن مجید کی آیات کا علم و ادراک۔

۴۔ ایک ایسی بات کو سننا جو اس کے لئے ہدایت کی رہنمائی کرے۔

۵۔ ایک ایسی رحمت ،جس کا اسے انتظار تھا۔

٦۔ ایک ایسی بات جو اسے گمراہی اور ہلاکت سے بچائے۔

۷مسجد میںآمد و رفت کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا ہوئے خدا کے خوف کے نتیجہ میں گناہ کو ترک کرنا۔

۸۔ مسجد میں آشنا ہوئے اپنے مومن بھائیوں کی حیاء کی وجہ سے گناہ کو ترک کرنا۔ اس حدیث کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '' :یا اباذر!کل جلوس فی المسجد لغو الاثلاثۃ :قراءۃ مصل اوذکر اللہ او سائل عن علم '' ''اے ابو ذر!تین صورتوں کے علاوہ مسجد میں بیٹھنا بے فائدہ ہے :یا حالت نماز میں قرائت قرآن میں مشغول ہو،یا خدا کی یاد میں ذکر کہتا ہو،یا علم سیکھنے میں مشغول ہو'' مسجد میں رفت وآمد کی یہ سب تاکیدیں،مسجد میں حاضری دینے کے معنوی اور مادی آثار کو گننا اور مسجد میں سانس لینے کے ثواب کا شمار کرنا اس لئے ہے کہ انسان مسجد کو خدا سے رابطے اور معنویت حاصل کرنے کا مرکز قرار دیتا ہے اور اپنے معنوی تکامل و اور سعادت کو اس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے ورنہ اگر آخرت سے مربوط کوئی کام نہ ہو تو ،اسے مسجد میں انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہئے ۔اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں انجام دینے والے شائستہ اور مثبت کاموں کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے ہیں

[1] بحار الانوار،ج۸۳ص،۳۵۱

اور ان کے علاوہ کسی کام کو مسجد میں انجام دینے کو لغو جانتے ہیں:الف۔ انسان نماز میں مشغول ہواور اس میں قرآن مجید پڑھے یا اس کے بعد قرآن مجید پڑھنے میں مشغول ہو۔

ب۔خدائے متعال کے ذکر کو زبان پر جاری کرے یا قلبی توجہ خدا کی طرف مرکوز ہو۔

ج۔مسجد میں علوم معارف سیکھنے میں مشغول ہونا اور مسجد کو علم و آگاہی کی ترویج اور اس کی نشر و اشاعت کا مرکز قرار دینا،کہ اس صورت میں تیرا کام بھی نتیجہ بخش و قیمتی ہو گا اور تیرے درجات میں اضافہ ہو گا اور یہ تمھاری ابدی خوش قسمتی کا سبب ہو گا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کے اس حصہ میں مساجد کی اہمیت،اس میں رفت وآمد کرنیکی ضرورت،اس میں عبادت کرنے والوں کی فضیلت اور مسجد سے مناسب استفادہ کرنے کے بارے میں جوکچھ فرمایا ہے اس کے پیش نظر مناسب ہے کہ مسجد،یعنی خدا کے گھر کوزیادہ سے زیادہ اہمیت دیں اور کوشش کریں کہ مساجد کو آباد رکھیں اور ہمیں ڈرنا چاہئے کہ قیامت کے دن یہ مسجد ہماری بے اعتنائی کی وجہ سے شکایت نہ کرے۔

چنانچہ امام جعفر صادق علیہ اسلام فرماتے ہیں ''شکت المساجد الی اللہ الذین لا یشھد ونہا من جیرانہا فاوحی اللہ الیہا وعزتی وجلا لی لا قبلت لہم صلاتواحدة ولااظہرن لہم فی الناس عدالة ولانالتہم رحمتی ولا جاورونی فی جنتی[1]'' ''مساجد نے اپنے ہمسایوں کے ایک گروہ کی خدا سے شکایت کی جو اس میں حاضر نہیں ہوتے ہیں.خدا متعال نے ان مساجد کی طرف وحی کی:مجھے مرے عزت و جلال کی قسم ہے کہ ان کی ایک رکعت نماز بھی قبول نہیں کروں گا اور لوگوں میں ان میں کوئی عدالت آشکار نہیں کروں گا،انھیں میری رحمت نہیں ملے گی اور وہ بہشت میں میرے ہمسایہ اورنزدیک نہیں ہوں گے۔''

[1] وسائل الشیعہ ،ج۳،ص۴۷۹

تیرہواں درس

تقوی، زہد اور پرہیزگاری کی منزلت

''یا اباذر؛کن بالتقوی اشد اہتماما منک بالعمل فانہ لایقل عمل بالتقوی، وکیف یقل عمل یتقبل؟ یقول اللہ عزوجل: (انما یتقبل اللہ من المتقین[1])، یا اباذر؛ لایکون الرجل من المتقین حتی یحاسب نفسہ اشد من محاسبۃ الشریک شریکہ فیعلم من این مطعمہ و من این مشربہ و من این ملبسہ؟امن حل ذلک ام من حرام یا اباذر؛ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال اللہ عزوجل من این ادخلہ النار یا اباذر؛ من سرہ ان یکون اکرم الناس فلیتق اللہ عزوجل. یا اباذر؛ ان احبکم الی اللہ جل ثناؤہ اکثرکم ذکرا لہ و اکرمکم عند اللہ اتقاکم لہ و انجاکم من عذاب اللہ اشدکم لہ خوفا. یا اباذر؛ ان المتقین الذین یتقون من الشی الذی لایتقی منہ خوفا من الدخول فی الشبہۃ.یا اباذر؛ من اطاع اللہ عزوجل فقد ذکر اللہ و ان قلت صلاتہ و صیامہ و تلاوتہ للقرآن. یا اباذر؛ اصل الدین الورع و راسہ الطاعۃ. یا اباذر؛ کن ورعا تکن اعبد الناس و خیر دینکم الورع.یا اباذر؛ فضل العلم خیر من فضل العبادہ و اعلم انکم لو صلیتم حتی تکونوا کالحنایا و صمتم حتی تکونوا کا لأوتار ما ینفعکم الا بورع. یا اباذر؛ اہل الورع والزہد فی الدنیا ہم اولیاء اللہ حقا)پیغمبر اسلام ﷺ کے کلام کے اس حصہ کا موضوع تقوی ہے۔ تقوی کے گوناگوں مواقع کے بارے میں اخلاق کی کتابوں میں فراواں بحثیں ہوئی ہیں۔اس سے پہلے بھی ہم نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔اس میں آنحضرت ﷺ کے کلام کے بعض بنیادی مطالب کو بیان کریں گے جن کو تقوی کے سلسلہ میں اس کے مقدمہ کے طور پر بیان کرنا مناسب ہے۔

تقوی کا مفہوم او رخوف سے اس کا رابطہ:لفظ ''تقوی'' مادہ ''وقایہ'' سے اور فعل ''اتقی یتقی'' کا اسم مصدر ہے اور مصدر ''اتقاء'' کا معنی اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو کسی خطرہ سے روکنا ہے۔ ''اتقاء'' کی تین اسم مصدر ہیں ان میں سے دو قرآن

[1] بقرہ ۱۹۴

مجید میں استعمال ہوئے ہیں،یعنی ''تقوی'' اور ''تقاۃ'' اور اس کا تیسرا اسم مصدر ''تقیہ'' ہے۔ اور یہ تینوں لغت میں ایک ہی معنی میں ہیں(نہج البلاغہ میں کبھی ''تقیہ'' تقوی کی جگہ استعمال ہوا ہے) ''اتقاء'' باب افتعال کا مصدر ہے اور مادہ ''وقایہ'' سے لیا گیا ہے اور چونکہ کہا گیا کہ ''تقوی'' اتقاء کا اسم مصدر ہے کہ جو اصل میں ''وقوی'' تھا اور اس کے بعد اس کا ''فاء الفعل'' ''تا'' میں تبدیل ہوا، جیسے ''تراث'' اصل میں ''وراث'' تھا ۔پس یہ ''تقوی'' ہوا، جو لغت میں اپنے آپ کو خطرہ سے روکنے کے معنی میں ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ خطرہ کیا ہے۔

لیکن جب کلمہ ''تقوی'' اخلاقی یا قرآنی مباحث میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا سے مراد وہ خطرہ ہے جس سے اپنے آپ کو روکنا چاہئے، یہاں پر ہر خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ ہے جو انسان کی سعادت و آخرت میں در پیش ہے۔ اگر چہ قرآن مجید میں ''اتقاء'' اپنے آپ کو اس خطرہ سے روکنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جسے دوسرے انسان کسی شخص کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں '': لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و من یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیٔ الا ان تتقوا منہم تقاۃ [1]''

'خبردار صاحبان ایمان، مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سرپرست نہ بنائیں کہ جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمھیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج بھی نہیں ہے''۔ لیکن جب بات تقوائے الٰہی کی ہو یا آیات و روایات میں مطلق تقوی و متقین کے بارے میں بات ہوتی ہے تو اس سے مراد تقوائے الہی ہے، او ر ایسے لوگوں سے گفتگو ہے جو دینی اور معنوی مسائل کے بارے میں خطرہ کا احساس کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے دین کے بارے میں موجود ہ خطرہ سے خائف ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ خود کو اس سے بچائیں، پس ''اتقاء'' کی بنیاد خطرہ کے بارے میں احساس خوف ہے۔ احساس خطرہ و خوف کے بعد انسان ایسا کام کرتا ہے تا کہ اس خطرہ سے محفوظ رہے اور کم از کم اس خطرہ سے دور رہے۔ اس معنی و مفہوم کو پرہیزگاری کہتے ہیں (حقیقت میں پرہیزگاری تقوی الہی کی شرط ہے، کیونکہ گناہ او ر خطرہ سے اپنے آپ کو بچانے کی شرط پرہیز اور اس خطرہ سے دوری اختیار کرنا

---
[1] آل عمران،۲۸

ہے) قرآن مجید میں بعض اوقات قیامت کا دن مطلق تقوی کے طور پر ذکر ہوا ہے کہ اس روز بُرے اعمال کے خطرات او رنتائج ظاہر ہوتے ہیں، چنانچہ خدائے متعال فرماتاہے:(واتقوا یوما لاتجزی نفس عن نفس شیئا[1]) ''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کا عوض اور بدلہ نہیں قرار دیا جائے گا۔ ''اور کبھی گناہوں کی وجہ سے انسان کو سزا دینے والا متعلق تقوی کے طور پر ذکر ہوا ہے، مثال کے طور پر ''واتقوااللہ ''کا معنی خدا سے پرہیز کرنااور اس سے دوری اختیار کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو خطرہ عذاب الٰہی کی طرف سے تم پر متوجہ ہوتا ہے، اسی سے پرہیز کرو۔ پس خدائے متعال سے خوف در اصل اس عذاب سے خوف ہے جس کا انسان کو اس کے برے اعمال کی وجہ سے سامنا کرناپڑتاہے۔ بہر حال تقوائے الٰہی کے معنی اس کے مبدأ کے پیش نظر خوف لیا گیا ہے او ر اس لحاظ سے خوفِ خدا بھی معنی کیا جاسکتا ہے۔ کبھی تقوی اس ملکہ کو بھی کہتے ہیں جو گناہ سے پرہیز او ردوری کی تکرار کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

لہٰذا جوانسان ایک بار گناہ سے دوری اختیار کرتاہے اسے متقی نہیں کہتے ہیں، لیکن جب ترک گناہ میں اس قدر ثابت قدم رہے کہ اس میں ترکِ گناہ کا ملکہ پیدا ہوجائے تو اسے متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی مبدا فعل کو تقوی کہتے ہیں کہ جو خوف خدا ہے اور کبھی ملکہ نفسانی کو کہتے ہیں جو گناہ سے پرہیز کی تکرار کی نتیجہ میں انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام تقوی کو ایک روحانی و معنوی حالت کے معنی میں ذکر فرماتے ہیں جوانسان کوگناہ و انحراف سے روکتی ہے۔

اگر یہ وہملکہ نفسانی ہے ۔تو خوف خدا کو اس کا ایک اثر تصور کرنا چاہئے'': عباد اللہ ان تقوی اللہ حمت اولیاء اللہ محارمہ والزمت قلوبہم مخافتہ حتی أسہرت لیالیہم و اظمات ہواجرہم۔[2]'' ''خدا کے بندو! تقوائے الٰہی خداکے دوستوں کو فعل حرام انجام دینے سے روکتا ہے اور (عذاب کے) خوف و ترس کو ان کے دل میں قرار دیتا ہے۔ راتوں کو (عبادت کے لئے) بیدار رکھتا ہے،او رشدت کی گرمی کے دنوں (روزہ رکھنے کے لئے) انھیں پیا سارکھتا ہے۔ ''ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں '':ذمتی بما

---

[1] بقرہ،١٢٣

[2] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ١١٣، ص، ٣٥٣

اقول ربیتۃ و انا بہ زعیم،ان من صرحت لہ العبر عما بین یدیہ من المثلات حجزتہ التقوی من تقحم الشبہات[1] ''''اپنی ذمہ داری کو اپنی بات کی ضمانت قرار دیتا ہوں اور اس طرح اپنی بات کے صحیح ہونے کی ضمانت دیتا ہوں۔ اگر انسان کے لئے گزشتہ عبرتیں آئندہ کا آئینہ قرار پائیں تو تقوی، مشکوک کاموں میں پھنسنے سے روکتا ہے۔''جی ہاں، تقوی ایک ایسے بندے کا سب سے بڑا ، سرمایہ ہے کہ اس کے خطرات سے پر خوف زدہ زندگی میں اور بلاؤں و گناہوں کے پر تلاطم سمندر کی خطرناک لہروں میں اس کی مدد کرتا ہے تا کہ وہ سعادت کی راہ کوتلاش کرے او راسے طے کرے کہ یہ راستہ تقوای الہی کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا ہے:نیست جز تقوی در این رہ توشہ ای نان و حلوا را بنہ در گوشہ ای (اس راستہ میں تقوی کے علاوہ کوئی اور زاد راہ نہیں ہے۔ تم روٹی اور حلوا کو ایک گوشہ میں رکھو)تقوی کی اہمیت اور اس کو حاصل کرنے کے راستے:تقوی کی اہمیت اور اس پر تاکید کی علت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر دین، پیغمبروں کا مبعوث ہونا اور آسمانی کتابوں کا نازل ہونا صرف اس لئے تھا کہ بشر اپنی سعادت کی راہ کو حاصل کر لے اور سنجیدگی کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوجائے تا کہ خلقت کا اصلی مقصد و ہدف یعنی آخرت کی بے شمار اور لا متناہی رحمتوں سے سرفراز ہو جائے ۔

لہٰذا اس ہدف تک پہنچنے کے لئے جس قدر موثر اقدام کرے گا اتنی ہی اس کی زیادہ اہمیت ہوگی اور دوسرے الفاظ میں چونکہ نبوت او رالہی شریعتوں کی حقیقت بشر کو راہ راست کی ہدایت کرنا ہے،اس لئے آیات الہی اور جو کچھ اولیائے الہی کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاہے، اس میں کوشش کی گئی ہے کہ لوگوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ ان احکام پر عمل کریں اور چونکہ انسان کے عمل کا سرچشمہ انسان کی نفسانی خواہش ہے، یعنی انسان کا اختیاری عمل اس کی خواہشات کا سرچشمہ ہے اور انسان کے ارادہ کی عمدہ بنیادیں خوف و امید میں پیوست ہوتی ہیں، پیغمبروں اوران کے جانشینوں نے اس راستہ سے استفادہ کیا ہے کہ ترس و امید کو انسان میں زندہ کریں اور انھیں ایک ایسی چیز کی طرف متوجہ کریں کہ جس میں انسان کی خلقت کا مقصد ہو۔تقوی کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہ

[1] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۶، ص ۶۶

ہونے کے بعد، یہ سوال پیدا ہوتاہے کہ تقوی کے پیدا ہونے کی راہیں کونسی ہیں؟ اور ہم ذیل میں خلاصہ کے طور پر تقوی کے پیدا ہونے کی تین راہوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ۱۔ مستقبل پر نظر: اس کے پیش نظر کہ تقوی انسان کے مستقبل کازادراہ ہے، اس لئے دور اندیشی اور عقلی تقاضے کے مطابق آئندہ کے لئے کوشش کرنے میں، حب ذات مشعل اور بیدار ہوتی ہے اور انسان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے آئندہ کے لئے تلاش کرے اور جو اس کے بے نہایت مستقبل کے لئے مفید ہو اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس لئے قرآن مجید فرماتاہے: (یا ایھاالذین آمنوا اتقوا اللہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد.[1]) '' ایمان والو؛ اللہ سے ڈور اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا بھیجاہے۔ ''

۲۔ انسان کے اعمال و رفتار پر خدا کے علم و آگاہی کی توجہ : یہ راہ مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے: (...واتقوااللہ ان اللہ خبیر بما تعلمون) '' اوراللہ سے ڈرتے رہو کہ وہ یقیناً تمھارے اعمال سے باخبر ہے''،یعنی خدائے متعال کی اس صفت کے پیش نظر کہ جو کچھ تم لوگ انجام دیتے وہ اس سے آگاہ ہے، تقوی کو اپنا لائحہ عمل بنا لو۔ یہ تربیت کی ایک اور روش ہے جسے خدائے متعال نے انسان کو مدد کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے تا کہ وہ تقوی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ چونکہ انسان خاص نفسیاتی خصوصیات کا مالک ہے، من جملہ ان میں یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہے کہ اس کے عمل پر اس کے علاوہ کوئی اور ناظر ہے اور جو کچھ وہ انجام دے رہاہے اسے وہ دیکھ رہا ہے اور اس کے برے بھلے سے آگاہ ہے، تو وہ ناشائستہ اعمال انجام دینے سے پرہیز کرتاہے۔

حقیقت میں خدائے متعال نے انسان کو ایسا خلق کیا ہے کہ کسی کے سامنے وہ، برا کام انجام دینے سے شرماتاہے۔ اس لئے اگر انسان اس موضوع پر غور وفکر کرے کہ وہ ہمیشہ خدا کے حضور میں ہے اور نہ صرف وہ اس کے ظاہری اعمال کا مشاہدہ کررہا ہے، بلکہ خدائے متعال اس تصور سے بھی واقف ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، تو وہ حتی اپنے دل میں خطور کرنے والے آلودہ خیالات سے بھی شرماتاہے انسان کسی کے بارے میں جس قدر احترام و عظمت کا قائل ہو،اس کا دل چاہتا ہے کہ اس کے

[1] حشر،۱۸

سامنے زیادہ پاک و صاف یعنی اپنی شخصیت کو اچھا جلوہ دے انسان کے اعمال سے مربوط خدا کے آگاہ ہونے کے بارے میں قرآن مجید مزید فرماتا ہے: (اولا یعلمون ان اللہ یعلم ما یسرون و ما یعلنون[1]) ''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خدا سب کچھ جانتا ہے، جس کا یہ اظہار کررہے ہیں اور جس کی یہ پردہ پوشی کررہے ہیں؟''

۳۔ یہ جان لینا کہ تقوی دنیا کے لئے بھی فائدہ مند ہے: (...و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب...[2])... ''اور جو بھی اللہ سے ڈرتاہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کرتاہے، اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا وہ خیال بھی نہیں ہوتا ہے۔''حضرت علی علیہ السلام بھی فرماتے ہیں'' :واعلموا انہ من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا من الفتن ونورا من الظلم.[3]'''' جان لو، جو تقوی کو اپنی زندگی کا دستور العمل قرار دیتا ہے اور خدا سے ڈرتا ہے تو خدا تعالی اسے فتنوں اورتباہیوں سے بچانے اور تاریکیوں میں اسے روشنراستہ دکھاتا ہے۔'' پہلے مرحلہ میں کہا گیا: غور کرو کہ اپنے آنے والے کل کے لئے کیا اکٹھا کررہے ہو،اس راہ میں فرماتا ہے: تقوی کے ان فوائد کو دیکھو جوتمھاری اس دنیا کے لئے ہیں۔ تم لوگ خواہ نخواہ اپنی پوری زندگی میں فتنوں، مشکلات، شعبدہ بازیوں، تاریکیوں اور ابہامات سے دوچار ہوتے ہو،اگر تم چاہتے ہو کہ خدائے متعال تمہیں اسی زندگی میں مدد کرے اور تمہیں ان مشکلا ت اور پریشانیوں سے نجات دلائے تو تقوی کو اپنا دستور بنا لو۔

با تقوی انسان جہاں پر اپنی فکر سے کسی راستہ کا انتخاب کرنا چاہتا ہے، خدا وند متعال اس کے لئے ایک نور ظاہر کرتاہے تا کہ وہ راستہ کو صحیح دیکھ سکے۔ اس لحاظ سے ہم کبھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے لئے پریشان کن اور حیرت انگیز مسائل پیش آتے ہیں او ر ان مواقع پر قوی فکر اور غیر معمولی ہوش رکھنے والے انسا ن پریشانیوں اور مشکلات سے بچنے کا راستہ نہیں نکال پاتے، لیکن جو بہت زیادہ عقل و شعور نہیں رکھتے وہ بچاؤ کاراستہ نکال لیتے ہیں، یہ حقیقت میں خدا کی مدد ہے جو تقوی کے ذریعہ اپنے بعض بندوں کو خدائے

---

[1] بقرہ۷۷
[2] طلاق، ۲۔۳
[3] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ، ۱۸۲، ص، ۶۰۲

متعال عنایت فرماتاہے۔تقوی اختیار کرنے کی تشویق کی تمام راستہ کے ذکرنے کے بعد تقوی کے نتائج اور آثار کا ذکر ضروریہے۔انسان اس وقت کسی کام کوانجام دینے یا کسی عزیز چیز کو ترک کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے، جب وہ جانتا ہے اس کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ وہ اس وقت ایک مشکل کام کو انجام دینے کے لئے حاضر ہوتا ہے جب وہ مطمئن ہو کہ اس کا نتیجہ اچھا ہے۔ لہٰذااگر ہم یہ چاہتے ہوں کہ دوسرے لوگ بھی بلندو بالا مقامات تک پہنچ جائیں اور اخروی ومعنوی نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز کریں، تو ہمیں ایسا کام کرنا چاہئے کہ ان میں ذوق و شوق پیدا ہو انسان کو گناہ کی لذت سے چشم پوشی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی محرک کا ہونا ضروری ہے، رات کے آرام کو چھوڑنے اور عبادت میں مشغول ہو جانے کے لئے محرک ہونا چاہئے۔ یا جہاں پر انسان کے فریضہ کا تقاضا ہو کہ لوگ محاذ جنگ پر جائیں اوراپنی جان کو خطرہ میں ڈالیں اور اسی طرح دوسرے فرائض کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، محرک کا ہونا ضروری ہے اور محرک پیدا کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انسان کو منافع اور اس کے آثار خیر کی طرف متوجہ کریں جو اس کے عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کی فطرت ان آثار کی طالب ہوتی ہے۔

انسان، معرفت و ایمان کے جس مرتبہ پر بھی فائز ہو، وہ خیر کا طالب ہوتا ہے اور اگراس کا ایمان اور اس کی معرفت ضعیف ہے تو، کم از کم وہ دنیا کی خیر چاہتا ہے، تمام لوگ وسیع رزق کے طالب ہوتے ہیں، وہ بھی زیادہ محنت و کوشش کے بغیر ۔ اس لحاظ سے تقوی کے محرک کو پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید اور اس حدیث میں ایک راستہ جو اختیار کیا گیا ہے وہ تقوی کے دنیوی منافع ہیں، کہ اگر کوئی شخص تقوی اختیار کرتا ہے توخدائے متعال اس کے سامنے سختیوں اور مشکلات سے نجات پانے کا راستہ قرار دیتا ہے ۔ بعض اوقات ممکن ہے انسان مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہو جائے اور نجات کی کوئی راہ نہ ہواور خود بھی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کوئی راستہ پیدا نہ کر سکے، تو وہ اس حالت میں تلخیوں اور سختیوں کے باوجود زندگی کی مشکلات کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتاہے۔ خدائے متعال اسے وعدہ دیتا ہے کہ اگر تقوی رکھتے ہو تو مشکلات اور سختیوں کے دوران تیرے لئے نجات کا ایک راستہ فراہم ہوگا۔یہ ایک بڑاوعدہ ہے جو خدائے متعال انسان کو دیتا ہے اور اسے تشویق کرتاہے کہ ایک ایسے راستہ کا انتخاب

کرے جس کا ثمرہ و نتیجہ مشکلات اور سختیوں سے نجات ہو۔ ایران کے مسلمانوں کے لئے جنگ کے دوران بعض اوقات انتہائی مشکل اور دشوارگزار مرحلے پیش آتے تھے اور کوئی ان پریشانیوں اور مشکلات سے رہائی اور نجات کا راستہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن چونکہ یہ انقلاب تقوی کی بنیاد پر معاشرے میں تقوائے الٰہی پھیلانے اور روح بندگی پیدا کرنے اور اللہ کی حاکمیت کو برقرار کرنے کے لئے انجام دیا گیا، اس لئے خدائے متعال مسلسل عنایتیں کار فرما رہیں اور ہر موڑ پر نجات کی راہ خدا کی جانب سے الہام ہوتی رہی کہ جس کے نتیجہ میں لوگ مشکلات سے نجات پاتے تھے، اس کا نمونہ ۲۲ بہمن بمطابق (۱۹۷۹ ع) کا دن ہے: جب طاغوتی حکومت نے مارشل لا کا اعلان کیا اور لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی سختی سے ممانعت کی تا کہ اپنی شیطانی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں، تو امام خمینی نے اپنی دور اندیشی اور الٰہی مدد سے تمام لوگوں کو سڑکوں پر آنے کا حکم دے دیا اور لوگ مارشل لا کی پروا کئے بغیر سڑکوں پر نکل آئے، جس کے نتیجہ میں دشمن کی تمام سازشیں طشت از بام ہوگئیں اور انقلاب اسلامی کامیابی سے ہم کنار ہوگیا۔

اس طرح خدائے متعال اہل تقوی کو ایسی راہ سے رزق پہنچاتا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ہم سب اپنے لئے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے فراہم کرنے کے لئے مکلف ہیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر محاسبہ کرتا ہے کہ کونسا کام انجام دے اور کونسا راستہ اختیار کرے تا کہ بیشتر نفع کمائے اور اس طرح بیشتر رزق حاصل کرے آخر کار عمومی محاسبات اور زندگی کی طبیعی راہوں سے وہ ایک راہ کا انتخاب کرتا ہے: یا کھیتی باڑی، یا صنعتی کام یا تجارت۔ قرائن کی بنیاد پر اور اپنے محاسبات کے مطابق آمدنی کی مقدار اور نفع کا اندازہ لگاتا ہے، لیکن خدائے متعال نے اہل تقوی کے لئے ضمانت دی ہے کہ ان کو حساب و کتاب کے بغیر رزق دے گا من جملہ جو خدا کی خوشنودی کے لئے فریضہ انجام دینے کی غرض سے علم حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے۔

خدائے متعال اسے ایک ایسی جگہ سے کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کرتا ہے رزق پہنچاتا ہے اس سلسلہ میں بہت سے نمونے موجود ہیں اور ہم سب نے اپنی زندگی میں کم و بیش اس کا تجربہ کیا ہے لیکن اگر کسی نے دیکھا کہ جس طرح اسے رزق ملنا چاہئے تھا نہ ملا تو اسے دیکھنا چاہئے کہ خطا کہاں ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے وعدہ کے مطابق اہل تقوی کا رزق عمومی محاسبات اور متوقع راستوں سے

خارج ہے۔اگر خدائے متعال ہمیں تقوی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے، تو وہ اس لئے ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے اچھے نتیجہ اور بڑے مرتبہ کو حاصل کرسکیں۔ بہشت اور اخروی درجات نیز معنوی کمال حاصل کریں اور ہمارے دنیوی زندگی سلامتی سے گزرے ورنہ خدائے متعال ہمارے تقوی سے استفادہ نہیں کرتاہے:(لن ینال اللہ لحومہا ولادما ؤہا و لکن ینالہ التقوی منکم[1]...)'' خدا تک ان جانوروں کا نہ گوشت جانے والا ہے اور نہ خون،اس کی بارگاہ میں صرف تمھارا تقوی جاتاہے''جو ہمیں خدا سے ملاتاہے، وہ تقوی ہے، یہی تقوی کمال و بلندی کا سبب ہے، چونکہ خدائے متعال چاہتاہے کہ ہم کمال تک پہنچ جائیں، اس لئے تقوی کے کچھ دنیوی نتائج کو بیان کرکے ہمیں تشویق کرتاہے کہ ہم اس کو حاصل کرنے کی جستجو کریں تا کہ اس کے نتیجہ میں اخروی منافع بھی حاصل کرسکیں۔ حقیقت میں اخروی منافعجیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں اودھار نہیں ہیں اور ان کا محقق ہونا نزدیک اور یقینی ہے لیکن ہم درک نہیں کرتے۔

مراتب تقوی پر ایک نظر:اس کے پیش نظر کہ تمام معنوی کمالات کے مراتب ہیں اور تقوی بھی چونکہ بلند ترین معنوی کمالات میں سے ہے، اس لئے اس کے بھی مراتب ہیں۔مناسب ہے یہاں پر اس کے مراتب کی طرف ایک اشارہ کریں: علمائے اخلاق نے تقوی کے لئے ایک زاویہ سے تین مراتب ذکر کئے ہیں:۱۔ صالح اور شائستہ اعمال انجام دے کر اور صحیح عقائد رکھتے ہوئے، نفس کو جہنم کے عذاب اور اس میں داخل ہونے سے بچانا کیونکہ تقوی کے معنی نفس کا تحفظ اور اپنے آپ کو خدا کی مخالفت سے روکنا ہے،بلکہ صرف گناہ سے پرہیز اور اس سے دوری اختیار کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔

اس لحاظ سے تقوی عقائد سے بھی مربوط ہے اور غیر عقائد سے بھی،عقائد میں تقوی،یعنی انسان اپنے اعتقادی اصول کے بارے میں غور کرے اورکوشش کرے کہ ان سے منحرف نہ ہو جائے اور اپنے صحیح او رراسخ اعتقاد کے سلسلہ میں اپنی رفتار و گفتار حتی اپنی سوچ کو بھی جہت دے ۔ انسان حقیقی معنوں میں اپنے خدا اور اصلی معبود کا معتقد ہو جائے اور یقین پیدا کرے کہ دوسرے تمام

---

[1] حج،۳۷

خیالی خدا اور معبود باطل ہیں۔ صحیح معنوں میں معتقد ہوجائے کہ اس معبود کی تمام مخلوق حقیقت ہیں اور مخلوق کو اپنے معبود کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے،اس کے سامنے اپنی ذلت کی پیشانی زمین پر رکھے اور اس سے روگردانی نہ کرے۔خدائے متعال کے بارے میں تقوی کے رعایت کے بعد،پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے تقوی کی بھی رعایت کرے۔ ان کے احکام کو دل و جان سے قبول کرے۔

۲۔ تقوی کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ گناہ کو ترک کرنے کے علاوہ مشتبہ چیزوں اور مکروہات سے بھی پرہیز کرے۔

۳۔ تقوی کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاو جوارح کو محرمات، مشتبہات اور مکروہات سے بچانے کے علاوہ اپنے دل کی بھی خدا کی مرضی کے مطابق حفاظت کرے اورگناہ ا ور بُرے کام کے تصور تک کو دل میں راستہ نہ دے اور کوشش کرے کہ صرف خدائے متعال اور اس کی مرضی کے بارے میں فکر کرے۔فطری بات ہے کہ انسان جس قدر بھی عبادت کرے، لیکن گناہ سے پرہیز نہ کرے تو وہ عبادت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔پس ہمیں اپنی عبادتوں اور اعمال سے بہرہ مند ہونے کے لئے،سب سے پہلے ان کے حدود کی اچھی طرح حفاظت کرنی چاہئے تا کہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہم سے سرزد نہ ہو۔روایت میں آیا ہے''من تورع عن محارم اللہ فهو من اورع الناس''[1] ''جو شخص محرمات سے پرہیز کرے وہ پرہیزگارترین انسان ہے۔''

آثار تقوی پر ایک نظر:ایک او رمطلب، جس پر بحث کرنا مناسب ہے، آثار تقوی کو بیان کرنا ہے، ہم یہاں پر ان کے بعض آثار کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۱۔ حقائق کو درک کرنے میں تقوی کے اثرات ''یا أیہا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا''[2] ''ایمان والو!اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو گے تو وہ تمھیں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرے گا''،عقل کی قوت جو حقائق کو پہچاننے کا سبب ہوتی ہے، انسان کے لاابالی پن سے پرہیز اور رفتار کے حدود کی رعایت کرنے کی صورت میں، زیادہ فعال ہوتی ہے،

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۶۴
[2] فرقان ،۲۹

کیونکہ لاابالی اور بے راہ روی عقل کی صحیح فعالیت کے لئے مانع ہے۔ ماہرانہ صورت میں، انسان کی لاابالی طبیعت اس کی حیوانی پہلوؤں سے مربوط ہے، خواہ خوراک میں ہویا جنسی مسائل میں اور خواہ اس کی قوت غضبیہ سے مربوط ہو۔ اب اگر انسان نے ان پہلوؤں میں اپنے لئے کسی قیود کی رعایت نہ کی، اپنے حیوانی زاویہ کو تقویت بخشی، تو جس کا ہم و غم اس کی غذا ہو، وہ اس گوسفند کے مانند ہے کہ جس کا ہم و غم گھاس کھانا ہوتاہے۔ یقیناً ایسا انسان اپنے انسانی پہلوؤں کو تقویت نہیں بخش سکتا ہے، اور عقل ان انسانی توانائیوں میں سے ہے جو مذکورہ صورت میں یا ضعیف ہوتی ہے یا ختم ہوجاتی ہے۔

اسی طرح جس کی توجہ جنسی شہوات کو تسکین دینا ہو تو اس کی فکر و سرگرمی شہوت کے محور کے گرد چکر لگاتی ہے اور اس کی مثال اس سور کی سی ہے جو صبح سے شام تک اپنی شہوت کے پیچھے رہتی ہے۔ ایسا انسان ایسے ماحول کی تلاش میں رہتاہے کہ جو اس کے غریزہ کے ما تحت ہوں ایسی آوازیں سنتا ہے یا ایسی باتیں کہتا ہے جو اس کی خواہش اور غریزہ کے تابع ہوتی ہیں، ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتاہے جو جنسی مسائل سے مربوط ہوتی ہیں۔ یقیناً ایسے انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ معارف الٰہی کے بارے میں فکر کرے گا اور، حقائق کو درک کرے گا اور حق و باطل کو تشخیص دے گا۔ اس قسم کا انسان درندوں کے مانند ہے، اپنی قوت غضبی کو تقویت بخشنے کی فکر میں ہوتاہے ہر وقت غلبہ پانے او ردوسروں پر مسلّط ہوجانے کی فکر میں رہتاہے۔

اس بناء پر ایسے انسان کی فکر کا محور جبلّت اور تسلط جمانا ہوتا ہے۔ تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی حیوانی قوتوں پر کنٹرول کرے اور اس صورت میں عقل کی قوت ہمارے وجود پر حاکم ہوگی۔ اب اگر ''فرقان'' سے مراد عقل ہے۔ چونکہ عقل حق و باطل کے درمیان تمیز دیتی ہے۔ تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حیوانی قوتوں کو کنٹرول کرکے اور عقل کی حاکمیت سے تمام دیگر قوتوں کو تسخیر کرکے فرقان کی منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ فرقان کے بارے میں ایک اور تفسیر کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، کہ فرقان عقل سے بالاتر ایک نور ہے، کیونکہ عقل تمام انسانوں میں کم و زیاد موجود ہوتی ہے۔ پس خدا او رخوف الٰہی کو پہچاننے سے انسان اپنی زندگی میں کچھ

حدود کی رعایت کرتا ہے اور جو تقوی اس کے وجود میں پیدا ہوتا ہے، اس سے یہ توانائی پیدا ہوتی ہے کہ خدائے متعال اسے فرقان کا نور عطا کرے کہ جو قوت عاقلہ کی تائید کرنے والی ہے۔

۲۔ بصیرت اور روشن فکری میں تقوی کا اثر: بہت سی آیات و روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تقوائے الٰہی کے قیمتی آثار میں سے بصیرت اور روشن فکری کو جلا دینا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (...و اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ '')[1] تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور خدا تمھیں تعلیم دے گا۔ '' یہ آیہ مبارکہ اس نکتہ کی تاکید کرتی ہے کہ تقوی خدا کی طرف سے انسان کے لئے علم و آگاہی حاصل کرنے میں شائستہ اثر رکھتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ایک روایت میں فرمایا ہے '' :من اخلص للہ اربعین یوماً فجر اللہ ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ''[2] ''جو شخص چالیس دنوں تک خود کو خدا کے لئے خالص قرار دے تو دل سے حکمت کے چشمے اس کی زبان پر جاری ہوں گے۔ ''حقیقت میں تقوی انسان کے دل میں معرفت حق پر لگے ہوئے زنگ کو صاف کرتا ہے اور انسان کے دل سے شیطان کے حجاب یعنی وسوسوں کو دور کرتا ہے، تب انسان حقائق کو صاف اور آشکار دیکھ سکتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '' :لولا ان الشیاطین یحومون حول قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السماوات[3] ''

''اگر فرزندان آدم کے دلوں کے اطراف میں شیاطین نہ ہوتے، تو وہ آسمانوں کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے '' ہمارے دینی آثار میں اس قسم کے بیانات بہت زیادہ ہیں جو اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ تقوی اور گناہ سے پاک ہونا، روح کی بصیرت اور روشن بینی کی راہ میں مؤثر ہے اور بالواسطہ ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ تقوی کی باگ ڈور کو ہاتھ سے چھوڑنا، روح کے تاریک ہونے، دل کے سیاہ ہونے اور نور بصیرت کے بجھنے کا سبب ہے۔

---

[1] بقرہ ۲۸۲
[2] بحار الانوار ، ج ۷۰، ص ۲۴
[3] بحار الانوار ، ج ۵۹، ص ۱۶۳

۳۔ تقوی کے آثار میں، خدا کی محبت کو حاصل کرنا بھی شامل ہے: (بلی من اوفی بعهده واتقی فان الله یحب المتقین[1]) ''بیشک جو اپنے عہد کو پورا کرتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے تو خدا متقین کو دوست رکھتا ہے۔''واضح ہے کہ اگر خدائے متعال کسی سے محبت کرتاہے، تو کون سے ثمرات اور منافع اسے حاصل ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی سے محبت کرتاہے، تو متواتر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتاہے اور اس میں کوتاہی نہیں کرتاہے اور اس بات کی بھی سعی کرتا ہے تا کہ اس کے مطالبات کو پورا کرے اور جو کام بھی ممکن ہوتا ہے اس کے لئے انجام دیتاہے۔ اب خدائے متعال جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کمالات کا خالق و مالک ہے اگر کسی شخص کو دوست رکھتا ہے تو معلوم ہے اس کے لئے کیا کرے گا۔ ممکن ہے ہم کسی سے محبت کرتے ہوں اور اس کے لئے کوئی کام انجام دینا چاہیں لیکن وسائل و امکانات کی عدم فراہمی کی وجہ سے شائستہ ظہور پر انجام دینے سے عاجز ہوں۔ لیکن خدائے متعال ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزیں اس کی قدرت اور مشیت کے تحت ہیں اور وہ جو کام چاہئے اپنے دوست کے لئے انجام دے سکتا ہے۔

۴۔ خوف و رنج کا دور ہونا۔

چنانچہ خدائے متعال فرماتاہے: (...فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیهم و لاهم یحزنون[2]) ''جو بھی تقوی اختیار کرے گا اور اصلاح کرے گا اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ رنجیدہ ہوگا۔''

۵۔ غیبی امداد حاصل کرنا :اور متقی کے لئے امداد غیبی کے بارے میں فرماتاہے: (بلی ان تصبروا و تتقوا و یأتوکم من فورهم هذا یمددکم ربکم بخمسة ءالف من الملائکة مسومین[3]) ''یقیناً اگر تم صبر کروگے اور تقوی اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے''ایک حدیث میں ہے '':ان اللہ تبارک و تعالی اید

---

[1] آل عمران، ۷۶)
[2] اعراف ، ۳۵
[3] آل عمران، ۱۲۵

المؤمن بروح منہ یحضرہ فی کل وقت یحسن فیہ ویتقی ویغیب عنہ فی کل وقت یذنب فیہ ویعتدی۔''[1] بیشک خدائے متعال مومن کی اپنی روح کے ذریعہ تائید کرتاہے اور جس وقت بھی وہ احسان اور تقوی اختیار کرے گا تو وہ روح اس کی تائید کے لئے اس کے پاس حاضر ہوتی ہے، لیکن جس وقت وہ گناہ اور ظلم کرتا ہے،وہ روح اس سے دور ہو جاتی ہے۔

۶۔ عظمت اور قرب الٰہی کا حاصل ہونا :انسان کا قرب الٰہی اور و کرامت سے سرفراز ہونے کے سلسلہ کرنے میں تقوی کا کیا نقش ہے اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:(ان اکرمکم عنداللہ اتقیکم [2]) ''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

۷۔ مشکلات او رپریشانیوں سے رہائی۔

مشکلات او رپریشانیوں سے رہائی کے بارے میں تقوی کے اثرات کے موضوع پر اس سے پہلے بحث ہوئی اور سورہ طلاق آیت نمبر ۱۲کی طرف اشارہ کیا گیا ۔یہاں پر ہم ایک دوسری آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو باتقوی معاشرے کے بارے میں ہے اور وہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۹۶ ہے،کہ جس میں فرماتاہے'': و لوان اہل القری آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکٰت من السماء و الارض۔ ''''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اورآسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے''

۸۔ اعمال کا قبول ہونا۔انسان کے اعمال کے قبول ہونے میں تقوی کا اثر اوراس کے نقش کے بارے میں خدائے متعال فرماتاہے:(انما یتقبل اللہ من المتقین[3]) ''خدائے متعال صرف صاحبان تقوی کے اعمال کو قبول کرتاہے۔ ''خدائے متعال اس آیت میں ہمیں اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتاہے کہ اگر ہم چاہیں کہ ہمارے اعمال قبول ہوں تو ہمیں تقوی اختیار کرنا چاہئے۔ البتہ اگر

---

[1] وسائل الشیعہ ،ج۱۱ص۲۳۵
[2] حجرات/۱۳
[3] مائدہ /۲۷

تکالیف اور واجبات ان کے ظاہری شرائط کے ساتھ انجام پائیں اور صحیح ہوں، تو ہم سے تکلیف ساقط ہوجاتی ہے۔ مثلاً اگر ہم صبح کی نماز کو سستی اور کاہلی کی وجہ سے صبح ہونے سے پہلے عجلت کی حالت میں پڑھ لیں، تو یقیناً ہم سے تکلیف ساقط ہوجاتی ہے لیکن قبول ہونے کے مرحلہ اس سے جدا ہے اور قبول ہونے کا مرحلہ اس سے برتر ہے اور اس کے خاص شرائط ہیں، من جملہ ان شرائط میں سے ایکعمل کا تقوی کے ساتھ ہوناہے۔ پس وہ اثر جس کا سبب انسان کا عمل خدا کے پاس بلند مرتبہ پر قرار پاتا ہے، یعنی عمل کی قبولیت، اس وقت انجام پاتی ہے جب عمل تقوی اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کے ساتھ ہو۔

''یا اباذر، کن بالتقوی اشد اہتماما منک بالعمل فانہ لایقل عمل بالتقوی، و کیف یقل عمل یتقبل؟ یقول اللہ عزوجل : (انما یتقبل اللہ من المتقین)'' اے ابوذر! عمل سے زیادہ تقوی کے لئے اہتمام کرنا. کیونکہ تقوی کے ساتھ عمل کم نہیں ہے، کس طرح وہ عمل کم تصور کیا جائے گا جو درگاہ الہی میں قبول ہوچکا ہو؟ خدائے متعال فرماتاہے: پروردگار صرف صاحبان تقوی کے عمل کو قبول کرتاہے۔'' لوگ ، خواہ دنیا سے مربوط ہویا آخرت سے، عزم وارادہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور ممکن ہے ان کے درمیان کافی فرق ہو، معاشی زندگی کے بارے میں بعض لوگوں کے عزم ارادے کمزور ہیں اور صبح سے شام تک دال روٹی کی امید میں محنت کرتے ہیں، پسینے پسینے ہوتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔

اس لئے نہیں کہ اس گروہ نے زہد کی راہ کو اپنایا ہے، بلکہ ان کے توقعات کم ہیں اور ان کا عزم و ارادہ کم ہے۔ بعض لوگوں کا عزم وارادہ اس سے زیادہ ہوتا ہے اور مختصر پر مطمئن نہیں ہوتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ منافع کمائیں، محدود اور کم چیزیں انھیں مطمئن نہیں کرتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کے عزم و ارادے اس گروہ سے بھی بالاتر ہیں اور وہ مادی و محسوس منافع اور خوراک و شکم کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کے لئے اجتماعی حیثیت اور عزت و عظمت حاصل کرنا اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کام کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ اس لئے نہیں کہ اس کے ذریعہ ایک بڑی رقم انھیں ملنے والی ہو بلکہ وہ کام ان کی شان و حیثیت کے مطابق ہے اور ان کی عزت و شرافت کا باعث ہے اس لئے اسے انتخاب کرتے رہیں غیر شرافت مندانہ فعل چاہے جتنی

دولت و نفع کا باعث ہو اسے ہاتھ نہیں لگاتے یا عزت و عظمت نہ ہو تو اس کے پیچھے نہیں پڑتے۔ اس گروہ کے عزم و ارادے بلند ہیں، وہ عزت نفس کے مالک ہوتے ہیں اور ان کے پاس عزت کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اسی طرح آخرت کے سلسلہ میں بھی مومنوں کے عزم و ارادے میں فرق ہوتا ہے: بعض لوگوں کے عزم و ارادے اسی حد تک ہوتے ہیں کہ کوئی ایسا کام کریں تا کہ جہنم میں نہ جائیں اور اس کی آگ سے نجات پائیں اور وہ اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اس پر مطمئن نہیں ہوتے اور وہ بہشت کے بلند مراتب حاصل کرنے کی فکر میں بھی ہوتے ہیں ایک او رگروہ کے لوگ ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنے عزم و ارادے کو بلند تر کردیا ہے اور وہ جہنم و بہشت کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک عزیز ہوجائیں او راس کے قرب میں پہنچ جائیں۔

جی ہاں! جنہوں نے خدائے متعال کو پہچانا ہے اور خدا کے نزدیک عزت کی بلند قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، اگر بہشت کی نعمتیں بھی نہ ہوں، تو پھر بھی وہ خدا کے نزدیک پانے والی عظمت سے کافی خوش اور راضی ہو کر اس پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے لئے اس میں اہمیت ہے کہ خدا ان کی عزت کرے اور انھیں عظمت بخشے اس لئے وہ بہشت کی نعمتوں کی طرف کوئی اعتنا نہیں کرتے ہیں۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (...ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم...[1]) ''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

اللہ تعالی یہاں یہ نہیں فرماتا ہے کہ جو زیادہ باتقوی ہے اسے میں بہشت او ربہشت کی نعمتیں عطا کروں گا یا اسے جہنم کی آگ سے نجات دلاؤنگا، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ خدا کی کرامت حاصل کرتا ہے اور خدا کے نزدیک محترم قرار پاتا، بہشت اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے والے محل اور جاویدانی نعمتوں سے مستفید ہونے سے بالاتر ہے۔ اب جو شخص معرفت کے اس مقام تک پہنچا ہو تو مزید تقوی کے لئے اس کی کیسے تشویق کی جائے؟ کیا اسے یہ کہیں کہ: اپنے تقوی میں اضافہ کرو تا کہ تمھاری دنیا کی زندگی بہتر ہو؟ وہ تو ان سب کو

---

[1] حجرات/۱۳

پس پشت ڈاکر عالی ترین مرحلہ پر فائز ہوچکا ہے. یا اس سے یہ کہیں: اپنے تقوی میں اضافہ کرو تا کہ بہشت کے محلوں اور حو رالعین سے بہرہ مند ہوجاؤ اور جہنم سے نجات پاؤ فطری بات ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اسے بہکا نہیں سکتی اور اس میں محرک پیدا نہیں کرسکتی ہے، کیونکہ اس نے ان چیزوں سے منہ موڑ لیاہے. وہ کمال اور بلندی کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچاہے اور اس کا عزم و ارادہ اس حد تک پہنچاہے کہ شوق لقاء اللہ اور محبت و عظمت الٰہی کے مقام کو حاصل کرنے کے علاوہ کسی اور چیزکی فکر نہیں کرتاہے۔ جو چیز ایسے افراد کے شوق میں اضافہ کرسکتی ہے وہ محبوب کا دیدار اور اس کی رضایت ہے۔توجہ کرنی چاہئے کہ قرآن مجید نے تربیت کے لئے ایک ہی قسم کے شیوہ کا انتخاب نہیں کیا ہے،بلکہ ہر سطح کے افراد کے لئے خاص شیوہ کا انتخاب کیا ہے۔

اس لحاظ سے قرآن مجید میں تربیت کے متعدد طریقے ہیں اور اس کے یہ طریقے صرف اولیائے الٰہی اور مقامات عالی تک پہنچنے والے افراد سے مخصوص نہیں ہیں، کیونکہ قرآن مجید تمام انسانوں کے کمال اور اصلاح کے لئے کتاب ہدایت اور دعوت عمل ہے۔ اس لئے حتی کم عزم اور کم حوصلہ رکھنے والوں کے لئے بھی ان کی جزا اور نعمتیں ذکر کی ہیں، جو تکامل وترقی کی راہ میں ہیں،تا کہ وہ بھی بہرہ مندی سے محروم نہ ہو رہیں۔ انھیں مادی نعمتوں، بہشت اور جہنم سے نجات کا وعدہ دیا گیا ہے. لیکن کرامت الٰہی، رضوان حق تک پہنچنے اور اس کے نزدیک محبوب ہونے کا وعدہ ان سے مخصوص ہے جو معرفت کے عالی درجات تک پہنچے ہیں۔

تقین کے حساب و کتاب کی خصوصیت او ران کی چند دوسری خصوصیات:ایک اور موضوع جس پر بحث کرنا مناسب ہے وہ ''متقین کے صفات'' ہیں۔ تقوی کی قدر و قیمت اور بلند مقام سے آگاہ ہونے کے بعد ہمیں متقین کی نشانیوں او رصفات کو جاننا چاہئے تا کہ تقوی کو حاصل کرنے کے طریقہ سے آگاہ ہوجائیں۔ اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''یا اباذر؛ لایکون الرجل من المتقین حتی یحاسب نفسہ اشد من محاسبۃ الشریک شریکہ. فیعلم من این مطعمہ و من این مشربہ و من این ملبسہ؟ امن حل ذلک ام من حرام''''اے ابوذر! انسان تب تک پرہیز گاروں میں شمار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے شریک کا محاسبہ کرنے سے سخت تر خود کو محاسبہ کی منزل میں قرار نہ دے۔

تاکہ جان لے اس کی خوراک، پینے کی چیزوں او رپہننے کا لباس کہاں سے آیا ہے، حلال سے ہے یا حرام سے ہے‘‘،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حساب وکتاب کی خصوصیات کو متقین کی جملہ صفات میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: باتقوی وہ ہے جولاپروا ہ نہ ہو او راپنے آپ کو تحت محاسبہ قرار دے۔ اگر کسی خوراک کو حاصلکیاہے تو دیکھ لے کہ اسے حلال راہ سے حاصل کیا ہے یا حرام راہ سے،اگر لباس فراہم ہوا ہے تو دیکھ لے کہ وہ اس کے پیسے کہاں سے لایا ہے۔ اسی طرح گھر کے بارے میں کہ اس کے پیسے کہاں سے فراہم ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کی گھر بنانے کا محرک یہ ہے کہ خدا کی عبادت و بندگی بہتر طور پر انجام دے سکے، خاندان کے لئے بیشتر آرام و آسائش فراہم کرے اور بہتر عبادت کر سکے اور اپنے فرزندوں کی تربیت کر سکے یا اس کا گھر بنانے کا محرک دوسروں پر فخر و مباہات کرنااور دوسروں کو نیچا دکھاناہے۔

جب وہ کسی راہ میں پیسے خرچ کرنا چاہتاہے، دیکھنا چاہئے خدا اس پر راضی ہے اور اس سے واجب تر کوئی کام تو نہیں ہے کہ جس کے لئے یہ پیسے خرچ کرنا ضروری ہوں؟ بہر صورت تمام جوانب کی پڑتال کرے اور ایسا نہ ہو کہ سر کو نیچے کرکے اور جس راہ سے بھی ممکن ہو پیسے جمع کرکے جس کام پر چاہے خرچ کرے۔ دیکھ لے کہ جو امکانات اسے حاصل ہوئے ہیں وہ حلال راہ سے حاصل ہوئے ہیں یا حرام سے۔ اگر حرام طریقے سے حاصل ہوئے ہیں تو اسے اس کیجگہ پر واپس پلٹا دے او رخود کو مصیبت میں نہ ڈالے۔بعض اوقات انسان اس قدر دنیا داری میں ملوثہوتا ہے اور اپنے آپ کو دنیوی امور میں گرفتار کرتاہے کہ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہوجاتا ہے۔

اپنے آپ کو بڑے بڑے قرضوں اور لون کی قسطوں میں پھنساتاہے اور اپنی آبرو کو داؤ پر لگاتاہے، حتی کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی اپنے مسائل میں گرفتار کرتا ہے اورا س طرحسے نجات کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا، صرف اس فکر میں ہوتاہے کہ کچھ پیسے اس کے ہاتھ آئیں،جس طریقہ سے بھی ہو، حلال یا حرام!(یعنی پیسہ ہو جیسا ہو)اگر ہم تقوی کے بلند مرحلہ پر نہیں پہنچے ہیں، کہ مشتبہ و مکروہ سے پرہیز کریں، توکم ازکم حرام کے حدودکی رعایت کریں! ایسانہ ہو کہ جو مال ہمارے ہاتھ آیاہے وہ کسی اور کا حق ہے۔ ہر مومن کو اپنی

زندگی میں بعض قوانین و حدود کی رعایت کرنی چاہئے اور اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے ۔ ایک تاجر کو ایک طرح سےشرعی احکام کی رعایت کرنی چاہئے ملازم کو دوسرے انداز سے ان کی رعایت کرنی چاہئے اور اسے دیکھنا چاہئے کہ جو وہ تنخواہ لیتا ہے، کیا اس کے ساری وہ کام کرتا ہے یا کم کام کرتا ہے؟ کام کے وقت تفریح آرام، سیگریٹ پینے، اور دوسروں سے گفتگو کرنے میں وقت گزارتا ہے یا کام انجام دیتا ہے؟ بعض مومن و اہل عبادت، نافلہ پڑھتے ہیں، لیکن جب اپنے کام کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو تمام چیزوں کو پس پشت ڈال کر اپنے فریضہ کو بھول جاتے ہیں او رتصور کرتے ہیں کہ اس کرسی پر بیٹھ جانا ہی گویا انھوں نے اپنےفریضہ کو انجام دے دیا ہے ۔ سرکاری ملازم یا کسی پرائیویٹ کمپنی کے ملازم کے لئے ڈیوٹی کا وقت اس کے مالک کا حق ہے اسے اس وقت میں کسی اپنے ذاتی امور میں مشغول نہیں ہونا چاہئے، حتی اگر کبھی ذاتی کام کے لئے ٹیلیفون کرے اور وہ ٹیلیفون کام میں رکاوٹ بنے، تو وہ اس کے مقابل میں جواب دہ ہے، ہم ان نکات کی طرف توجہ نہیں رکھتے ہیں۔

اسی طرح بیت المال سے استفادہ بیت المال کی ہی مصلحت کی راہ میں ہونا چاہئے، اس بناپر اگر ہم نے عہدو پیمانکیا ہے کہ ایک مشخص (معین) وقت میں ایک خاص کام انجام دیں، تو اس وقت کو کسی دوسرے کام میں صرف نہیں کرنا چاہئے، حتی اگر ہم نے ایک خاص زمانہ میں ایک کام کو اجرت پر انجام دینے کے لئے عہدو پیمان کیا ہے، توہمیں اس وقت میں نماز پڑھنے کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ پہلے سے ہی مالک سے شرط رکھی ہو۔بیت المال کے بارے میں حرام و حلال او راس کے شرائط و حدود کی رعایت کرنا دشوار ہے ۔ خوش بختی سے ایسے مسائل ہمارے لئے بہت کم پیش آتے ہیں، لیکن ہم دوسرے مسائل سے روبرو ہیں: جب ہم دین کی تبلیغ کے لئے جاتے ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ تبلیغ کی راہوں کو جانیں، ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا کام انجام نہ دیں کہ جس سے دوسروں پر آنچ آئے اور دوسروں کی بے احترامی نہ کریں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں نہ ہوں۔ ممکن ہے تبلیغ کے لئے ایک ایسی جگہ پر جائیں جہاں پر ہم سے پہلے کوئی اور شخص تبلیغ کے لئے گیا ہولوگ اس سے مطمئن اور خوش ہوں اور ہمارے سامنے اس کی تعریفیں کریں کہ فلاں شخص اچھی مجلسیں پڑھتا تھا،اس کی تقریر اچھی تھی اور لوگ اس کا استقبال کرتے تھے۔

یہاں پر ممکن ہے ہم اس شخص کی تعریف تو کریں، لیکن اشارو ں میں حتی باتوں باتوں میں لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ اس شخص کا علم مجھ سے کم ہے تا کہ بعد والے برسوں میں پھر مجھے ہی دعوت کریں! مثلا ہم اس طرح کہتے ہیں چند سال پہلے وہ شخص میرا ہم درس تھا ایک مدت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑدی یا دفتری کاموں میں مشغول ہوگیا اور پڑھائی کو جاری نہ رکھ سکا، یعنی ہم علم میں آگے بڑھے اور وہ پیچھے رہا!دوسروں کی تردید اور تضعیف کرنے کے لئے اور دوسروں کی شخصیت کو پست دکھلانے کے لئے یا اپنے ذاتی منافع و مقاصد تک پہنچنے کے لئے، شیطان مختلف طرح کے حیلوں او ربہانوں سے کام لیتا ہے کہ ان میں سے بعض خاص قسم کی ظرافت کے حامل ہوتے ہیں اور ہر ایک ان کی قباحت اور برائی کو نہیں جان سکتا ہے ممکن ہے ظاہر میں کافی پر رونق اور زیبا دکھائی دیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرؓ سے اپنی نصیحتوں کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں ''یا اباذر؛ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال اللہ عزوجل من این ادخلہ النار'' ''اے ابوذر؛ جو بھی اس کا خیال نہیں رکھتا ہے کہ مال کہاں سے آتا ہے خدائے متعال بھی اس کی پروا نہیں کرے گا کہ اسے کہاں سے جہنم میں ڈالے۔''انسان کو مال حاصل کرنے میں دقت کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ پیسے کہاں سے حاصل کرتاہے۔ ایسانہ ہو کہ لوگوں کی ستائش، تملق، ترویج او ران کے سامنے سر خم کرکے پیسے حاصل کئے ہوں اس کے لئے یہ مہم نہیں ہے کہ پیسے حلال راہ سے آئے ہیں یا حرام راستہ سے، اس کا کام شرعی جواز رکھتاہے یا نہیں، اگر ایسا کیا تو خدائے متعال کو اسے اپنے قہر کی آگ میں جلانے اور جہنم میں ڈالنے کا حق ہے ''یا اباذر؛ من سرّہ ان یکون اکرم الناس فلیتق اللہ عزوجل''

''اے ابوذر! جو بھی لوگوں میں اپنے آپ کو محترم ترین شخص کے طور پر دیکھنا چاہے اسے تقوائے الٰہی اختیار کرنا چاہئے''.

''یا اباذر!ان احبکم الی اللہ جل ثناؤہ اکثرکم ذکرا لہ و اکرمکم عند اللہ اتقاکم لہ و انجاکم من عذاب اللہ اشدکم لہ خوفا'' ''اے ابوذر؛ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو بیشتر اس کی یاد میں ہو او رتم میں سے خدا کے نزدیک عزیز ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو اور خدا کے عذاب سے دورترین وہ شخص ہے جو اس سے زیادہ ڈرے''(جیسا کہ ہم نے اس سے

پہلے اشارہ کیاہے کہ خوف خدا تقوی کے مقدمات میں سے ہے اور جب تک یہ خوف نہ ہو تقوی حاصل نہیں ہوتاہے)''یا اباذر:ان المتقین الذین یتقون من الشی ء الذی لایتقی منہ خوفا من الدخول فی الشبھۃ'''' اے ابوذر ! پر ہیز گار وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں سے بھی اجتناب کرتے ہیں جن سے پر ہیز نہیں کیا جاتاہے، تا کہ شبہ سے دوچار نہ ہوں۔ ''کہا گیا ہے کہ تقوی کے کچھ مراتب ہیں اور بعض لوگ صرف ان چیزوں سے دوری اختیار کرتے ہیں جو قطعا حرام ہیں اور بعض لوگ اس مرحلہ سے بالاتر قدم بڑھاکر حتی مشکوک چیزوں سے بھی پر ہیز کرتے ہیں او ربعض لوگ اس مقام پرپہنچے ہیں کہ جس چیز کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ مباح ہے اس سے بھی پر ہیز کرتے ہیں تا کہ مشکوک چیزوں میں مبتلا نہ ہوں۔اس کے بعد پیغمبر اسلام تقوی کے عالی ترین مرحلہ اور خدا کی اطاعت کے بارے میں فرماتے ہیں'':یا اباذر: من اطاع اللّٰہ عزوجل فقد ذکر اللّٰہ و ان قلت صلاتہ وصیامہ و تلاوتہ للقرآن'' ''اے ابوذر؛ جس نے خدائے متعال کی اطاعت کی اس نے اس کویاد کیا ہے اگر چہ اس کے روزہ و نماز کم ہوں او رقرآن مجید کی تلاوت کم کی ہے ۔ '' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں زہد و تقویٰ:اس کے بعد آنحضرتؐ زہد کے بارے میں فرماتے ہیں'':یا اباذر؛ اصل الدین الورع و راسہ الطاعۃ. یا اباذر؛کم ورعا تکن اعبد الناس و خیر دینکم الورع''''اے ابوذر! دین کی جڑزہد اور گناہ و شبہات سے دوری اختیار کرناہے او راس کی اصل خدا کی اطاعت ہے۔ اے ابوذر!اپنے نفس کو گناہوں سے بچانا تا کہ تم لوگوں میں عابد ترین شخص بن جاؤ اور تمھارے دین کا بہترین حصہ پارسائی ہے۔''

بنیادی طور پر ورع نفس کو محرمات سے روکنے اور اس سے دوری اختیار کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ مطلق طور پر نفس کو روکنے کے معنی میں استعمال ہواہے اور اس کا مفہوم تقوی مفہوم سے کے بہت قریب ہے ۔ لیکن غالبا ورع کو پرہیزگاری کے ملکہ (جو ایک اندورنی حالت ہے) میں استعمال کرتے ہیں اور تقوی کا مقدمات عمل، خود اچھے عمل نیز داخلی ملکہ پر اطلاق ہوتاہے.حضرت علی علیہ السلام انسان کو گناہ اورانحراف سے روکنے کے سلسلہ میں ورع کے نقش کے بارے میں فرماتے ہیں: ''لاشرف اعلی من الاسلام و لا عزّاعزّ من التقوی و لا معقل احسن من الورع''''اسلام سے بالاتر کوئی عظمت و بزرگی نہیں ہے،

پرہیزگاری سے بالاتر کوئی عزت و احترام نہیں ہے اور ورع و پارسائی (گناہ او رشبہات سے دروی) سے بڑھ کر کوئی مستحکم ترین پناہ گاہ نہیں ہے۔[1]'' حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں'' :اتقوا اللہ و صونوا دینکم بالورع[2]'''الہی تقوی کو اپنا لائحہ عمل پیشہ قرار دو اور پارسائی سے اپنے دین کا تحفظ کرو''سعادت او ربلند معنوی درجات تک پہنچنے اور ہلاکت کے بھنور میں گرکر غرق ہونے سے بچنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ پارسائی اور اپنے آپ کو حرام سے بچانا ہے۔ حقیقت میں ورع اور گناہوں سے اپنے کو محفوظ رکھنا خدا کی بندگی اور اس کی عبادت کا سخت ترین مرحلہ ہے۔ اس لئے امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں'':ان اشد العبادۃ الورع'''' ورع مشکل ترین عبادت ہے۔[3]'''' عبادت کی سلامتی میں ورع کے رول پیش نظر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں.. '':لاخیر فی نسک لاورع فیہ[4]''''جو عبادت ورع کے ساتھ نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ''عبادت کے ساتھ ورع کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزید فرماتے ہیں'':یا اباذر! فضل العلم خیر من فضل العبادۃ و اعلم انکم لو صلیتم حتی تکونوا کالحنایا و صمتم حتی تکونوا کالاوتار ما ینفعکم الا بورع''''اے ابوذر! علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے زیادہ ہے اور جان لو اگر اس قدر نماز پڑھوکہ کمان کے مانند خم ہوجاؤ اور اس قدر روزہ رکھوکہ تیر کے مانند دبلے پتلے ہوجاؤ اگر ورع نہ ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ''مزید فرماتے ہیں'':یا باذر؛ اہل الورع و الزہد فی الدنیا ہم اولیا اللہ حقا''''جو دنیا میں اہل ورع و زہد ہیں حقیقت میں وہ اولیائے الہی ہیں۔''

''زہد'' اور ''زھادہ'' لغت میں دنیا سے دلچسپی، میل و رغبت کے مقابلہ میں بی رغبتی کے معنی میں ہے۔ یعنی انسان دنیا سے رغبت او رشغف نہ رکھے اور صرف سادہ زندگی پر قناعت کرے.قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلام میں مطلوب زہد، یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو بہتر صورت میں نبھانے کے لئے، سادگی او رتجمل گرائی سے پرہیز کو اپنا شیوہ قرار دے اور زرق وبرق والی ظاہری زندگی

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) حکمت ۳۶۳، ص۱۲۶

[2] بحار الانوار ، ج ۷۰، ص ۲۹۷

[3] بحار الانوار ، ج ۷۰، ص ۲۹۷

[4] بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۳۰۷

کی نسبت بے اعتنائی دکھائے۔ بدیہی ہے کہ رفتار کا یہ طریقہ دنیا اور اس کے مظاہر کو ناپاک جاننے، دنیا و آخرت میں موجود تضاد اور اجتماعی ذمہ داریوں سے فرار کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اسلام میں زہد ذمہ داریوں کو بہتر صورت میں انجام دینے اور و افراطی میلانات کو زندگی کی ظاہری کششوں سے بچانے کے لئے ہے زہد انسان کی زیادہ خواہی کی ذہنیت کو کنٹرول کرتا ہے اور دنیا کی زندگی کی ظاہری حالت کے مقابلہ میں خود فروشی کو ختم کردیتا ہے۔ چنانچہ حافظ کہتے ہیں: غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است میں اس شخص و ارادے کا کا غلام ہوں جو اس آسمان کے نیچے خدائے متعال کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔
اس بنا پر اسلام میں زہد، مال و اقتدار سے منافات نہیں رکھتا ہے اور حقیقت میں زاہد وہ ہے جو زندگی کے مظاہر کو خدا اور حقسے زیادہ دوست نہیں رکھتا ہے اور الٰہی مقاصد کو دنیوی مقاصد پر قربان نہیں کرتا ہے او رآخرت کو بنیاد قرار دے کر دنیا کو فروع، وسیلہ اور مقدمہ کے عنوان سے جانتا ہے۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر زہد کا رہبانیت (جو عیسائیوں او ربدھ مذہب کے پیرؤں میں رائج ہے) سے فرق واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ رہبانیت ترک دنیا، ذمہ داریوں اور اجتماع سے فرار کے معنی میں ہے اور اس قسم کی فکر اسلام کی روح سے موافقت نہیں رکھتی، اسلام کی نظر میں زندگی کے تمام مظاہر جیسے مال، فرزند اور ریاست وغیرہ سب ترقی وتکامل کے وسائل ہیں اور خدائے متعال کی تمام نعمتیں اور ان کا صحیح استعمال اور استفادہ میں تعادل کی رعایت، اس کے علاوہ انسان کی دنیا کے آباد ہونے کا سبب ہیں، آخرت کو آباد کرنے کا بھی سبب ہے۔

صحیح استفادہ اس معنی میں ہے کہ انسان دنیا اور اس کے مظاہر کو بنیاد اور اصل قرار دینے کا قائل نہ ہو اور انھیں کمال اور سعادت اخروی تک پہنچنے کے لئے خدا کی نعمتوں کا درجہ دے، چنانچہ فرمایا گیا ہے '': الدنیا مزرعۃ الآخرہ [1]'' ''دنیا آخرت کے کھیتی ہے۔ '' اور خدائے متعال فرماتاہے: (و ابتغ فیما اٰتٰک اللّٰہ الدار الآخرۃ و لا تنس نصیبک من الدنیا.[2]) ''اور جو کچھ خدانے دیا ہے اس سے آخرت کے گھر کا انتظام کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ''...اسلام کی نظر میں، جو کچھ دنیا میں موجود ہے وہ اچھا ہے، خدائے

[1] بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۳۰۷
[2] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۱۴۸

متعال نے کسی بری چیز کو خلق نہیں کیا ہے۔ اس لئے نہ دنیا اور اس کے مظاہر برے ہیں نہ ان سے دلچسپی اور وابستگی کہ جو طبیعی میلانات کے مطابق انسان کے اندر قرار دی گئی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے'':الزہادۃ فی الدنیا لیست بتحریم الحلال و لا اضاعۃ المال و لکن الزہادۃ فی الدنیا ان لاتکون بما فی یدیک اوثق منک بما فی ید اللہ[1]'''' دنیا میں زہد اور دنیا کو اہمیت نہ دینا یہ نہیں ہے کہ حلال کو اپنے لئے حرام کروگے یا اپنے مال کو ضائع کروگے۔ زہد،یعنی جو کچھ تمھارے ہاتھ میں ہے اسے اس سے زیادہ اعتقاد نہ رکھنا جو خدا کے پاس ہے۔ ''نیز حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'':ایہا الناس الزّہادۃ قصر الأمل و الشکر عند النعم و الورع عند المحارم'' ''...اے لوگ! زھد ، اپنی آرزؤں کو کم کرنا، نعمتوں کی شکر گزاری اور حرام سے پرہیز ہے''.مذکورہ بیانات کے علاوہ، قرآن مجید رہبانیت کی مذمت کرتاہے اور اسے ایک ایسی بدعت جانتا ہے ،جسے راہبوں نے دنیا و آخرت کے درمیان تضاد کی غلط فہمی کی بنیاد پر عیسائی مذہب میں رائج کیا ہے۔ قرآن مجید یہ فرمانے کے بعد کہ: ''ہم نے عیسیٰ کو بھیجا اور انھیں انجیل عطا کی اور ان کی پیروی کرنے والوں کے دل میں مہربانی اور رحم قرار دیا'' فرماتاہے:(...و رہبانیۃ ابتدعوہا ماکتبناہا علیہم الا ابتغاء رضوان اللہ فارعوہا حق رعایتہا[2]) ''اور جس رہبانیت کو انھوں نے از خود ایجاد کیا تھا اور اس سے رضائے خدا کے طلبکار تھے ہم نے ان کے اوپر فرض نہیں کیا تھا اور انہوں نے خود بھی اس کی مکمل پاسداری نہیں کی۔''

ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی شکوہ کرنے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی : اے رسول اللہ،عثمان بن مظعون دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو شب بیداری کرتا ہے (اپنی زندگی اور اہل و عیال کی فکر نہیں کرتاہے)پیغمبر اسلام یہ مطلب سننے کے بعد عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور دیکھا کہ وہ نماز کی حالت میں ہے ۔ جب عثمان نے پیغمبر کو دیکھا تو اس نے نماز ختم کی ۔پیغمبر نے اس سے کہا'' :یا عثمان!لم یرسلنی اللہ بالرہبانیۃ ولکن بعثنی بالحنفیۃ السہلۃ السمحۃ

[1] نہج الفصاحۃ ،ص، ۳۵۸حدیث ،۱۷۱۲
[2] حدید/۲۷

أصوم و أصلي و ألمس اھلی[1] ۔ ""' اے عثمان! خداوند متعال نے ہمیں تصوف کے دین پر اور ترک دنیا کے لئے مبعوث نہیں کیا ہے بلکہ ایک معتدل اور آسان دین پر مبعوث کیا ہے ۔ میں روزہ رکھتا ہوں ، نماز بھی پڑھتا ہوں اور اپنی بیوی سے مباشرت بھی کرتا ہوں۔ ''شہید مدرس قمشہ ای کے بارے میں نقل کیا گیاہے کہ : ایک دن قمشہ کاایک معروف زمیندار مدرس کے پاس آیا اور زمین کا ایک حصہ انھیں دینا چاہا ۔ مدرس ، باوجود اس کے کہ انتہائی فقر و تنگدسی سے دوچار تھے، زمیندار سے کہا : کیا تمہارے خاندان میں کوئی فقیر و محتاج نہیں ہے؟

اس شخص نے کہا : کیوں نہیں، ہیں لیکن میں زمین کے اس ٹکڑے کوآپ کو بخشنا چاہتا ہوں ۔ مدرس نے فرمایا : بہتر ہے اس زمین کو اپنے کسی فقیر رشتہ دار کو بخش دو ۔ اسی طرح نقل کیا گیا ہے: آیت اللہ مدرس، موسم گرما و سرمامیں ٹاٹ کا بُنا ہواایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے: ہاتھ، پاؤں اور باقی بدن کی کھال چہرے کی کھال سے نازک تر نہیں ہے ۔ بدن کی جس طرح عادت بناؤگے،بدن عادی ہوتا ہے! وہ اونی موزہ ، شلوار اور اونی کرتا، قبائے سرج اور عبائے نائینی نہیں پہنتے تھے اور فرماتے تھے: ان چیزوں کے لئے پیسا ہونا چاہئے اور پیسے غلامی لاتے ہیں اور مدرس غلام نہیں ہونا چاہتا ہے(شہادت کے وقت ان کی پوری ثروت چوبیس ۲۴ تومان تھی)آیت اللہ شہید مدرس اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے فرمایا : کہ دن رات میں صرف ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرنے کی عادت ڈالو اور اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھو تاکہ نئے کپڑے سلوانے کی فکر میں نہ رہو، وہ ہمارے اجداد کو نمونہ عمل قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے: حلم و بردباری کو اپنے جد بزرگوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھو، شہادت و قناعت کو اپنے جد پاک علی علیہ السلام سے اور ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنے کو اپنے جد سیدالشہداء سلام اللہ علیہ سے سیکھ لینا ۔[2]؟

---

[1] بحار الانوار ، ج٢٢، ص٢٦٤
[2] حسینی سید نعمت الله، مردان علم در میدان عمل،ص١٢٧-١٢٩

چودہواں درس

پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں بردباری،تواضع اور توکل

''یا اباذر؛ من لم یأت یوم القیامة بثلاث فقد خسر.قلت: و ما الثلاث؟ فداک ابی و امی.قال:ورع یحجزہ عما حرم اللہ عزوجل علیہ، و حلم یرد بہ جہل السفیہ، و خُلق یداری بہ الناس.یا اباذر؛ان سَرَّک ان تکون اقوی الناس فتوکل علی اللہ، و ان سَرَّک ان تکون اکرم الناس فاتق اللہ، و ان سَرَّک ان تکون اغنی الناس فکن بما فی ید اللہ عزوجل اوثق منک بما فی یدیک.یا اباذر؛ لو ان الناس کلہم اخذوا بہذہ الآیہ لکفتہم:(و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب و من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شی ء قدرا[1]) جس موضوع پر گزشتہ درس میں بحث ہوئی اس کا محور تقوی اور ورع تھا،روایت کے اس حصہ میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ورع اور گناہ سے پرہیز کے علاوہ حلم،بردباری اور توکل کی عظمت کے بارے میں بھی بیان فرماتے ہیں '':یا اباذر! من لم یات یوم القیامة بثلاث فقد خسر.قلت: و ما الثلاث؟ فداک ابی و امی.قال:ورع یحجزہ عما حرم اللہ عزوجل علیہ، و حلم یرد بہ جہل السفیہ، و خلق یداری بہ الناس''''اے ابوذر! جس کے ہمراہ قیامت کے دن تین چیزیں نہ ہوں وہ گھاٹے میں ہے ابوذر نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، وہ تین چیزیں کیا ہیں: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:۱۔ورع، جو اسے حرام چیزوں سے بچائے.

۲۔ حلم، جس کے ذریعہ بیوقوفوں کی نادانی سے مقابلہ کرے.

۳۔نیک اخلاق جس سے لوگوں کی خاطر تواضع کرے.سب سے پہلی چیز جو اگر انسان میں نہ ہو تو قیامت کے دن نقصان میں ہے،وہ ورع ہے۔ گزشتہ درس میں ہم نے کہا کہ عام طور پر ورع تقوی کے ملکہ کو کہتے ہیں اور خود گناہ سے پرہیز کو ورع نہیں کہتے ہیں۔

[1] طلاق / ۲۔۳

حدیث کے اس حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعبیر، اس تفسیر کی تائید کرتی ہے جو واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ ورع وہ ملکہ نفسانی ہے جو انسان کو گناہ سے روکنے کا سبب ہے، اس بنا پر ورع کی خاصیت انسان کو گناہ سے روکنا ہے۔ فطری بات ہے کہ جس انسان میں اس قسم کی خصوصیت نہ ہو تو وہ گناہ میں ملوث ہوتا ہے اور نتیجہ کے طور پر نقصان اٹھاتا ہے اور جہنم سے دوچار ہوتا ہے. حلم و بردباری کا بلند مرتبہ و منزلت: دوسری خصوصیت جو انسان کو قیامت کے دن نقصان سے بچاتی ہے، حلم و بردباری ہے۔ لغت میں آیا ہے کہ حلم، نفس کو قوہ غضبیہ کے بھڑکنے سے روکنے کے معنی میں ہے۔

بیشک حلم پسندیدہ اور قابل قدر صفات میں سے ہے، اور عقل کا سپاہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ غضب حلم کے مقابلہ میں قرار پایا ہےجہل کا سپاہی شمار ہوتا ہے. معروف ہے کہ انسان کو چاہئے غصہ کی حالت میں نہ کوئی فیصلہ کرے، نہ کسی کو تنبیہ کرے اور نہ کوئی اقدام کرے کہ بعد میں پشیمان ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں غصہ کی حالت میں عقل کے کنٹرول سے خارج ہوتی ہیں اس لئے اس حالت میں انسان کی عقل صحیح کام نہیں کرتی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن نادانی کی وجہ سے قنبر کی بے احترامی کی گئی اور وہ بے چین ہوئے اور جواب دینا چاہتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ''؛مھلا یا قنبر، دع شاتمک مھاناً ترضی الرحمن و تسخط الشیطان و تعاقب عدوک فوالذی فلق الحبۃ و برء النسمۃ ما ارضی المؤمن ربہ بمثل الحلم و لا أسخط الشیطان بمثل الصمت و لا عوقب الاحمق بمثل السکوت عنہ[1]''؛ ''ٹھیر والے قنبر! گالی دینے والے سےبے اعتنائی کرو اور اس کو اسی کی حالت پر چھوڑ دو تا کہ خدائے متعال کو خوش کرو اور شیطان کو غضبناک اور دشمن کو سزا دو (کیونکہ دشمن کی اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کا اعتنا نہ کیا جائے) قسم اس خدا کی جو دانہ کہ شگافتہ کرنے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا ہے، مومن حلم و بردباری سے زیادہ کسی اور چیز سے خدا کو راضی نہیں کرتا ہے، غصہ کو ضبطکرنے سے زیادہ کسی اور چیز سے شیطان کو ناراض نہیں کرتا اور احمق کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنے سے زیادہ اسے کسی اور چیز سے سزا نہیں دیتا ہے۔ ''حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں '':لا شرف کالعلم و لا عز کا لحلم[2]'''' علم

[1] بحار الانوار ، ج ۷۱،ص ۴۲۴

[2] نہج البلاغہ(فیض الاسلام) حکمت ۱۰۹ص ۱۱۳۹

کے برابر کوئی عظمت و بزرگی نہیں ہے اور بردباری کے برابر کوئی احترام نہیں ہے۔ ''حلم و بردباری کی صفت کی عظمت اور صحیح اجتماعی روابط کے تحفظ اور انسانوں کے متقابل احترام کی حفاظت میں اس کے اہم نقش کے پیش نظر ضروری ہے کہ معاشرے کا فرد فرد اس صفت سے مزین ہو، خاص کر علما جو اصلاح اور تربیت کا کام انجام دیتے ہیں. جو عالم ہدایت اوراصلاح کرنے ولاہوتاہے، اگر ناشائستہ رفتار کے مقابلہ میں وہ بھی جوابا ویسا ہی کردار پیش کرے تو اس کے اصلاحی پروگرام بے اثر اورناکام ہوجائیگا۔ اس لحاظ سے اسے ہمیشہ اپنے علم کو حلم و بردباری سے منسلک کرناچاہئےتاکہ مطلوبہ نتیجہ کو حاصل کر سکے۔

لہذا انسان کو حقائق بیان کرنے اور ان کے تبلیغ میں صابر اور با حوصلہ ہونا چاہئے۔ اس نکتہ کے پیش نظر علم و تربیت کا نتیجہ حلم وبردباری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':والذی نفسی بیدہ ما جمع شیء الی شیء افضل من حلم الی علم''[1] ''اس پروردگار کی قسم جس کی اختیار میں میری جان ہے، حلم کو علم کے ساتھ ملحقھونے کے مانند کوئی چیزاس سے بہتر صورت میں دوسری چیز کے ساتھ ملحق نہیں ہوئی ہے''

جی ہاں علم کے بعد بلند ترین کمالات نفسانی میں حلم و بردباری ہے، جیسا کہ ہم نے کہا کہ علم کا حلم کے بغیر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے جب کبھی علم کی ستائش ہوتی ہے، حلم کا بھی اس کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، حقیقت میں علم و حلم دوقابل قدر او رلازم و ملزوم عناصر کیحیثیت سے ذکر ہوتے ہیں۔

لہذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':اللہم اغننی بالعلم و زینّی بالحلم''[2] ''پروردگارا!مجھے علم کے سبب بے نیاز اور علم سے زینت عطا کر'' یقیناً جو انسان علم و حلم کو اپنی زینت قرار دے، بحرانی مراحل میں جب کینہ و عداوت کی آگ کسی کے داخل سے شعلہ ور ہوتی ہے، تو اس وقت وہ رحم و محبت کے بہترین شیوہ کو اپناتا ہے اور اس کا حلم کینہ کی آگ کو شعلہ ور ہونے سے روکتا

---

[1] بحار الانوار،ج ۲، ص ۴۶
[2] بحار الانوار،ج۹۷،ص ۳۶۸

ہے اور اختیار کی باگ ڈور نفسانی خواہشات کے ہاتھ میں نہیں دیتا، بلکہ اسے اپنے نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرنے اور اپنی اوردوسروں کے غضب کی آگ کو بجھانے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐاور آپؐ کے اصحاب کے خلاف مشرکین کی طرف سے پہنچائی گئی انواع و اقسام کی اذیت و آزار کے باوجود فتح مکہ کے وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی بردباری کا مظاہرہ فرمایا اور عفو، بخشش اور رحم دلی کو اپنی سرمشق قراردیا۔ اس وقت دشمن یہ توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خون کی ہولی کھیلیں گے حتی بعض اسلامی کمانڈر جو انتقام لینے کی فکر میں تھے،ابوسفیان سے مخاطب ہوکر کہنے لگے ''الیوم یوم الملحمۃ''، ''آج کا دن سخت جنگ اور انتقام کا دن ہے''

لیکن پیغمبر اسلامؐ نے انتقامی اشعار کے جواب میں یہ محبت آمیز اشعار فرمائے ''الیوم یوم المرحمۃ الیوم اعزّ اللہ قریشا''[1]، آج، رحمت اور نیک برتاؤ کا دن ہے، آج کے دن خدا نے قریش کو عزت بخشی ہے۔

بیشک انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے روابط برقرار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ خدائے متعال نے اس کو ایسے خلق کیا ہے کہ اسے اجتماعی زندگی کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، اگر وہ معاشرے سے دور تنہائی میں زندگی گزارنا چاہے تو اس کو دنیا کی اکثر برکتوں سے محروم ہونا پڑے گا اور وہ تکامل و ترقی کی راہ میں قدم نہیں بڑھا سکے گا، شاید وہ اپنی زندگی کو بھی جاری نہیں رکھ سکے گا۔

لہذا وہ زندگی کو جاری رکھنے اور تکامل و ترقی کے لئے مجبور ہے، تاکہ اجتماعی زندگی اور دوسروں کے ساتھ روابط کو قبول کرے۔ دوسری طرف سے لوگ جذبات، اخلاق اور فہم و معرفت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فراوان تفاوت رکھتے ہیں اور اس لئے انسان خواہ مخواہ ایسے افراد سے سروکار پیدا کرتا ہے جوبیوقوفانہ عادات رکھتے ہیں۔ کبھی وہ ایسے افراد سے رابطہ پیدا کرتا ہے کہ ان کی غیر عاقلانہ عادات اور برتاؤ کی وجہ سے اس کی توہین اور بے احترامی ہوتی ہے۔کمال و معرفت انسانی کے لحاظ سے تمام

[1] بحار الانوار، ج۲۱، ص۱۰۹

انسان کمال کی حد تک نہیں پہنچے ہیں اور ایسی عقل نہیں رکھتے ہیں کہ انھیں شائستہ او رمودبانہ برتاؤکرنے پر مجبور کرے ۔ اس لحاظ سے کبھی جس شخص سے انسان رابطہ برقرار کرتاہے یا ایک انسان اپنے اہل کار کار یا کسی مسؤل سے کہ جس کے پاس لوگ مراجعت کرتے ہیں، اصلاح کے فقدان، معرفت کی کمی یا زندگی کی مشکلات اور دباؤ کی وجہ سے معاندانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرتا ہے اور آداب اور دوسروں کے احترام کی رعایت نہیں کرتا تو فطری بات ہے کہ اگر انسان ایسے افراد کے مقابلہ میں ان کا ہی جیسا برتاؤ کرے اور فوری طور پر غضبناک ہوکر لڑائی اور جھگڑے کے لئے آمادہ ہوجائے، تو اختلاف اور ٹکراؤ میں شدت پیدا ہوگی اور اس کے بُرے نتائج نکلیں گے۔ اس طرح انسان کا وقت ضائع ہوگا، آرام و خوشحالی اس سے چھن جائے گی ۔ اور وہ اپنی زندگی کی آرزؤں تک نہیں پہونچ پائیگا ۔ پس انسان کو اجتماعی زندگی سے مناسب طور پر بہرہ مند ہونے اور اس کی آفتوں سے بچنے کے لئے اپنے اندر حلم و بردباری ایجاد کرنی چاہئے تا کہ ایسے افراد سے روبرو ہوتے وقت اپنے آپ کو کنٹرول کر سکے۔

انسان کو اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لئے صاحب ورع ہونے کے علاوہ بردبار بھی ہونا چاہئے تا کہ اپنی اجتماعی زندگی سے بہرہ مند ہواور نقصان سے دوچار نہ ہو۔ چونکہ اگر انسان اجتماع سے دور ہوتاہے تو اس کے منافع سے محروم ہوجاتاہے، لیکن اگر اجتماعی منافع سے اپنی اخروی زندگی کے لئے استفادہ کرنا چاہے اور کم عقل اور جھگڑالو انسانوں سے محفوظ رہنا چاہے تو ان سے ٹکراؤ کی حالت پیدا نہ ہونے کے لئے بردبار ہونا چاہئے۔ اسے بردباری کی مشق کرنی چاہئے، تا کہ حقارت اور توہین آمیز حالت کے مقابلہ میں ان سے مظاہرہ کرے اور اپنے فرائض پر عمل کر سکے او اجتماع سے فائدہ اٹھائے اور ناشائستہ برتاؤ اس کے تکامل وترقی میں رکاوٹ نہ بنے اور روایت کی تعبیر میں وہ ''ایک ایسے حلم کا مالک ہو کہ جہل ونادانی کو اپنے آپ سے دور کر سکے۔

''ہمارے تصور کے خلاف کہ ہم جہل کو عدم علم سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے صرف علم کے مقابلہ میں استعمال میں لاتے ہیں، جہل بیوقوفی کے معنی میں بھی ہے اور سفاہت و حماقت کے مانند عقل کے مقابلہ میں استعمال ہوتاہے۔ اسی بنا پر جہل، جاہلانہ اور احمقانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرنے کے معنی میں بھی ہے اور قرآن مجید کی اکثر آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلا خدائے متعال

حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی نقل کرتاہے: (والا تصرف عنیّ کید ہن أصب الیہن وأکن من الجاہلین[1]) ''اور اگر تم ان کے مکر کو میری طرف سے نہیں موڑ دو گے تو میں ان کی طرف مائل ہوسکتاہوں اور میرا شمار بھی جاہلوں میں ہو سکتاہے۔'' مقصود یہ ہے کہ اگر عورتوں کے حیلہ کو مجھ سے دور نہ کروگے تو مجھ سے احمقانہ اور غیر دانشمندانہ کام سرزد ہوگا۔ ایسی آیتوں میں عدم علم کو جہل سے معنی کرنا غلط ہے دوسری طرف سے علم کا فقدان اکثر مواقع پر عذر ہے، حالانکہ یہ کلمہ بیشتر سرزنش و عدم عذر کے مقام پر آیا ہے، چنانچہ خدائے متعال یوسف کے بھائیوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتاہے: (ہل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیہ اذ انتم جاہلون[2]) ''معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے جب کہ تم بالکل جاہل تھے؟'' یقیناً یوسفؑ کے بھائی اپنے کام اور عمل سے بے خبر نہیں تھے، وہ یوسفؑ کو پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ ان کا یہ فعل ناشائستہ ہے اسی حالت میں جاہل بھی تھے کہ ان کا کام جاہلانہ یعنی خلاف عقل و حق تھا۔

اسی طرح جب حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدائے متعال نے تمھیں حکم دیا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرنا، انہوں نے اسے کہا: کیا ہمارا مذاق اڑاتے ہو؟ فرمایا: (...اعوذ باللّٰہ ان اکون من الجاہلین[3])... ''پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں'' اس آیت میں جہل سفاہت کے معنی میں ہے نہ علم کے فقدا ن کے معنی میں اور حضرت موسی علیہ السلام عدم علم کے لئے خدا سے پناہ نہیں مانگتے ہیں بلکہ بے عقلی و بیوقوفی، جاہلانہ اور خلاف عقل رفتار سے پناہ مانگتے ہیں۔ اصول کافی میں ایک کتاب ''علم'' کے نام سے مخصوص ہے اور ایک دوسری کتاب ''عقل و جہل'' کے نام سے ہے۔

یہ اس لئے ہے کہ اس کتاب میں جہل عقل کے مقابلہ میں ہے نہ علم کے مقابلہ میں اور جیسا کہ ہم نے کہا: غالبا جہل و جہالت نادانی اور احمقانہ رفتار کو کہا جاتا ہے اور عقل کے مقابلہ میں استعمال ہوتاہے نہ علم کے مقابلہ میں۔ حلم و بردباری، اولیائے الٰہی کے لئے

---

[1] یوسف/۳۳
[2] یوسف/۸۹
[3] بقرہ/۶۷

زینت بخش: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نصیحتوں میں اس نکتہ کی طرف تاکید فرماتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی مجبورا کم عقل اور کم شعور افراد سے روبرو ہوتاہے کہ وہ غیر عاقلانہ اور جاہلانہ رفتار رکھتے ہیں، بہترین رفتار جو ان کے ساتھ روا رکھ سکتا ہے، ان کی بے ادبی کو برداشت کرنا اور بردباری کا مظاہرہ کرنا ہے کہ اس صورت میں اجتماعی منافع سے بھی بہرہ مند ہوتاہے اور نادانوں اور بے عقلوں سے ٹکراؤ پیش آنے سے بھی بچ جاتاہے اور ان کی دشمنی سے نجات پاتاہے اور اس طرح خدا کی نظر میں محبوب قرار پاتا ہے'': قال رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ان اللہ یحب الحی الحلیم العفیف المتعفف[1] 'خدائے تعالے باحیا، بردبار، پاک دامن اور عالی ظرف شخص کو دوست رکھتا ہے۔

قرآن مجید نادان دشمنوں سے مبارزہ کے بارے میں یوں بیان فرماتاہے: (ولا تستوی الحسنۃ و لا السیءۃ ادفع بالتی ہی احسن فاذاالذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم. و ما یلقّہا الا الذین صبروا و ما یلقّہا الا ذو حظّ عظیم و اما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ہو السمیع العلیم) ''نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، لہذا تم برائی کا جواب بہترین طریقہ سے دوکہ اس طرح وہ شخص جو تمہارا دشمن ہے وہ بھی ایسا ہوجائے گا جیسے ایک گہرا دوست ہوتاہے۔ اور یہ صلاحیت انھیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور یہ بات انھیں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔ اور جب تم میں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتو اللہ کی پناہ طلب کرو کہ وہ سب کی سننے والا اور سب کو جاننے والاہے''

قرآن مجید سرکشوں اور بیوقوفوں کے بارے میں جو شیوہ بیان کرتاہے وہ ظریف ترین، اور اہمیت ترین تربیتی روش ہے۔ کیونکہ جو بھی برائی کرتاہے، وہ مقابلہ بہ مثل کے قانون کے تحت یہی امید رکھتا ہے کہ مدمقابل بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرے گا، لیکن جب وہ توقع کے خلاف سالم اور تعمیری برتاؤ دیکھتا ہے تو بدل جاتاہے اور اس کے اندر ایک طوفان پیدا ہوتاہے اور ضمیر کے دباؤ کے اثر میں بیدار ہوتا ہے اور احساس کم تری سے دوچار ہوکر اپنی ناشائستہ روش کو تبدیل کرتاہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسے لوگوں کی ایک

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۷۴

بڑی تعداد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گرد پاتے ہیں کہ فرمان الہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت او ربردباری کی صفت ان لوگوں کے جمع ہونے کا سبب بنی تھی: (فبما رحمة من اللہ لنت لھم و لو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم و استغفر لھم و شاورھم فی الامر[1]) "پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، لہذا اب انھیں معاف کردو۔

ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو" اس کے علاوہ خدائے متعال اپنے صالح بندوں کی منطقی رفتار کے بارے میں فرماتا ہے: (و عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما[2]) "اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو سلامتی کا پیغام دیتے ہیں۔" نقل کیا گیا ہے کہ ایک دانا شخص کا دوست اس کے گھر تشریف لایا۔ دانا شخص نے اس کے سامنے کھانا پیش کیا، اس حکیم و دانا کی بداخلاق بیوی نے آکر مہمان کے سامنے سے کھانا اٹھالیا اور حکیم کو برا بھلا کہا۔ وہ مہمان رنجیدہ ہوکر اس کے گھر سے چلاگیا۔ حکیم اس کے پیچھے پیچھے دوڑااور جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس سے کہا: کیاوہ دن آپ کو یاد ہے جب ہم آپ کے گھر میں مہمان تھے اور کھانا کھاتے وقت ایک مرغی پرواز کرکے ہمارے دسترخوان پر آپڑی اور سارا کھانا خراب کردیا اور ہم میں سے کوئی بھی رنجیدہ نہیں ہوا؟ اس وقت آپ تصور کریں کہ میری بداخلاق بیوی اسی مرغی کے مانند ہے! یہ بات سن کر اس شخص کا غصہ سرد ہوا اور کہا: دانا نے سچ کہا ہے کہ حلم و بردباری تمام دردوں کی دوا ہے۔

امام حسن مجتبی علیہ السلام کی زندگی کے حالات میں ذکر ہوا ہے کہ ایک روز ایک شامی شخص نے جو بنی امیہ کے پروپگنڈا کے اثر میں اہل بیت علیہم السلام کا بغض دل میں رکھے ہوئے تھا مدینہ کے ایک کوچہ میں حضرتؑ سے ملاقات کی اور فی الفور حضرتؑ کے خلاف برا بھلا کہنا اور گالیاں دینا شروع کردیا۔ حضرتؑ نے بردباری اور خاموشی کے بعد فرمایا: مجھے لگتا ہے تم اس شہر میں اجنبی

---

[1] آل عمران/۱۵۹
[2] فرقان/۶۳

ہو اور تم مغالطہ اور غلط فہمی سے دوچار ہوئے ہو۔ اگر گھر نہیں رکھتے ہو تو میرا گھر حاضر ہے۔ اگر مقروض ہو تو میں تمھارے قرض کو اپنے ذمہ لیتا ہوں اور اسے میں ادا کروں گا۔ اگر بھوکے ہو تو تجھے سیر ہونے تک کھانا کھلاؤں گا ۔ حضرتؑ کا برتاؤ اس شخص کے لئےخلاف توقع تھا اور اس رفتار نے اس کے دل میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور حضرتؑ سے اتنا متاثر ہوا کہ کہا: اے فرزند رسول !اگر اس سے پہلے مجھ سے سوال کیا جاتا کہ روئے زمین پر کون بدترین انسان ہے تو جواب میں آپ کو اور آپ کے باپ کو بیان کرتا لیکن اب آپ کو بہترین انسان کی حیثیت سے جانتا ہوں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی کے حالات میں کہا گیا ہے:ایک شخص خواجہ کے پاس آیا اور ایک تحریر انھیں دی کہ لکھنے والے نے اس میں خواجہ کو برا بھلا لکھا تھا، اس میں گالیاں لکھی تھیں اور اسے کلب بن کلب (کتا اور کتے کا بیٹا) کہا تھا: خواجہ نے اس کی اس نفرت بھری کے مقابلہ میں محبت آمیز زبان میں یوں جواب دیا: یہ جو مجھے کتا کہا گیا ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ کتا ان جانوروں میں ہے جو ''عوں عوں'' کرتا ہے اور اس کی کھال بال (روئیں) سے بھری ہوئی ہے اور اس کے ناخن لمبے ہوتے ہیں اور مجھ میں ان خصوصیات میں سے کوئی بھی خصوصیت موجود نہیں ہے: میرا قد بلند ہے، میرے بدن پر بال (روئیں) نہیں ہیں اور میرے ناخن لمبے نہیں ہیں، باتیں کرتا اور ہنستا ہوں اور جو خصوصیات مجھ میں ہیں وہ کتے میں نہیں ہیں۔ جو کچھ مجھ میں ہے وہ اس لکھنے والے کے دعوی کی تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام حلم کے اجتماعی فوائد میں سے ایک یعنی حلم و بردباری کے بارے میں فرماتے ہیں'': اول عوض الحلیم من حلمہ ان الناس انصارہ علی الجاہل[1]'' ''بردبار کی بردباری کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ جاہل و نادان کے مقالہ میں لوگ اس کے حامی اور مددگار بن جاتے ہیں۔ ''سعدی کہتے ہیں:

از صدف یادگیر نکتہ حلم

آنکہ برّد سرت گہر بخشش

[1] نہج البلاغہ(فیض الاسلام)حکمت ۱۹۷،ص ۱۱۷۹

(نکتہ حلم کو صدف سے سیکھنا۔جب اسے کاٹا جاتاہے تو موتی بخشتاہے)نرمی و تواضع اور چاپلوسی اور خوشامد کے درمیان فرق:

تیسری خصوصیت، جس کی طرف توجہ کرنا انسان کو قیامت کے نقصان سے بچاتا ہے، لوگوں سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا ہے۔ ''مدارات'' معنی کے لحاظ سے ''نرمی'' کے نزدیک ہے، کیونکہ ''مدارات'' بہ معنی، نرمی، رفتار میں ملائمت، لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت اور ان کی آزار رسانی اور اذیت برداشت کرنے کے معنی میں ہے۔ ''مدارات'' کی ستائش اور اس کے دنیوی اور اخروی فائدوں کے بارے میں فراوان روایتیں نقل ہوئی ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایاہے'':المداراۃ نصف الایمان''''لوگوں کے ساتھ مدارات کرنا نصف ایمان ہے''مزید فرمایا'':ثلاث من لم یکن فیہ لم یتم لہ عمل: ورع یحجزہ عن معاصی اللہ و خلق یداری بہ الناس و حلم یردبہ جھل الجاھل''''تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر کسی میں نہ ہوں تو ان کا کام مکمل نہیں ہے: گناہ سے بچانے والا ورع، لوگوں کے ساتھ مدارات کرنے والا اخلاق ، اور بے عقلوں کی بیوقوفی کو دور کرنے والا حلم[1]''

ایک اور جگہ پر لوگوں کے ساتھ مدارات کو واجب اور تکالیف کی فہرست میں قرار دیتے ہوئے فرماتاہے'':انا معاشر الانبیاء امرنا بمدارات الناس کما امرنا باداء الفرائض[2]''''ہم انبیاء لوگوں کے ساتھ مدارات کرنے کے لئے مامور ہوئے ہیں جس طرح واجبات اور تکالیف کے لئے مامور ہوئے ہیں''انسان برابر ایسے افراد سے روبرو ہوتاہے جو اپنے خاص اغراض و مقاصد کے لئے ناشائستہ رفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات حسد اور اور دیگر بری عاداتیں انھیں دوسروں کے ساتھ معاشرت کے دوران ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کرتی ہیں،جن سے نقصان پہنچتا ہے۔بات یہ ہے کہ ان افراد کے ساتھ روبرو ہوتے وقت انسان کونسا رویہ اختیار کرے؟ اگر ایسے شخص کے مقابلہ میں کہ جو اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں یا اس کے حق میں کوتاہی یا بے ادبی سے پیش آتے ہیں ویسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے تو ٹکراؤ اور جھگڑے کی نوبت آجائیگی اور بالکل ایسی مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا کہ جیسا انسان کو احمقوں اور نادانوں کے ساتھ پیش آنا پڑتا ہے۔

---

[1] اصول کافی(با ترجمہ) ج ۳، ص ۱۷۹
[2] بحار الانوار ،ج ۷۵،ص ۵۳

ایسے مواقع پر جوابی کا رروائی کو نظر انداز کرنا چاہئے او رمدارات کا شیوہ اختیار کرنا چاہئے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ عفو و گزشت اور چشم پوشی کی مشق سے ایسے افراد کے ساتھ مدارات سے پیش آئے اور ان کے مقابلہ میں جلدی کوئی رد عمل نہ دکھائے۔ بعض مواقع پر ایسے تغافل کا مظاہرہ کرے گویا متوجہ نہیں ہوا ہے کہ انھوں نے کیا کیا ہے او رکیا کہا ہے۔ بعض مواقع پر انسان کو دوسروں کے ناشائستہ برتاؤ کے مقابلہ میں چشم پوشی کرنی چاہئے باوجودیکہ اس کے حق میں دشمنی کی گئی ہے نہ صرف یہ کہ وہ دشمنی نہ کرے، بلکہ ان کی خدمت بھی کرے، اگر انسان اپنی زندگی میں اس قسم کی عادت واطوار کو اپنالے تو اس نے دوسروں کی خود غرضی اورآزار و اذیت کے مقابلہ میں مدارات کا مظاہرہ کیا ہے، ایسا شخصمنزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

لیکن اگر ہر اس شخص کے ساتھ کہ جس نے اس کے ساتھ دشمنی حق تلفی کی ہے، لڑنا چاہے تو، لڑنے جھگڑنے سے انسان کی توانائی بیہودہ امور میں صرف ہوتی ہے اور ایک جہت سے اس کا ذہن پریشان ہوتا ہے اور دوسرے وقت بھی ضائع ہوتا ہے نیز فرصت کے اوقات بھی ہاتھ سے چلے جاتے ہیں اور اس طرح رنجش اور کدورتوں کے علاوہ دشمنیاں بھی بڑھتی ہیں۔

پس ایسے افراد سے روبرو ہونے کی صورت میں بہترین طریقہ راہ مدارات ہے، کیونکہ دوسروں کے ساتھ مدارات و نرمی سے پیش آنا عاقلوں اور باشعور افراد کا شیوہ اور کامیابی کی کنجی ہے ''علیک بالرفق فانہ مفتاح الصواب و سجیۃ اولی الالباب[1]'' ''تمہاری لئے دوسروں کے ساتھ مدارات و نرمی سے پیش آنا لازم ہے، کیونکہ وہ دوستی کی کنجی اور عقلمندوں کی روش ہے۔'' جس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کبھی مدارات کا مداہنت سے مغالطہ ہوتا ہے، مداہنت مخالفین، حق اور انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہماہنگی اور موافقت ہے، یعنی انسان حقائق کے بیان اور خدا کے دین کی تبلیغ و ترویج میں سستی کرے اور اگر دوسروں کی طرف سے کسی انحراف کا مشاہدہ کرے تو کسی قسم کا اعتراض نہ کرے ۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

[1] غررالحکم (ترجمہ محمد علی انصاری) ص ۴۷۹

''ولعمری ما علیّ من قتال من خالف الحق و خابط الغی من ادہان و لا ایہان[1]...'''' اپنی جان قسم، حق کے مخالفوں اور ضلالت و گمراہی میں قدم رکھنے والوں کے ساتھ تسامح و سستی نہیں برتوں گا''ایک دوسری جگہ پر اپنے زمانے کے ان سست عناصر کی شکایت کرتے ہیں جو حق کی بات نہیں کہتے تھے اور آرام و آسائش کی راہ کو انتخاب کر چکے تھے اور فرماتے ہیں '':و اعلموا رحمکم اللہ، انکم فی زمان القائل فیہ بالحق قلیل و اللسان عن الصدق کلیل و اللازم للحق ذلیل اہلہ معتکفون علی العصیان مصطلحون علی الادہان[2]...''
''خدا تمھیں بخش دے، جان لو کہ تم ایک ایسے زمانہ میں زندگیگزار رہے ہو کہ اس میں حق بولنے والے کم، سچ بولنے والی زبانیں کند اور حق کے طالب ذلیل ہیں۔ لوگ نافرمانی پر اترآئے ہیں اور اپنے ہم یاروں اور ہمراہوں کے ساتھ مداہنت کرتے ہیں۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ، حق کی مخالفت میں، قیام کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی اور مداہنت کی سرزنش فرماتے ہیں اور مداہنت کو ایک پست، قابل مذمت، معاشرے کو تباہ کرنے اور اس کی عزت و آبرو کے ارکان کو منہدم کرنے والی خصلت جانتے ہیں۔ اس بنا پر مداہنت کو دشمنوں کے ساتھ مدارات، نرمی، اپنے حق اور شخصی منافع کے سلسلے میں اجتماعی مصلحتوں اور دین خدا کو احیاء اور زندہ کرنے کے پیش نظر عفو و بخشش کے معنی کے ساتھ مغالطہ نہیں کرنا چاہئے جو ایک شائستہ اور تعمیری خصلت ہے۔

معاشرے میں، ایسے ٹھنڈے مزاج کے انسان ہوتے ہیں جو اپنے بارے میں رونما ہونیوالی رودادوں کے بارے میں کسی قسم کا رد عمل نہیں دکھاتے اور لوگوں کی مشکلات ،دینی اور ثقافتی مشکلات جو ان کے اپنے لئے یا دوسروں کے لئے پیش آتی ہیں، کے مقابلہ میں بے اعتنائی دکھاتے ہیں۔ اس قسم کے افراد جذبات او راحساسات سے عاری، سست، کاہل او رآرام طلب ہوتے ہیں اور ایک ایسی جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں جس کے ساتھ ٹیک لگا کر دنیا سے بے خبری اور خوشی کے عالم میں آرام میں ہوں۔ جب کبھی مبارزہ کا وقت آتا ہے اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کے لئے جہاد کے لئے اٹھنے کی باری آتی ہے تو یہ لوگ بھاگ جاتے ہیں اور اپنی جان بچاتے ہیں۔ فطری بات ہے کہ یہ لوگ اپنے کام کے لئے توجیہ پیش کرتے ہیں، کیونکہ کوئی یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ۲۴، ص ۸۷
[2] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۲۲۴، ص ۷۲۹

میں بُرا انسان ہوں اور برا کام انجام دیتا ہوں بلکہ اپنی رفتار کی توجیہ کے لئے کوئی نہ کوئی ظاہر ی بہانا تراشتا ہے۔ عام طور پر ان لوگوں کی توجیہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ مدارات کرنا ضرروی ہے اور سخت گیری نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ تند برتاؤ کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا اور کبھی اس شعر کا سہارا لیتے ہیں:

آسائش دوگیتی تفسیر این دو حرف است

با دوستان مروت با دشمنان مدارا

(دوجہان کی آسائش ان دو کلموں کی تفسیر ہے،دوستوں سے مروت اور دشمنوں سے مدارات)بعض اوقات ایسی احادیث کا سہارا لیتے ہیں جو دوسروں سے مدارت کو حاصل کرنے کے عامل کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ اگربنا یہ ہو کہ یہی ذہنیت او رطرز تفکر معاشرے میں پھیل جائے،تو کبھی جہاد و مبارزہ نہیں ہوگا او رکوئی تحریک محقق نہیں ہوگی او رجہاد کا راستہ بند ہوجائے گا.چنانچہ ہم نے کہا کہ، یہ نرمی او رسستی حق کے سلسلہ میں مداہنت ہے اور خودخواہ اور آرام طلب انسان ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے اسے اپنے لئے سند قرار دیتے ہیں اور اسے شرعی رنگ بھی دیتے ہیں تا کہ اجتماعی ذمہ داریوں اور دشمنوں سے جہاد کے فریضہ کے سلسلہ میں بہتر صورت میں پہلوتہی کریں اور دشمنوں سے نہ لڑیں۔ یہ شیوہ انتہائی ناپسند ہے اور اس کے ناشائستہ آثار او غلط رنتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید اس کی واضح طور پر مذمت کرتا ہے۔

مشرکوں کے مقابلہ میں پیغمبرؐ کا نرمی سے پیش نہ آنا:صدر اسلام میں کفار و مشرکین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مکرر درخواست کررہے تھے کہ آپ اپنے دین میں نرمی دکھائیں تا کہ وہ بھی اپنی رفتار میں نرمی دکھائیں،حقیقت میں وہ اس کوشش میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کو کچھ امتیازات دیکر ان سے کچھ امتیازات حاصل کریں اور پیغمبر اسلامؐ کو اپنے مقابلہ میں نرمی او رانعطاف دکھانے پر مجبور کریں، وہ آپؐ سے چاہتے تھے کہ دوسرے دنیوی رہبروں کے مانند اپنے مقاصد کو نافذ کرنے کے

بارے میں سخت گیری سے ہاتھ کھینچ لیں اور نرمی اور ہمدردی کا مظاہر کرتے ہوئے پنے مخالفوں کے نزدیک آجائیں۔ خدائے متعال ان کی درخواست کے بارے میں فرماتا ہے:(ودّوا لو تدہن فیدہنون[1]) ''یہ چاہتے ہیں آپ ذرا نرم ہوجائیں تو یہ بھی نرم ہو جائیں''یقیناً دشمن کے مقابلہ میں نرمی دکھانا اور احکام الٰہی کے نفاذ اور الٰہی اقدار کی ترویج،اور فساد سے مبارزہ میں پیچھے ہٹنا،مطلوب مدارات نہیں ہے،بلکہ مداہنت ہے،اس لئے خدائے متعال نے اس کام کی سختی سے نہی کی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاہتا ہے کہ احکام الٰہی کے نفاذ میں سختی سے اقدام کریں:(وان احکم بینہم بما انزل اللہ ولاتتبع اہواء ہم واحذرہم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک فان تولوا فاعلم انما یرید اللہ ان یصیبہم ببعض ذنوبہم[2]...) ''اور اے پیغمبر آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق حکم کریں اور ان کے خواہشات کا اتباع نہ کریں اور اس بات سے بچتے رہیں کہ یہ بعض احکام الٰہی سے منحرف کردیں۔ پھر اگر یہ خود منحرف ہوجائیں تو یاد رکھیں کہ خدا ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔''

ہر قسم کاسازباز اور نرمی، مدارات نہیں ہے، مدارات اس جگہ پر ہے جہاں اس کے پس منظر میں صحیح عقلائی غرض ہو کہ انسان اس عقلائی مقصد اور بالاتر مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے،لوگوں کی ایجاد کی ہوئی بعض مشکلات کو برداشت کرے۔ نہ یہ کہ انسان ہر کسی اور ہر رفتار کے مقابلہ میں ٹھنڈے مزاج سے رد عمل کا مظاہرہ نہ کرے اور مدارات کے نام پر دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرے۔ ہمیں مدارات اور مداہنت میں فرق کرنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ اسلامی مقاصد او ردین کے مسائل میں عفو و بخشش سے کام نہیں لینا چاہئے اور نرمی نہیں دکھانی چاہئے اور فکری اور رفتاری اصول کے بارے میں نرمی اور انعطاف دکھانا ایک ناپسندیدہ امر ہے، جب انسان کے لئے فریضہ الٰہی مشخص اور اس کے شرائط فراہم ہوں تواسے قطعی طور پر انجام دینا چاہئے اور اس کوانجام دینے کی راہ میں مضبوط اور مستحکم ہونا چاہئے اور ہر قسم کی بے توجہی اور لاپروائی سے پرہیز کرنا چاہئے۔یہ ذہنیت پسندیدہ نہیں ہے کہ انسان ہمیشہ نرمی دکھائے اور ہر ایک کے ساتھ سازباز کرے، حتی الٰہی اہداف و مقاصد میں بھی سازباز کرے۔ انسان کو زندگی کے آخری

[1] قلم/۹
[2] مائدہ/۴۹

لمحہ تک الٰہی مقاصد کے نفاذ میں ڈٹ جانا چاہئے او راستقامت دکھائے او رعفو و بخشش کا مظاہرہ نہ کرے۔ جب ہم دشمنوں کے لاؤڈ سپیکروں سے پروپیگنڈے کی گنگناہٹ سنتے ہیں،تو جو جملہ قابل توجہ ہے وہ اصول پرست کا عنوان ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔البتہ ان کا اس عنوان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری ملت کو کمزور کریں اور ہمارے چہروں کو انتہا پسند اور بے رحم کے عنوان سے پیش کریں۔ لیکن جب ہم اس عنوان پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت مناسب اور بجالقب ہے، ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ جی ہاں! ہم اصول پرست ہیں او رہمیشہ اپنے اصول کا تحفظ کرتے ہیں او راعتقاد رکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے اصلی مقاصد اور ارمانوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے اور ان کے بارے میں سازباز نہیں کرنا چاہئے۔بلکہ بعض اوقات ضروری ہے وقتی طور پر مصلحتی نرمی اور بخشش کا مظاہرہ کریں اور غیر اہم اور غیر حیاتی مسائل کے بارے میں قدرے عقب نشینی کریں لیکن بنیادی اصول پر کبھی سودا نہیں کرنی چاہئے۔

مکہ کے سخت دنوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے سخت دباؤ میں تھے اور آپؐ کے اصحاب پر مشرکوں اور بت پرستوں کی طرف سے جسمانی اذیت و آزار ڈھائے جاتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کی تبلیغ کی راہ میں اور رسالت کے پیغام کو پہچانے میں شدید رکاوٹیں ایجاد کی گئیں چنانچہ وقفہ وقفہ سے آپ کی پیروی اور اتباع کرنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو بلند الٰہی ارمانوں کی قربان گاہ عشق کی راہ میں اپنی جان نچھاور کرنا پڑتی تھی۔ فطری طور پر اس پکڑ دھکڑ کے دوران مظلوم اور زیر عذاب مسلمانوں کا سب سے بڑا مقصد ،ان مشکلات اور دباؤ سے رہائی حاصل کرنا اور ان افراد کی حمایت حاصل کرنا تھا، جو ان کو قریش کے مقابلہ میں مسلح کرکے نجات کے اسباب فراہم کرتے۔ مورخین نے کہا ہے کہ اس نازک وقت میں اہل طائف نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدد کی تجویز پیش کی تا کہ جنگوں اور لڑائیوں میں مسلمانوں کے دوش بدوش رہیں اور اپنی جان و مال سے ان کا دفاع کریں۔ ان کی یہ شرط تھی ان پر نماز پڑھنے کی پابندی نہ ہو۔کیونکہ وہ زمین پر سجدہ کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، حقیقت میں ان کی ثقافت اس قسم کی رفتار کو قبول نہیں کرتی تھی۔پیغمبر اسلامؐ کو یہ تجویز اس وقت دی گئی جب آپؐ انتہائی مشکلات اور

سختی سے دوچار تھے اور دشمنوں نے انھیں ہر طرف سے دباؤمیں رکھا تھا۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دوسرے اجتماعی رہبروں کے مانند ہوتے تو اس قسم کی تجویز کا استقبال کرتے اور فرصت کو غنیمت سمجھتے اور تعہد نامہ منعقد کرکے اپنے ہم پیمان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے اور ایک مناسب فرصت کے انتظار میں رہتے، تا کہ ان کو آہستہ آہستہ نماز عبادت و بندگی سے آشنا کراتے اور ان کے لئے ثقافتی کام انجام دیتے۔

بعض مفسرین کے کہنے کے مطابق اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: (ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا[1]) ''اور اگر ہماری توفیق خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ (بشری طورپر) کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہوجاتے[2]''خدائے متعال اشتباہ فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مسلمان مشرکوں کے مطالبات کی طرف رجحان پیدا کریں اور دین کے سلسلہ میں سودا کریں؟ تمام جنگ اور مبارزات دینی مسائل میں ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ لوگ خداپرست بن جائیں اور خدائے متعال سے رابطہ پیدا کریں پس ان کے نزدیک آنا اور ان سے سودا کرنا کیسے ممکن تھا جب تک کہ وہ خدا سے رابطہ پیدا نہ کرتے؟ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل طائف کی تجویز کے جواب میں فرمایا'':لا خیر فی دین لا رکوع فیہ و لا سجود[3]''''جس دین میں رکوع و سجود نہ ہوا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ''

وہ چاہتے تھے پیغمبرؐ نرمی دکھائیں اور اپنے اصول سے منصرف ہوجائیں، تا کہ وہ ان کے پاس رہیں،لیکن نہ خدائے متعال اس قسم کی اجازت دیتا تھا اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا سودا کرتے،لہذا ان سے فرمایا : میں اس دین کے بارے میں تم لوگوں سے سودا نہیں کروں گا جس میں نماز نہ ہو اور مجھے تمھاری حمایت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دین کا استحکام بنیادی طور پر نماز

---

[1] ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ آیت اور سورہ اسراء کی ۷۳ ویں آیت اس وقت نازل ہوئی ہے کہ امیہ بن خلف اورابوجہل کے علاوہ قریش کا ایک گروہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے کہا: آپ ہمارے خداؤں پرہماری طرح ہاتھ پھیروتا کہ ہم آپ کی دین کی طرف مائل ہوجائیں اس وقت پیغمبر ؐکے لئے قوم سے دوری سخت تھی آپ ؐمائل تھے کہ وہ اسلام قبول کریں.(المیزان ، موسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان ،ج ۱۵،ص ۱۷۷)

[2] بحار الانوار ،ج۲۱،ص۱۵۳

[3] بحار الانوار ،ج۲۱،ص۱۵۳

اور خدا سے رابطہ پر ہے اور میرے دین و رسالت کا اصلی مقصد، اصل پرستش الہی کو حاکمیت بخشنا ہے۔ بنیادی اصول او رمقاصد کے بارے میں تمام مواقع پر تحفظ کرنے کی ضرورت ثابت ہے، من جملہ ان میں معاشرے کی قیادت اور وسیع پیمانہ پر مدیریت ہے۔ رہبر کو اصول اور بنیادی مقاصد کے تحفظ کے بارے میں ثابت قدم او رجرات مند ہونا چاہئے اور نرم نہیں ہونا چاہئے، لیکن فرعی امور میں اگر ضرورت اقتضا کرے تو نرمی اور چشم پوشی سے کام لے سکتاہے، کیونکہ بعض اوقات اصول کا تحفظ اور بچاؤ کا تقاضا ہوتاہے کہ انسان فرعی امور میں نرمی دکھائے تا کہ اصول کو دھچکانہ پہنچے۔ پس معاشرے کے قائدین کو بھی کبھی سخت او رکبھی نرم ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے کہا کہ جس محور پر سخت پالیسی اپنا کر اس کا تحفظ کرنا چاہئے، وہ دین کے اصول اور بنیادی محور اور بلند الہی مقاصد ہیں کہ قابل گزشت اور چشم پوشی روا نہیں ہے۔

لیکن جزئی مسائل کے باب میں کبھی ممکن ہے چشم پوشی، کوتاہی اور خلاف ورزی کی جائے اور رہبر مصلحت کے پیش نظر کبھی چشم پوشی سے کام لے۔ جو کچھ بیان ہوا وہ اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ مدارات کو مداہنت سے مغالطہ نہ کریں اور ان دونوں کی سرحدوں کی تشخیص دیں۔ البتہ پسندیدہ مدارات اور مذموم مداہنت کے درمیان سرحد کی تشخیص بہت مشکل ہے۔ انسان کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھنا چاہئے کہ کہاں پر مدارات کرنا چاہئے اور کہاں پر مدارات نہیں کرنا چاہئے اور کہاں پر چشم پوشی مداہنت ہے۔ کہاں پر سازباز اور نرمی مداہنت کا مصداق ہے۔ مداہنت کو مدارات سے تشخیص دینے کی راہوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر چشم پوشی اور نرمی اصلی اور اہم مسائل کو بالائے طاق رکھنے کا سبب بنے تو مداہنت ہے۔

لیکن اگر انسان کے شخصی منافع خطرے میں پڑیں اور انسان اس لئے کہ بلند تر مقصد تک پہنچ جائے اپنے شخصی فائدہ سے چشم پوشی کرے اور اپنے دشمن سے محترمانہ برتاؤ کرے، تو اس نے مدارات کی ہے، البتہ اس پر توجہ رکھنی چاہئے بعض مشکوک مواقع ہیں، کہ جن کے پیش نظر مداہنت اور مدارات کے درمیان تشخیص دینے میں زیادہ دقت کی ضرورت ہے۔ ''یا اباذر؛ ان سَرَّکَ ان تکون اقوی الناس فتوکلّ علی اللہ، و ان سَرَّکَ ان تکون اکرم الناس فاتق اللہ، و ان سَرَّکَ ان تکون اغنی النّاس فکن بما فی ید اللہ عزوجل اوثق

منک بما فی یدیک''.اے ابوذر؛ اگر لوگوں میں توانا ترین بنناچاہتے ہو تو خدا پر توکل کرو اور لوگوں میں عزیزترین بننا چاہتے ہو تو تقوائے الہی کے مالک بن جاؤ اور مالدار ترین بننا چاہتے ہو تو جو کچھ خدا کے پاس ہے اس پر اپنے مال کی بہ نسبت زیادہ اطمینان رکھو''حدیث کے اس حصہ میں دوبارہ تقوی کی بحث آئی ہے چنانچہ ملاحظہ ہوتاہے کہ گزشتہ مطالب سے رابطہ منقطع نہیں ہوا ہے اگر چہ تقوی سے ہم آہنگ کچھ دوسرے مسائل بھی ذکر ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیان میں تین نکتوں کی طرف یاددہانی کی ہے:پہلا نکتہ یہ کہ اگر لوگوں میں قوی ترین بننا چاہتے ہو تا کہ بہتر طریقہ سے،اپنے مقاصد کو حاصل کرلو ضعیف نہ ہو کہ جلدی شکست نہ کھاؤ اور مقصد پہنچنے کی قدرت رکھو توخدا پر توکل کرو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر خدا کے نزدیک عزیز اور محترم ترین فرد قرار پاناچاہتے ہو،تو تقوی کو اپنا اصول بنالو،چنانچہ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتاہے:(...ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم[1])''تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر غنی اور بے نیاز ترین شخص بننا چاہتے ہو تو،جو کچھ خدا کے پاس ہے اس پر اپنے پاس موجود ہ مال کی بہ نسبت زیادہ اعتماد کرو۔ ہر شخص کسی حد تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے اور کچھ مال اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔

بعض اوقات اتنے پیسے اور مال رکھتا ہے کہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا اور پیسے حاصل کرنے کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتاہے۔ یا اس کے پاس کافی مقدار میں غذا اور روٹی ہے اور دوسروں سے غذا اور روٹی قرض لینے پر مجبور نہیں ہے،یہ بذات خود ایک قسم کی بے نیازی ہے۔ لیکن جان لینا چاہئے کہ ہم کس حد تک اپنے مال و ثروت کے بارے میں خوش فہمی میں رہ سکتے ہیں۔ انسان کے پیسے ممکن ہے کم ہوجائے یا ممکن ہے انسان کے مال کو چوراچک لے جائے اور ممکن ہے اس کی تمام نعمتیں نابود ہوجائیں اور انسان کو اس سے استفادہ کرنے کی فرصت نہ ۔ ممکن ہے ضرورت کے وقت انسان کو مال سے ہاتھ دھونا پڑے وہ اور اس سے استفادہ نہ کرسکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے سارے پیسے گم ہوجائیں،لیکن جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ کبھی گم ہونے

---

[1] حجرات/۱۳

والانہیں ہے اور خداکی نعمتیں کبھی خدا کے ہاتھ سے خارج نہیں ہوتی ہیں ممکن ہے کوئی مال ہمارے ہاتھ سے چلاجائے ، لیکن خدا کے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے یہ ممکن نہیں اور اس کی مالکیت سے کوئی چیز کم ہوجائے یہ تصور نہیں، اس لئے خدائے متعال کی تمام اشیاء اور موجودات کی مالکیت پر قدرت او رتسلط کے پیش نظر ،اور جو کچھ خدائے متعال ارادہ کرے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، حتی اگر کرہ مریخ پر کوئی چیز ہو او رخدائے متعال ارادہ کرے کہ وہ مجھ تک پہونچ جائے تو اس کے ارادہ میں تغییر و تخلف ممکن نہیں، ہمارا اعتقاد اپنے پاس موجودہ چیزوں سے زیادہ خداکے پاس موجودہ چیزوں پر ہونا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے ضرورت کے وقت اپنے پاس موجودہ مال سے استفادہ نہ کرسکیں یاوہ گم ہو جائے یا کوئی اور مصیبت اس پرآ پڑے اور ہمیں اس سے استفادہ کرنے سے محروم کردے ۔

اگر ہم معرفت کی اس منزل پرپہنچ جائیں کہ تمام ہستی اور تمام ظاہری اور باطنی طاقتوں کو خدا کے قبضہ میں دیکھیں اور یقین کریں کہ اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہے، تو ہم خدا کی تمام چیزوں پر مالکیت اور تسلط حتی انسان کی تدبیر پر اس کے تسلط سے آگاہ ہوجائیں اور خدا پر ہمارا اعتماد بڑھ جائے گا اور خدا کی قدرت پر اپنے پاس موجودہ قدرت سے زیادہ اعتماد پیدا کریں گے ۔ فطری بات ہے جو خدا کی قدرت پر اعتماد رکھتا ہے وہ غنی ترین فرد ہے، کیونکہ خدا کا ارادہ کبھی نہیں بدلتااور اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہوتی، جو شخص اپنے مال پر اعتماد کرتا ہے اور اس کے ساتھ دل وابستہ کرتاہے، چونکہ پیسے ہر وقت انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے لہذا ممکن ہے فائدہ اٹھانے سے پہلے ہی مال اس کے ہاتھ سے چلاجائے ۔

توکل کی عظمت و منزلت :چنانچہ معلوم ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدائے متعال پر توکل کو مومن کے لئے قدرت حاصل کرنے کا سرمایہ قرار دیتے ہیں ۔ توکل کے مقام کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کے رول، مختلف خطرات اور سختیوں سے روبرو ہونے اور اس سے غلط تصورات ایجاد کرنے کے پیش نظر ضروری ہے کہ توکل کے بارے میں ایک مختصر بحث کریں۔

توکل کا مادہ ''وکالة'' ہے اور اسلامی لغت میں اس کا معنی یہ ہے ہ انسان خدائے متعال کو اپنے لئے ایک مطمئن تکیہ گاہ قرار دے اور تمام امور اسی پر چھوڑ دے ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے توکل کے بارے میں سوال کیا ،جبرئیل نے جواب دیا ''؛العلم بان المخلوق لا یضرو لا ینفع و لا یعطی ولا یمنع و استعمال الیاس من الخلق فاذا کان العبد کذلک لم یعمل لاحد سوی اللہ و لم یرج و لم یخف سوی اللہ و لم یطمع فی احد سوی اللہ فھذا ھو التوکل[1]'' ''توکل اس امر کی آگاہی ہے کہ بندہ انسان کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے اور اسے کوئی چیز نہیں عطا کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے واپس نہیں لیتا ،اور توکل مخلوق سے مایوس ہونے کے معنی میں ہے ۔

پس جب بندہ معرفت کے اس مرحلہ تک پہونچ جاتا ہے ، وہ غیر خدا کے لئے کام نہیں کرتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتا ہے، اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف محوس نہیں کرتا یہ ہے خدا پر توکل کا معنی ہے''قرآن مجید میں توکل کے بارے میں فراوان آیتیں موجود ہیں، من جملہ خدائے متعال فرماتا ہے:(و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون[2]) ''اور ایمان والوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے ۔ ''(اس آیت میں خدائے متعال توکل اور بھروسہ کو ایما ن کا اٹوٹ اور لازمی جزبیان کرتاہے)جس طرح انسان عام طور پر دنیوی کاموں میں اپنے لئے وکیل منتخب کرتاہے اور اپنے بہت سے کام اس کے سپرد کرتاہے تا کہ واضح اور فائدہ بخش نتائج وآثار حاصل کرے، شائستہ ہے خدا کا بندہ بھی اپنے تمام امور میں خدائے متعال کو اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے،تا کہ اس کے مطالبات کسی تشویش کے بغیر حاصل ہوجائیں۔

دوسرے الفاظ میں جو اپنی حاجتوں کو برطرف کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے تین راہیں ہوتی ہیں: اپنی توانائی پر اعتماد کرے یا دوسروں پر اعتماد کرے اور اُن سے توقع رکھے یا پھر اپنے اعتماد کو خدائے متعال کی ذات پر قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور اس کے علاوہ ہر ایک سے چشم پوشی کرلے۔

---

[1] بحار الانوار ، ج ۷۱، ص ۱۳۸
[2] آل عمران/ ۱۲۲

اس میں انسان کا خدا پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا سرچشمہ خدا کی ربوبیت کے بارے میں اس کی معرفت ہے، کیونکہ اگر انسان خدائے متعال کومالک ، صاحب اختیار اور تمام موجودات پر تسلط رکھنے والے کی حیثیت سے پہچان لے تو پھر دوسروں کے پیچھے دوڑنے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی محوس نہیں کرے گا ۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے مالک سے ایک دعامیں فرماتے ہیں ''؛اللهم انک آنس الآنسین لأولیائک واحضرهم بالکفایه للمتوکلین تشاهد هم فی سرائرهم و تطلع علیهم فی ضمائرهم و تعلم مبلغ بصائرهم ''' 'خداوندا! تو اپنے دوستوں کے ساتھ دوسروں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور تجھ پر توان لوگوں کے امور کیاصلاح کے لئے جو تیری ذات پر بھروسہ کرتے ہیں خود ان سے زیادہ حاضر ہے (کیونکہ ہر چیز کے لئے قدرت رکھتاہے اور اپنے ارادے سے ہر کام کو انجام دیتا ہے) ان کے چھپے ہوئے اسرار کو جانتا ہے ان کی فکر سے آگاہ ہے ان کی بصیرت کی مقدار سے واقف ہے ''اسی کے ضمن میں فرماتے ہیں '':ان کے اسرار تیرے پاس آشکار ہیں اور ان کے دل تیرے دیدار کی حسرت میں داغ دار ہیں، اگر تنہائی ان پر وحشت ڈالتی ہے توتیری یادوں کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں اور جب مصیبتیں ان پر ٹوٹتی ہیں تیری بارگاہ کی طرف رخ کرتے ہیں ۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمام کاموں کا سرچشمہ تیرے ہاتھ میں ہے[1] ۔ ''

خدا پر بھروسہ کرنے کے نتائج کے بارے میں حضرت محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں '' :من توکل علی اللہ لایغلب و من اعتصم باللہ لایہزم[2]''' 'جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے وہ شکست نہیں کھاتا اور جو بھی خدا کے پاس پناہ لیتا ہے کبھی ناکام نہیں ہوتا ہے ۔ ''بہت سے انبیاء کی دعوتوں کے اجنڈے پریہ پیغام لکھا ہوا تھا کہ خدا پر ایمان لاؤ اور اس پر بھروسہ کرو، اس لئے ایمان کی نشانیوں میں سے ایک خداپر توکل کرنا ہے ۔

اگر انسان خدا کی ربوبیت پر اعتقاد رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ تمام کائنات اس کی حکومت او رربوبیت کے تسلط میں ہے اور تنہا شائستہ پرستش وہ معبود ہے، تو وہ ہرگز اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ دوسروں کے پیچھے جا کر کسی اور سے مدد

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۲۱۸، ص ۷۱۹
[2] بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۵۱

چاہے،بلکہ ہمیشہ خدا کی ذات پر بھروسہ کریگااور صرف اسی سے مدد کی درخواست کریگا ۔توکل او رمادی ومعنوی اسباب و عوامل سے استفادہ کرنا توکل ایک قلبی امر ہے، خارجی رفتار میں سے نہیں ہے، اس لئے توکل اسے نہیں کہتے کہ انسان کسی مسجد میں معتکف ہوجائے اور صرف خدا کی عبادت اور اس سے رازو نیاز میں مشغول رہے اور تمام کاروبار سے ہاتھ کھینچ لے، اس امید سے کہ خدائے متعال خود اس کا رزق فراہم کرے گا ۔ بیشک یہ تصور غلط ہے اور اس روش کا اختیار کرنے والا منحرف ہے اور توکل کے حقیقی معنی سے آگاہ نہیں ہے، چنانچہ ایک روایت میںآیا ہے ''،رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قوما لایزرعون، قال: من انتم؟ قالوا : نحن المتوکلون ۔ قال: بل انتم المتکلون[1]''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کھیتی باڑی نہیں کررہے تھے ۔ان سے کہا : تم کون ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا : ہم توکل کرنے والے ہیں ۔ آنحضرت نے فرمایا : نہیں، بلکہ تم لوگ دوسروں کے رحم و کرم ہو ۔ ''جی ہاں، جو معارف الٰہی کی صحیح پہچان نہیں رکھتے، وہ خیال کرتے ہیں کہ توکل یہ ہے کہ انسان مادی و سائل اور امکانات سے استفادہ نہ کرے اور اگر کسی نے مادی وسائل سے استفادہ کیا تو وہ توکل نہیں رکھتا ہے ۔ جبکہ نہ مادی وسائل کا سہارا لینے والا شخص توکل سے عاری ہے اور نہ ہروہ شخص جو ان وسائل سے استفادہ نہیں کرتا ہے وہ صاحب توکل ہے ۔

ایسے کاہل اور سست افراد بھی جوایک لقمہ روٹی کے انتظار میں رہتے ہیں تا کہ اسے کھاکر اسی پر قناعت کریں اور کام کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، جب ایسے لوگوں سے سوال کیا جاتاہے کہ تم لوگ کیوں کام نہیں کرتے اور محنت نہیں کرتے ہو؟ تو جواب میں کہتے ہیں: ہم خدا پر توکل کرتے ہیں یہ توجیہ ان کی کاہلی اور سستی پر ایک پردہ ہے ورنہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور خدا پر بھروسہ نہیں رکھتے ہیں،البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو حقیقتا صاحب توکل ہوتے ہیں، لیکن بہر صورت یہ تصور غلط ہے کہ توکل کے بہانہ سے عوامل واسباب سے استفادہ نہ کیا جائے ۔چنانچہ ہم نے کہا کہ توکل ایک قلبی امر ہے اور اس کا معنی خدا پر بھروسہ کرناہے کہ انسان اپنے دل میں خداپر بھروسہ کرے ۔ اس بناپر ممکن ہے انسان توکل کے عالی ترین مرحلہ تک پہنچ جائے او راسی حالت میں فریضہ انجام

[1] مستدرک الوسائل ج ۱۱ ، ۲۱۷

دینے اور حکم خدا پر عمل کرنے کے لئے مادی وسائل اور اسباب سے بھی استفادہ کرے ۔ ممکن ہے کوئی شخص دوسروں سے زیادہ محنت کرے یا اپنے کام میں دوسروں سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کرے لیکن پھر بھی اپنے کام پر اعتماد نہ رکھتا ہو اور صرف خدا پر بھروسہ کرتا ہو، چونکہ خدائے متعال بے کار اور سست انسان سے بیزار ہے او راس پر کام کرنا واجب قرار دیا ہے اسلئے یہ شخص کام کرتا ہے ، کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ دنیا کے امور و اسباب اوروسائل کے ذریعہ آگے بڑھیں؛بنیادی طور پر جو خدا کی معرفت رکھتا ہے، وہ شخص جانتا ہے کہ حکمت الٰہی کے مطابق جملہ امور اسباب کے ذریعہ واقع ہوتے ہیں ۔ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ ہر مظہر اپنے اسباب کے ذریعہ واقع ہو ۔

اس لحاظ سے خدائے متعال کا علم اور اس کی معرفت و حکمت اس کے مقتضائے حکمت کی شناخت نظام اسباب و علل پر برقرار ہے کا سبب ہے اور بالاخر، انسان کا تکامل اور اس کی ترقی اسی نظام سے وابستہ ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی آزمائش اور امتحان سے مواجہ ہوتا ہے ورنہ انسان تکامل و ترقی کی طرف نہیں بڑھتا ۔ انسان کے تکامل و ترقی کے لئے بندگی کے فرائض انجام دینا شرط ہے اور وہ انسان کے ارتباط پر منحصر ہے اور انسان کا ارتباط نظام اسباب و علل سے منسلک ہے ۔ پس اگر انسان آرام و آسائش کی راہ پر چلے او رتنہائی اختیار کرے اور عبادت میں مشغول ہوجائے اور اپنی روزمرہ زندگی میں کسب معاش ونیز سعی و کوششسے ہاتھ کھینچ لے تو اس نے حکمت الٰہی کے خلاف کام کیا ہے اور اس صورت میں خدا کی طرف سے روزی پہنچنے کی امید رکھنا بیہودہ ہوگا، بقول مولوی:

گر توکل می کنی در کار کن

کشت کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر تم توکل کرتے ہو چاہتے ہو تو کام کرو توکل کرو، کھیتی کرنے کے بعد خدا پر بھروسہ کرو) اس بنا پر حکمت الہی کا تقاضا ہے کہ انسان ضرورتوں کو پانے کے لئے اسباب و عوامل سے استفادہ کرے۔ اگر ایسا ہوتا کہ رزق کی درخواست کرکے خدا سے رزق فراہم ہوجاتا توکوئی عملی رزق کے لئے کوشش نہیں کرتااور انسانوں کی آزمائش نہیں ہوتی۔ اگر کہا جاتا ہے کہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے عوامل اور وسائل سے استفادہ کرنا چاہئے تو اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ تمھیں رارزق دینے والی زمین، کسب معاش اور دیگر اسباب ہیں، بلکہ یہ سب خدا کی طرف سے ہیں اور تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے، رزق بھی اسی سے ہے۔ عوامل و اسباب کے پیچھے جانا تم پر فرض ہے تاکہ دنیا کے نظام میں الہی مقاصد پورے ہوجائیں اور یہ مقاصد انسان کے تکامل و ترقی کے لئے ہیں۔

پس توکل اور بھروسہ کرنے والے کو کسب معاش و تلاش سے غفلت نہیں کرنی چاہئے، چنانچہ جو اہل توکل نہیں ہیں وہ ایسا ہی کرتے ہیں، ان دو گروہوں میں قلبی رابطہ کے بارے میں فرق یہ ہے کہ توکل کرنے والا خدا کے حکم کی اطاعت کی غرض اور خدا پر بھروسہ اور امید رکھ کر کوشش کرتا ہے، لیکن غیر موحد اور توکل نہ رکھنے والا انسان اپنی روزی کو اپنے کام، کاج اور کوشش دوسروں کے ہاتھ میں ڈھونڈ تا ہے۔ مومن خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتا ہے اور تمام اسباب ووسائل کو خدا کی طرف سے دیکھتا ہے اور اگر وہ تمام اسباب وسائل سے محروم ہو جائے تو بھی اس کی خدا پر امید میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا ہے ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدائے متعال جو بھی اپنے بندہ کے حق میں انجام دیتا ہے وہ حکمت کی بنیاد پر اور اس کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے اور خدائے متعال کسی بھی وقت اپنے بندے کو اس سے محروم نہیں کرتا کہ جس میں، اس کے لئے خیر ہو۔

پس ایک طرف سے دنیا کا نظام اسباب و علل کے نظام پر وجود میں آیا ہے اور اس نظام کی زنجیر میں انسان کو کام اور کوشش سے اپنے مطالبات کو حاصل کرنا چاہئے۔ دوسری طرف سے کسب معاش اور دوسروں سے اپنے مطالبات کو حاصل کرنا چاہئے۔ دوسری طرف کام، کاج اور ذریعہ معاش اور دوسروں سے روابط اس لئے ہے کہ انسان کے لئے امتحان و آزمائش کے مواقع فراہم ہوجائیں، چونکہ اگر انسان کی آزمائش نہ ہو اور اس سے امتحان نہ لیا جائے تو وہ تکامل وترقی کی طرف قدم نہیں بڑھائے گا۔ کام اور

انجام فریضہ اور کارکن و مالک کے درمیان رابطہ کی رعایت کی جانی چاہئے تا کہ ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کے سایہ او رسعی و کوشش کے نتیجہ میں تکامل وترقی مواقع فراہم ہوں۔ اس بناپر انسان کا فرض ہے کہ کام اور محنت کرے اور اسی حالت میں اعتقاد رکھے کہ روزی اسے خدا سے ملتی ہے اور اس کا بھروسہ اس پر ہونا چاہئے۔ توکل کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان کام نہ کرے بلکہ حقیقت توکل یہ ہے کہ انسان کا دل خدا کے ساتھ ہو اپنے رزق کو خدا کی طرف سے سمجھے ،نہ کام سے تو اس صورت میں وہ کامیاب ہوگا اور زندگی کے مشکل ترین مراحل میں بھی خطرات سے گزر کر مشکلات پر قابوپائے گا ۔ کیونکہ وہ خدائے متعال کی لافانی ذات پر بھروسہ کرتاہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت موسی علی نبینا و علیہ السلام بیمار ہوئے اور بنی اسرائیل ان کی عیادت کے لئے آئے او ران سے کہا : اگر فلاں جڑ ی بوٹی سے علاج کریں گے تو آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔

حضرت موسی علیہ السلام نے کہا : میں علاج نہیں کروں گا یہاں تک خدا مجھے شفا عنایت کرے! حضرت موسی علیہ السلام کی بیماری کی ایک مدت گزرگئی لیکن صحت یابی کی کوئی علامت ان میں ظاہر نہیں ہوئی۔ خداکی طرف سے انھیں وحی ہوئی: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے، تجھے میں تب تک شفا نہیں دوں گا جب تک آپ اس جڑی بوٹی سے اپنا معالجہ نہ کریں کہ جس کے بارے میں بنی اسرائیل نے تمھیں خبر دی تھی۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس دوا کو کھانے کے بعد شفا پائی،لیکن جوبات انھوں نے بنی اسرائیل سے کہی تھی اس سے خائف تھے۔ خطاب آگیا : اے موسیٰ!کیا تم اپنے توکل سے میری حکمت کو جھٹلانا چاہتے ہو؟ میرے سواکون ہے جس نے ان جڑی بوٹیوں میں یہ تاثیر رکھی ہے ۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زاہد شہر سے نکل کر ایک پہاڑکے دامن میں ساکن ہوا اور کہتا تھا : میں کسی سے درخواست نہیں کروں گا یہاں تک کہ خدائے متعال خود مجھے رزق پہنچائے! اسی حالت میں سات دن گزر گئے اور کہیں سے کوئی غذا اس تک نہیں پہنچا یہاں تک وہ قریب المرگ ہوگیا ۔ اس کے بعد اس نے عرض کی: پروردگارا! مجھے روزی عنایت کر یا میری جان لے لے تا کہ میں مطمئن ہوجاؤں !خطاب ہوا میرے عزت و جلال کی قسم ،تجھے تب تک رزق نہیں دوں گا،جب تک

معاشرے میں جاکر لوگوں کے ساتھ زندگی نہ گزاروگے ۔ زاہد نے پہاڑ سے اتر کر شہر کی راہ لی ۔ جب لوگوں میں پہنچا تو ایک شخص اس کے لئے پانی لا رہا تھا اور دوسرا کھانا ۔ اس وقت خدائے متعال نے اسے خطاب کر کے فرمایا : اے زاہد ! کیا تو اپنے زہد سے میری حکمت کو جھٹلانا چاہتا ہے ؟کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مجھے اپنے بندوں کو بندوں کے ہی ذریعہ سے روزی پہنچانا پسند ہے بجائے اس کے کہ انھیں بلا واسطہ اور بغیر سبب روزی پہنچاؤں[1]۔ رزق صرف مادی رزق اور شکم کے رزق تک محدود نہیں ہے ،بلکہ منافع اور معنوی نعمتیں من جملہ علم بھی رزق ہے اس لحاظ سے ممکن ہے کوئی کاہلی و سستی کی وجہ سے علم حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کے لئے نہ جائے ،وقت پر کلاس میں حاضر نہ ہو اور کہے کہ میں نے خدا پر توکل کیا ہے وہ خود مجھے علم عطا کرے گا اور معصومؑ کے اس بیان کو دستا ویز قرار دے کہ فرماتے ہیں ''لیس العلم با لتعلم انما ہو نور یقع فی قلب من یرید اللہ تبارک وتعالی ان یہدیہ'' ''علم پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا ہے ،بلکہ علم ایک ایسا نور ہے کہ جسے خدا ہدایت کرنا چاہے اس کے قلب میں اسے ڈال دیتا ہے ۔ ''جی ہاں علم خدا کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہے مرحمت کرتا ہے ،لیکن ہمارا بھی کوئی فرض ہے کہ سبق پڑھیں اور مطالعہ کریں اور علم حاصل کرنے میں سنجید گی کا مظاہرہ کریں اور تمام وسائل سے استفادہ کریں اور ایسا نہیں ہے کہ کوئی کوشش وجستجو ،محنت اور علم حاصل کرنے کی دشواریوں کے بغیر عالم بن جائے ،چنانچہ کام ،کوشش وجستجو اور محنت ورنج برداشت کئے بغیر دنیوی سرمایہ بھی حاصل نہیں کر سکتا ہے ۔

تمام وہ نعمتیں جن کا انسان طالب ہے ،خدائے متعال کے اختیار میں ہیں اور اسباب وسائل ان کو تعین کرنے والے نہیں ہیں ۔ بلکہ یہ ایسے اسباب ہیں کہ خدائے متعال نے ان کو نعمتوں تک پہنچنے کے لئے وسیلہ قرار دیا ہے ،اور چونکہ خدائے متعال انہی وسائل واسباب کے ذریعہ ہمیں اپنی مطلوبہ نعمتوں اور رزق تک پہنچا چاہتا ہے ،لہذا ہم پر فرض بنتا ہے کہ ان سے استفادہ کریں ،اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کسی کام اور کوشش کے بغیر جب ہم اسباب ووسائل سے کافی محروم ہو جائیں ،خدائے متعال بعض منافع اور نعمتوں کو اس طرح

[1] مہدی نراقی،جامع السعادات ،ج٣،ص٢٢٨ ۔٢٢٩،بحار الانوار،ج١،ص٢٢٥

ہمارے اختیار میں قرار دیتا ہے کہ ہم اس کا بالکل تصور نہیں کرتے تھے۔اس کے مقابلہ میں ممکن ہے کہ کام وکوشش اور وسائل سے استفادہ کرنے کے بعد بھی اپنے مقاصد تک نہ پہنچ پائیں اور ناکام رہیں، کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیں وسائل کے بارے میں خوش فہمی نہیں رکھنی چاہئے بلکہ انسان کو صرف خدا پر بھروسہ اور امید رکھنی چاہئے اور اس پر اعتماد رکھتے ہوئے وسائل واسباب سے استفادہ کرنا چاہئے اور انسان امید رکھے کہ خدائے متعال اس کا رزق اس تک پہنچائے گا۔مذکورہ مطالب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:اگر لوگوں میں توانا ترین بننا چاہتے ہو توخداپر بھروسہ کرو اور اپنے قلبی رابطہ کو اس کے ساتھ مستحکم کرو،تاکہ اس کے اعتماد اور ارتباط کے سایہ میں اطمینان خاطر حاصل کرو اور خدا کی قدرت لایزال پر بھروسہ کرو ،وہ ہر کام پر قادر ہے اور سختیوں اور مشکلات میں انسان کا بہترین یاور ومددگار ہے .وہ دشمن کے ساتھ جنگ میں انسان کے باذؤں کوقدرت بخشتا ہے اور دشمن کے بڑے لشکر کو مومن انسان کے لئے خزاں کے پتوں کی طرح گرا دیتا ہے۔

جی ہاں،اس اعتماد وارتباط کے پیش نظر یقین ہے کہ مولائے متقیان علی علیہ السلام،وہ انسان کامل جو خدا کی بندگی اورعبادت میں نیز رازونیاز کے دوران اس کی بارگاہ میں کانپتے تھے اور بیہوش ہوکر زمین پر گرپڑتے تھے اور خدا کے خوف سے بے تاب ہوجاتے تھے ۔ لیکن دشمن کے ساتھ مقابلہ میں آپ کی تیوریوں پر بل بھی نہیں آتے تھے اور خوف تو آپ کے قرب بھی نہیں آتا تھا اور دشمن آپؑ کے سامنے سے دم دباکر بھاگتے تھے اور آپؑ خدائے متعال اور اس کی بے نہایت قدرت سے الہام اخذ کرتے تھے اور قدرت کی طرف سے وہ پشت پناہی ہوتی تھی کہ ضعف و سستی کا تصور نہیں ہوتا تھا اور تمام چیزیں ان کے عزم و ارادہ سے انجام پاتی تھیں۔ جنگ جمل میں اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کے ہاتھ میں پرچم اسلام تھماتے ہوئے فرماتے ہیں'':تزول الجبال و لا تزل عضّ علی ناجذک اعر اللہ جمجمتک تدفی الارض قدمک ارم ببصرک اقصی القوم و غضّ بصرک و اعلم ان النصر من عند اللہ سبحانہ[1]'' ''پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں،لیکن تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا (تم کو میدان کارزار میں پہاڑوں سے زیادہ مستحکم اور قوی ہونا چاہئے) اپنے دانتوں

---

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۱۱، ص ۶۲

کو آپس میں دبا کے رکھنا اور اپنے سر کو خدا کے سپر د کردینا او ر اپنے قدم زمین میں میخ کی طرح نصب کردینا (میدان کارزار میں ثابت قدم رہنا اور دشمن سے خوف زدہ نہ ہونا) دشمن کی صف کے آخری حصہ پر نگاہ رکھنا او رجان لینا کامیابی خدائے متعال کی طرف سے ہے۔ ''اگر انسان خدا پر بھروسہ نہ رکھے تو اس کے باطن میں ہمیشہ اضطراب، پریشانی اور تذبذب ہوگا اور اس کی زندگی پریشانی اور اضطراب میں مبتلارہے گی اور اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ سچے اور اطمینان بخش پشت پناہی سے غافل ہے اور جھوٹے اور متزلزل پشت پناہی پر اعتماد کئے ہوئےہے۔ اس لئے توانائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

تقوی اور توکل کے درمیان رابطہ حدیث کو جاری رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''یا اباذر؛ لو ان الناس کلھم اخذوا بھذہ الایہ لکفتھم: (و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیء قدرا[1]) اے ابوذر! اگر سب لوگ اس آیہ مبارکہ پر عمل کرتے تو ان کے لئے کافی تھا: (اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال اسے بھی نہیں ہوتا ہے اور جو خدا پر بھروسہ کرے گا خدا اس کے لئے کافی ہے بیشک خدا اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے اس نے ہر شے کے لئے ایک مقدار معین کردی ہے) (آیہ مبارکہ میں تقوی اور توکل دونوں ذکر ہوئے ہیں اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں کے درمیان گہرا تعلق اور رابطہ ہے اور ممکن نہیں ہے یہ ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں ۔

شاید تقوی کا پہلے ذکر آنا اس لئے ہے کہ تقوی کا حاصل ہونا توکل تک پہنچنے کا مقدمہ ہے اور جب تک انسان متقی نہیں بنتا خدا پر توکل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ہے) بیشک تمام آسمانی اور زمینی امور خدائے متعال کے ہاتھ میں ہیں اور خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی قدرت وجود نہیں رکھتی ہے۔ یہ وہ ہے جو اپنے ارادہ سے کائنات کی تدبیر کرتا ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادہ اور رائے کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ پس ہمیں صرف اس پر اعتماد کرنا چاہئے اور نیازمندی کا ہاتھ اسی کی طرف پھیلانا چاہئیاور اپنے

---

[1] طلاق، ۲۔۳

اندر غیر خدا کی بے نیازی کو زندہ کرنا چاہئے۔ چونکہ خدائے متعال نے ہمیں دوسروں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے، اور ان کی نیکیوں کے مقابلہ میں شکریہ ادا کرنے کو کہا ہے، لہذا ہم فرضیۂ الٰہی کی بنیاد پر ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس تصور سے کہ کسی دوسری راہ سے کوئی چیز نہیں ملی، چاپلوسی اور خوشامد سے پرہیز کرنا چاہئے۔ جو خدائے متعال پر اعتماد و توکل رکھتا ہے وہ اپنے رزق کی امید خدا سے رکھتا ہے، اس لئے دوسروں کی چاپلوسی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ بلا وجہ کسی کے سامنے جھکے اور سر خم کرے تا کہ وہ اس کی مدد کریں۔ چاپلوسی اور کسی کے سامنے سر جھکانا انسان کی عزت نفس کے منافی ہے۔

جی ہاں! خدائے متعال او راولیائے دین نے ہمیں حکم دیا ہے کہ، بعض افراد، جن کا ہم پر بڑا حق ہے، جیسے ماں باپ اور اساتذہ کے سامنے خضوع و خشوع سے پیش آئیں۔ اور اسی طرح تاکید کی گئی ہے کہ سادات او رپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت کے سامنے تواضع او رخشوع سے پیش آئیں، کہ ان کا احترام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی نسبت کی وجہ او رخدا و رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کی غرض سے ہے، نہ دنیوی اور مادی طمع سے۔

خدائے متعال نے ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احترام کرنے اور ان کے سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ پیش آنے کے لئے اپنی عبادت و بندگی کے مرتبہ کے بعد ذکر فرمایاہے: (وقضی ربک الاتعبدواالاایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلا ھما فلاتقل لھااف ولاتنھرھماوقل لھما قولا کریماواخفض لھما جناح الذل من الرحمۃوقل رب ارحمھماکما ربیانی صغیرا)[1] ''اور تمھارے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوجائیں تو خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا او رانھیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرنا۔ اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا اوران کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ پروردگار ان دونوں پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے۔''

---

[1] اسراء، ۲۳۔۲۴

امام سجاد علیہ السلام استاد اور معلم کے حق کے بارے میں فرماتے ہیں'': حق سائسک بالعلم التعظیم لہ و التوقیر لمجلسہ و حسن الاستماع الیہ و الاقبال علیہ و ان لا ترفع علیہ صوتک و لا تجیب احدا یسالہ عن شی حتی یکون ہو الذی یجیب و لا تحدث فی مجلسہ احدا و لا تغتاب عندہ احدا ۔۔[1]'' ''جو تجھے علم سکھاتا ہے اور تیری روح کی پرورش کرتا ہے، اس کا حق یہ ہے کہ اس کہ تعظیم کرو اس کی مجلس کا احترام کرو اس کے بیانات کو اچھی طرح سے سنو، اس کی طرف متوجہ رہو اور اس کے سامنے بلند آواز سے بات نہ کرو اور اس کی مجلس میں کسی دوسرے کے ساتھ بات نہ کرو اور اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو۔ ''اگر کوئی دنیا اور مادیات کی لالچ میں کیسکے سامنے خضوع کرے تو اس نے چاپلوسی کی ہے اور اس کے کام کا باطن شرک ہے، وہ حقیقت میں خدا کو ناتواں سمجھتا ہے اس لئے دوسروں پر طمع کرتا ہے۔

جو خدا کو پہچانتا ہے اور خدا کے بارے میں اس کی معرفت مکمل ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا کے اس بیان کو کان لگاکے سنتا ہے کہ اس نے فرمایا ہے: (الیس اللہ بکاف عبدہ[2]) ''کیا خدائے متعال بندہ کے لئے کافی نہیں ہے؟'' تووہ دوسروں سے امید نہیں رکھے گا تا کہ ان کے سامنے جھکے۔ وہ صرف خدائے متعال پر توکل اور اعتماد کرتا ہے اور اسی حالت میں اپنے فریضہ پر بھی عمل کرتا ہے۔ اگر اس کا فریضہ کام کرنا ہے، تووہ کام کرتا ہے، اگر اس کا فریضہ سبق پڑھنا ہے تووہ سبق پڑھتا ہے اور اگر اس کا فریضہ راہ خدا میں جہاد کرنا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے اور نتیجہ کو خداوند متعال پر چھوڑتا ہے۔ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ بارہا فرماتے تھے'': ہمارا فرض ہے کہ ہم مبارزہ کریں، لیکن یہ کہ ہم کامیاب ہوں یا نہ ہویہ خدا پر ہے، جووہ چاہے اور مصلحت جانے وہی واقع ہوگا۔''

---

[1] بحار االانوار، ج ۲، ص ۴۲
[2] زمر، ۳۶

پندرھواں درس

تقدیرات الٰہی، سچّے اعتقاد اور صحیح خود باوری کا اثر

''یا اباذر؛ یقول اللہ جل ثناوہ و عزتی و جلالی لایوثر عبدی ہوای علی ہواہ الا جعلت غناہ فی نفسہ و ھومہ فی آخرتہ و ضمنت السمٰوات و الارض رزقہ و کففت علیہ ضیعتہ و کنت لہ من وراء تجارۃ کل تاجر. یا اباذر؛ لو ان ابن ادم فر من رزقہ کما یفرّ من الموت لأدرکہ رزقہ کما یدرکہ الموت''گزشتہ چند جلسوں میں بحث کا محور تقوی تھا اور بیان ہوا کہ اگر کوئی باتقوی ہوتو اسے اپنی رزق کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ خدائے متعال اس کے سامنے نجات کی راہیں کھولتا ہے جب اسے کوئی پیچیدہ مشکل درپیش ہوتی ہے اس کے لئے راہ نجات قرار دیتا ہے اور اس کے لئے رزق کو ایسی راہ سے پہنچاتا ہے جس کا اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ حقیقت میں جناب ابوذرؓ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی نصیحتوں کے گزشتہ حصہ میں، تقوی کے رزق کے ساتھ ربط کو پیش کیا گیا، چونکہ انسان حلال و پاک اور وسیع رزق کا طالب ہے، اب اگر اسے معلوم ہوجاتاہے کہ تقوی رزق کی وسعت کا سبب بنتاہے، تو اس میں تقوی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتاہے۔

حق کے سامنے تسلیم ہونا پریشانیوں کے برطرف ہونے کا سبب:یہ سوال پیدا ہوتاہے، کہ مومن کو اپنی روزی کے بارے میں کس قدر فکر مند رہنا چاہئے،کس قدر اسے اپنی زندگی کو وسعت اور آسودہ بنانے کی فکر میں ہونا چاہئے اور اس فکر میں ہو کہ اپنے رزق کو کیسے اور کس راہ سے حاصل کرے؟اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کچھ حاجتیں رکھتاہے کہ اگر وہ پوری نہ ہوں تو زندگی کو جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے. من جملہ ان چیزوں میں سے ایک روزی ہے جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے، فطری طور پر جو اپنی زندگی سے دلچسپی رکھتا ہے وہ اپنے رزق کی فکر میں بھی ہوتاہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا کہ، رزق صرف خوراک تک محدود نہیں ہے،بلکہ تمام مادی و معنوی نعمتیں جو خدائے متعال نے اس دنیا میں انسان کو عطا کی ہیں، سب

رزق شمار ہوتی ہیں: لباس،گھر،بیوی، استاد اور علم بھی رزق ہیں۔اس وسیع نظریہ کے مطابق جو ہم رزق کو تمام مادی ومعنوی نعمتوں پر مشتمل جانتے ہیں،اور اطمینان رکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے مجبور ہے، فطری بات ہے کہ ہر شخص کو اپنی رزق کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے، لیکن انسان کی فکراور پریشانی کی مقدار اس کی معرفت و ایمان کے مراتب پر منحصر ہے۔یعنی جس طرح انسان کا ایمان اور اس کی معرفت یکساں نہیں ہے، اس طرح ان کا فکرمند ہونا بھی ایک حد میں نہیں ہے، جس قدر انسان کا ایمان اس کی معرفت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی فکر اور پریشانیاں بھی کم ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض بزرگوں کی تعبیر کے مطابق بعض اولیاء خدا معرفت کی اس منزل تک پہنچے ہوئے ہیں کہ بالکل اپنی فکر میں نہیں ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات میں جو تسلیم کا مقام بیان ہوا ہے اسی مرتبہ پر وہ فائز ہیں، خدائے متعال فرماتا ہے: (فلاوربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثمّ لایجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما[1]) ''پس تمہارے پروردگار کی قسم یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلاف میں حکم نہ بنائیں اور پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہوجائیں''انسان تسلیم کی منزل میں ایک ایسے مرحلہ تک پہونچ جاتا ہے کہ مکمل طور پر خدا کے حضور میں تسلیم ہوجاتا ہے اور اپنے لئے کوئی چیز نہیں چاہتا ہے اور اپنی خواہشات کو فراموش کردیتا ہے اور صرف اس پر توجہ رکھتا ہے جو خدا کی مرضی ہو،اگر انسان اس مرتبہ تک پہونچ جائے، تو وہ پریشانیوں سے رہائی پاجاتا ہے۔

اور اس پر مسائل آسان ہوجاتے ہیں''اوحی اللہ تعالی الی داود: یا داود! ترید و ارید و انّما یکون ما ارید فان اسلمت لما ارید یکفیک ماترید وان لم تسلم بما ارید اتعبتک فیما ترید ثم لایکون الا ما ارید''[2]''خدائے متعال نے حضرت داؤد کو وحی کی: اے داؤد! تم ایک چیز چاہتے ہو اور ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ایک چیز چاہتا ہوں اور جو میں چاہتا ہوں وہ واقع ہوتا ہے، پس اگر میری چاہت کے مقابلہ میں تم تسلیم ہوجاؤ تو جو تم چاہو گے وہ تمہیں ملے گا اور اگر میری مرضی کے مقابلہ میں تسلیم نہ ہوتے ہو تو میں تمہیں تمہاری

[1] نساء/۶۵
[2] بحار الانوار ، ج ۸۲، ص ۳۶

چاہت کے بارے میں رنج سے دوچار کروں گا او راس کے بعد وہی واقع ہوگا جسے میں چاہتا ہوں''بعض لوگ مقام تسلیم کو مقام رضا سے بالاتر جانتے ہیں، کیونکہ وہ معتقد ہیں کہ مقام رضا میں انسان جو کچھ خدا انجام دیتا ہے، اسے اپنی خواہش کے مطابق پاتا ہے، اس بناپر اپنے مزاج پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن مقام تسلیم میں اپنے مزاج اور جو کچھ اس کے مخالف وموافق ہے سب کو خدا پر چھوڑ تا ہے اور اسے توکل کے مرتبہ سے بالاتر جانتا ہے، کیونکہ توکل امور زندگی میں خدا پر اعتماد کے معنی میں ہے، اور خدا کو اپنا وکیل بنانا ہے، اس بنا پر بندہ بھی اپنے آپ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن تسلیم کے مرتبہ میں اپنے سے متعلق امور سے ہاتھ کھینچتے ہوئے ہر چیز کو خدائے متعال کے سپرد کرتا ہے[۱]۔ خدائے متعال مومنوں کو مقام تسلیم کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: (یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السّلم کافۃ و لا تتّبعوا خطوات الشیطان انّہ لکم عدوّ مبین[۲]) ''ایمان والو!تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو کیوں کہ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے''

مرحوم علامہ طباطبائی اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں: کلمات ''تسلم''و ''اسلام''اور ''تسلیم''ایک معنی میں ہے۔ اور کلمہ ''کافۃ'' کلمہ ''جمیعا'' کے معنی میں تاکید پر دلالت کرتا ہے،اور چونکہ آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور وہ ''سلم'' میں داخل ہونے کے لئے مامور ہوئے ہیں،پس نتیجہ کے طور پر آیت میں حکمعاشرے کے تمام لوگوں او رفرد فرد سے مربوط ہے۔

لہذا فرد فرد پر بھی واجب ہے ا ور تمام لوگوں پر واجب ہے کہ دین خدا میں چون و چرا نہ کریں اور خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کے سامنے تسلیم ہوجائیں۔ اسی طرح چونکہ خطاب خاص کر مومنین سے ہوا ہے، اور جس ''سلم'' کے بارے میں مومنین کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے مقابلہ میں تسلیم ہوجائیں۔ پس جس ''سلم'' کے بارے میں ان کو دعوت ہوئی ہے وہ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کے حضور میں تسلیم ہوجائیں اور اپنے لئے قرین مصلحت اور مطلق العنان ہونے کے قائل نہ ہوں اور خدا اور اس کے رسولؐ نے جوراستہ بیان فرمایا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہ کریں۔ کوئی قوم ہلاک

[۱] جامع السعادت، ج ۳، ص ۲۱۱، ۲۱۲
[۲] بقرہ/۲۰۸

نہیں ہوئی ہے، مگر یہ کہ اس نے خدا کی راہ کو چھوڑدیا ہو اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی ہو اور ایسے راستہ کو اختیار کیا ہو کہ جس کے بارے میں خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں تھی[1]۔ جی ہاں! جو لوگ مقام تسلیم تک پہنچے ہیں، وہ اپنے لئے کوئی خواہش نہیں رکھتے اور ان کی مرضی خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ وہ اس فکر میں نہیں ہوتے کہ ان کی روزی کس طرح اور کس راستہ سے حاصل ہو۔ وہ اس فکر میں ہوتے ہیں کہ کسی طرح خدا کی بندگی کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ راضی ہوجائے۔ یقیناً یہ گروہ نجات اور سعادت تک پہونچنے والا ہے. امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں ''کل من تمسک بالعروۃ الوثقی فھو ناج''، ''جس نے خدائے متعال کی مضبوط رسی کو پکڑلیا اس نے نجات پائی''، جب معصوم سے سوال کیا گیا کہ خدا کہ مضبوط رسی کو پکڑنے کے کیا معنی ہے؟ تو فرمایا: وہ خدا کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے[2] اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ مقام تسلیم کا تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

ہم اس معنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیسے کہ انسان ایمان و معرفت کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ جاتاہے کہ اپنے آپ کو فراموش کردیتاہے اور صرف خدا کی مرضی پر نظر رکھتا ہے، لیکن اس مقام سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یقینی طور پر ہم جانتے ہیں کہ خدا کے خاص بندے اس مرحلہ یعنی مقام تسلیم و تفویض تک پہنچے ہیں۔

قضا و قدر پر ایک نظر: مقام تسلیم تک پہنچنے والوں کے علاوہ، کچھ لوگ اس سے ادنی درجہ پر فائز ہوئے ہیں کہ منجملہ ان میں وہ لوگ ہیں جو ''علم الیقین'' کے مرحلہ تک پہنچے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے حوادث ایک مستحکم نظام کے تحت ہیں کہ جو خدائے متعال کی طرف سے مقدر ہوئے ہیں، اور تقدیر کے علاوہ ، حتمی قضا کے مرحلہ تک بھی پہنچے ہیں۔ یعنی تقدیرات کے علاوہ کہ جو خدا کے توسط سے انجام پاتی ہیں ا ور قابل تغییر ہیں تمام امور قضائے قطعی کے مرحلہ تک بھی پہنچے ہوئے ہیں، کہ جن میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے. قضا حکم قطعی او رفیصلہ دینے کے معنی میں ہے اور قدر اندازہ اور حد کو تعیین کرنے کے معنی میں ہے۔ حوادثِ دنیا اس لحاظ سے کہ ان کا واقع ہونا علم و مشیت الہی میں قطعی ہے، قضائے الہی کا انجام پاناہے اور اس لحاظ سے کہ

---

[1] المیزان (دار الکتاب الاسلامیہ)ج ۲، ص ۱۰۳
[2] بحارالانوار، ج ۲، ۲۰۴

حدود ،اندازہ اور زمان ومکان کی موقعیت معین ہے تقدیر الہی مقدر ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات قضاو قدر کی واضح اور صحیح تفسیر نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بعض ابہامات پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ قضاو قدر جبر کے مساوی ہے۔ خلاصہ کے طور پر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جبر کا مسئلہ قضا وقدر سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ہے اور قضا و قدر پر اعتقاد اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان اپنے فرائض کو چھوڑدے اور خیال کرے کہ سب چیزیں پہلے سے ہی طے شدہ ہیں اور اس پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ قاعدہ علیت عمومی اور اسباب و مسببات کا نظام کائنات او رتمام وقائع و حوادث پر حکم فرماہے، اور ہر حادثہ نے، ضرورت، وجوب، قطعیت، وجود، شکل اور مکانی وزمانی خصوصیات اور اپنے وجود کی تمام خصوصیات کو اپنی علت سے حاصل کیا ہے اور من جملہ اسباب و علل میں، خود شخص کا ارادہ بھی ہے اور قضا و قدر اس وقت مستلزم جبر ہوگا، جب خود بشر اور اس کے ارادے کو اس میں دخیل نہ جانیں اور قضا و قدر کو بشر کی قدرت، طاقت اور ارادہ کا جانشین تصور کریں۔ حقیقت میں یعنی قضاو قدر الہی نظامِ سبب و مسبب کہ جو اس جہان میں جاری ہے اس کا سر چشمہ ارادہ اور علم الہی ہے اس کے علاوہ قضاء و قدر الہی کوئی چیز نہیں ہے البتہ انسان کا ارادہ وانتخاب بھی من جملہ اسباب و علل ہے۔ اس بنا پر قضاو قدر پر اعتماد انسان کی تکلیف سے منافات نہیں رکھتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیاگیا کہ شفا پانے کی غرض سے جن تعویذوں کا استفادہ کیا جاتاہے، کیا وہ قضا وقدر الہی کو روک سکتے ہیں؟ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا ''انھا من قدر اللہ[1]'' یہ خود قدر الہی ہیں (یعنی بیماریوں کو شفا بخشنے میں ان کا اثر بھی قضاو قدر الہی ہے) حضرت علی علیہ السلام ایک ٹیڑھی دیوار کے نیچے بیٹھے تھے، اس کے بعد وہاں سے اٹھ کرایک دوسری دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، حضرتؑ سے کہا گیا ''یا امیر المومنین اتفرّ من قضاء اللہ؟ فقال: افرمن قضاء اللہ الی قدر اللہ[2]'' اے امیر المومنین ! کیا آپ قضائے الہی سے فرار کرتے ہیں؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: قضائے الہی سے قدر الہی میں پناہ

[1] بحارا لانوار، ج ۵، ص ۸۷
[2] توحید صدوق(موسسة النشر الاسلامی) ص ۳۶۹

لیتاہوں۔''یعنی ایک قسم کی قضا و قدر سے دوسری قسم قضاو قدر میں پناہ لیتا ہوں: اگر میں بیٹھا رہوں اور میرے سر پر دیوار گرجائے تومجھے قضاو قدر الٰہی کی سزا ملے گی کیونکہ علل و اسباب کی روداد کے دوران اگر کوئی انسان ٹوٹی دیوار کے نیچے بیٹھے اور وہ دیوار اس کے سر پر گرے اور اسے صدمہ پہنچے تویہ خود قضا و قدر الٰہی ہے اور اگر خود اس سے دور ہوجائے، اس خطرہ سے محفوظ رہے تو یہ بھی قضاو قدر الٰہی ہے۔قابل توجہ مطلب یہ ہے کہ اسباب و علل، صرف اسباب مادی و عمومی سے مخصوص نہیں ہیں اور ان ظاہری اسباب ۔ جن کوہم جانتے ہیں۔ کے علاوہ معنوی اور غیر عادی اسباب بھی موجود ہیں۔ منجملہ ان کی دعا اس دنیا کے علل میں سے ایک ہے جو انسان کے مقدر میں موثر ہے۔ دوسرے الفاظ میں دعا قضا و قدر کی زنجیر کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے کہ کسی حادثہ کو رونما کرنے میں موثر ہوسکتے ہیں یا کسی قضا و قدر کو روک سکتے ہیں، اس لئے فرمایا گیا ہے'':الدعاء یرد القضاء و لو ابرم ابراما''دعا قضا کو لوٹادیتی ہے چاہے جس قدر بھی وہ قضا محکم ہو۔''

اس قسم کی احادیث نظام کلی عالم اور تمام علل و اسباب اعم از مادی و معنوی پر ناظر ہیں۔ ایسے موارد کی ناظر ہیں، کہ معنوی علل و اسباب، مادی علل و اسباب کو ماند کردیتے ہیں۔ جو انسان صرف مادی اور محسوس علل و اسباب کو دیکھتا ہے اور خیال کرتاہے کہ سبب انہی چیزوں تک محدود ہے اور وہ نہیں جانتا کہ ہزاروں دوسرے علل و اسباب بھی ممکن ہے اور قضا و قدر کے حکم کے ساتھ سرگرم ہیں اور جب وہ اسباب و علل درمیان میں ہوتے ہیں تو مادی اسباب و علل ماند پڑتے ہیں اور بے اثر ہوجاتے ہیں:(و اذا یریکموہم اذا لتقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینہم لیقضی اللہ امرا کان مفعولا و الی اللہ ترجع الامور[1]) ''اس وقت کو یاد کرو جب خدا دشمنوں سے مقابلہ کے دقت تمھاری نظروں میں دشمنوں کوکم دکھلا رہاتھا (تا کہ تمہارے دل مضبوط ہوجائیں) اور ان کی نظروں میں تمھیں کم کرکے دکھلارہا تھا تا کہ اس امر کا فیصلہ کردے اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے''۔ بعض لوگ معرفت و یقین کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ کائنات خدائے متعال کے توسط سے ایک دقیق اور حساب شدہ

[1] انفال/۴۴

نظام کی بنیاد پر چلتی ہے، اور ہر روداد و ہر حادثہ کا واقع ہونا قضا و قدر کی بنیاد پر ہے اور وہ جانتا ہے کہ تمام چیزیں منجملہ روزی خدائے متعال کے توسط سے مقدر ہوتی ہے اور جس چیز کو خداوند مقدر فرماتاہے انسان اس سے محروم نہیں ہے وہ واقع نہیں ہوتی ہے اور انسان اسے حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے کہا اس دقیق و حکیمانہ نظام پر اعتقاد رکھنا تکلیف کے منافی نہیں ہے۔ انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ جبر اور کاہلی میں مبتلا ہوئے بغیر قضا و قدر اور توحید افعالی پر اعتقاد رکھے اور گھر میں بیٹھ کر کہے کہ اب جبکہ ہر چیز خدا کی طرف سے مقدر ہے اور ہم سے کوئی کام انجام نہیں پاسکتاہے۔ قضاو قدر او ر توحید افعالی اور اس قسم کے مسائل پر اعتقاد، مادی و معنوی مسائل کے بارے میں کوشش و فعالیت اور فردی اجتماعی فرائض کوانجام دینے کی ضرورت کے ساتھ منافی نہیں ہے۔ بہر حال اگر کوئی معرفت کی اس حد تک پہنچ جائے تو اس کے لئے کسی قسم کا خدشہ نہیں ہوگا۔

یقین کی اہمیت اور اس کے مراتب: اب جبکہ مقام یقین کی بات آگئی تو مناسب ہے یقین کی تعریف اور اس کے مراتب کی طرف ایک سر سری اشارہ کیا جائے :یقین ایک ثابت و پائدار اور مطابق واقع اعتقاد ہے جو قابل زوال نہیں ہے اور انسان کے لئے آرام و سکون کا سرمایہ ہے. بیشک یقین معرفت اور ایک معمولی اعتماد سے برتر ہے اور شریف ترین اور بلند ترین انسانی فضیلت میں اس کا شمار ہے اور بہت کم لوگ میں جو اس مرحلہ تک پہونچ سکے ہیں اور یہ وہ عظیم سرمایہ ہے کہ جو بھی اسے حاصل کرلیتا ہے تو گویا اس نے ایک بڑی سعادت تک رسائی حاصل کرلی ہے۔

جو یقین کے مقام تک پہنچاہے وہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز پر توجہ نہیں کرتاہے وہ صرف خدائے متعال پر بھروسہ کرتاہے اور غیر خدا کو مؤثر نہیں جانتا حقیقت میں یقین کا مرحلہ مراحل اسلام، نیز ایمان و تقوی کے بعد حاصل ہوتاہے، چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں'': الایمان فوق الاسلام بدرجۃ و التقوی فوق الایمان بدرجۃ والیقین فوق التقوی بدرجۃ وما قسم فی الناس شیء اقل من الیقین[1]''،'' ایمان اسلام سے ایک درجہ برتر ہے اور تقوی ایمان سے ایک درجہ بر تر ہے اور یقین تقوی سے ایک درجہ برتر ہے

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۸۷

اور خدا کے بندوں میں یقین سے کم تر کوئی چیز تقسم نہیں ہوئی ہے''۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں''؛پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے،لوگوں کے ساتھ نماز صبح پڑھی،اس وقت مسجد میں آپؐ کی نظر ایک جوان پر پڑی جو اونگھ رہا تھا او راس کا سر نیچے گر رہا تھا۔اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑا تھا،اس کا جسم لاغر ہوچکا تھا اور اس کی آنکھیں گہرائی میں چلی گئی تھیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:اے جوان!تم نے کیسے صبح کی؟عرض کی:اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ)یقین کے ساتھ!پیغمبر اسلامؐ نے اس کی بات سن کر تعجب کیا اور فرمایا:ہر یقین کی ایک حقیقت ہے،تمھارے یقین کی حقیقت کیا ہے؟

اس نے عرض کیا:یا رسول اللہ:میرے یقین کی حقیقت نے مجھے غمگین کردیا ہے۔راتوں کو مجھے (عبادت کے لئے) بیدار رکھا ہے اور دن کو پیاسا (روزہ دار) رہنے پر مجبور کیا ہے،ظاہری زندگی سے بے رغبت ہوچکا ہوں۔گویا دیکھ رہا ہوں کہ عرش الہی حساب و کتاب کے لئے آمادہ ہے او رلوگ محشور ہورہے ہیں اور میں بھی ان میں موجود ہوں۔گویا اہل بہشت کو دیکھ رہا ہوں کہ بہشت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہورہے ہیں،ایک دوسرے سے سرگرم او رتختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔گویا اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں کہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور فریاد بلند کرتے ہوئے مدد چاہتے ہیں.گویا اس جہنم کی وحشتناک آواز کو سن رہا ہوں جو اس وقت میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:یہ وہ بندہ ہے جس کے دل کو خدائے متعال نے ایمان سے منور فرمایاہے۔ اس کے بعد اس جوان سے کہا:یہ جو حالت رکھتے ہو اس پر پائدار رہنا او راسے کھونہ دینا۔اس کے بعد اس جوان نے کہا:اے اللہ کے رسولؐ،خدا سے میرے لئے دعا فرمائیں کہ اس کی راہ او رآپ کی رکاب میں مجھے شہادت نصیب ہو۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے دعا کی اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے ساتھ ایک جنگ میں شرکت کرنے کیلئے باہر گیا اور نو افراد کے بعد شہید ہوگیا، وہ دسواں شہید تھا[1]۔ یقین کے تین مراحل ہیں:

۱۔ علم الیقین

۲۔ عین الیقین

۳۔ حق الیقین

قرآن مجید میں مذکورہ تینوں مراحل کا واضح طور پر ذکر آیا ہے: (کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم ثم لترونہا عین لیقین"[2]) "دیکھو اگر تمہیں یقینی علم ہوجاتا ، تم جہنم کو ضرور دیکھتے پھر اسے اپنی چشم بصیرت اور نگاہ یقین سے دیکھتے" (ان ہذا لھو حق الیقین[3]) یہ (جہنم کا وعدہ) البتہ یقینی اور حقیقت ہے۔ ۱۔ علم الیقین: سے مراد پائدار اعتقاد اور واقع کے مطابق یقین ہے، جو لازم و ملزوم کے استدلال کی راہ سے حاصل ہوتا ہے، جیسے دھویں کا مشاہدہ کرکے آگ کے وجود کا یقین[4]۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (سنریہم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبیّن لہم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علی کل شیء شہید[5]) "ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے نفس کے اندر دکھلائیں گے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہوجائے کہ وہ بر حق ہے اور کیا پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔" اس آیت میں آفاقی و انفسی آیات کے ذریعہ خدا کے وجود پر استدلال ہوا ہے۔

۲۔ عین الیقین: مراد یہ ہے وہ اعتقادات جو مطلوب کودیکھنے اور چشم بصیرت سے حاصل ہوتے ہیں ۔ یہ دیکھنا، روشنی اوراجالے میں ظاہری آنکھوں سے دیکھنے سے زیادہ قوی ہے[6]۔ یقین کے اس مرحلے کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے توحید صدوق میں آیا

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۸۹
[2] تکاثر /۵-۷
[3] واقعہ/۹۵
[4] جامع السعادت، ج ۱، ص ۱۲۳
[5] فصّلت/ ۵۳
[6] جامع السعادت ، ج۱، ص ۱۲۴

ہے'' :جاء حبر الی امیر المؤمنین علیہ السلام فقال: یا امیر المؤمنین ہل رایت ربک حین عبدتہ؟ فقال: ویلک، ما کنت اعبد ربا لم ارہ. قال: و کیف رایتہ؟ قال: ویلک لاتدرکہ العیون فی مشاہدۃ الابصار و لکن رأتہ القلوب بحقائق الایمان[1] ''اہل کتاب کا ایک دانشمند امیرالمومنین کے پاس آیا اور کہا: اے امیرالمومنین! کیا عبادت کے دوران آپ نے اپنے پرودگار کو دیکھا ہے؟ علی علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: افسوس ہو تم پر، میں اس پروردگار کی عبادت نہیں کرتا ہوں جسے میں نے نہ دیکھا ہو۔ اس نے کہا: خدا کو کیسے دیکھا؟ جواب میں فرمایا: افسوس ہو تم پر، آنکھیں اپنے مشاہدہ میں اسے درک نہیں کرتی ہیں (خدائے متعال ظاہری آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا) بلکہ (چشم بصیرت اور) ایمان حقیقی اور راسخ دل نے اس کو دیکھا ہے''۔

۳۔ حق الیقین: وہ اعتقاد راسخ ہے جو خود شی کو پانے اس کے ساتھ حقیقی رابطہ پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اس طرح کہ صاحب یقین اپنی چشم بصیرت سے نور کے فیوضات کو اس کی طرف سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس مرحلہ کا نتیجہ فنا فی اللہ اور اس کے عشق و محبت میں محو ہونا ہے، ایسے کہ اپنے لئے کسی استقلال اور اہمیت کا قائل نہیں ہوتا یہ مرحلہ آگ میں کودکر جلنے کے مانند۔ حدیث قدسی میں آیا ہے... '' :و ما یتقرب الیّ عبد من عبادی بشیء احبّ الیّ مما افترضت علیہ و انّہ لیتقرب الیّ بالنا فلۃ حتی احبہ فاذا احببتہ کنت اذا سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ و لسانہ الذّی ینطق بہ و یدہ الذی یبطش بھا'' ''میرا بندہ واجب کی ہوئی چیز سے محبوب تر کسی چیز سے مجھ سے نزدیک نہیں ہوتا ہے اور نافلہ کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے تاکہ اسے دوست رکھوں۔

جب میں اسے دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کی زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے'' امام سجاد علیہ السلام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں'' :اللھم انّی اسئلک ایمانا تباشر بہ قلبی و یقیناً صادقا حتیّ اعلم انہ لن یصیبنی الا ما کتبت و رضّنی من العیش بما قسمت لی یا ارحم الرّاحمین۔ '' ''خدایا! تجھ سے اسے ایمان کی درخواست کرتا ہوں جس سے میرا دل وابستہ ہو

[1] توحید صدوق(موسسہ النشر الاسلامی) ص ۱۰۹

(یعنی باطنی اور قلبی ایمان نہ ایمان سطحی و زبانی) اور مجھے ایسے اعتقاد پر ثابت قدم رکھ تاکہ سچا یقین پیدا کرسکوں اور مجھے اس کے سوا کچھ نہ ملے جسے تم نے میرے لئے مقدر کر رکھا ہے اور مجھے اس پر راضی اور خوشحال بنانا جو تونے مجھے عطا کیا ہے (وہی زندگی جو مجھے عنایت کی ہے) اے رحم کرنے والوں میں سب سے رحم کرنے والے۔''امام علیہ السلام خدائے متعال سے ایک واقعی اور پائدار ایمان کی درخواست کرتے ہیں جو یقین کے مرحلہ تک پہنچا ہو اور حقیقت میں ایمان کے آخری مرحلہ کی درخواست کرتے ہیں، چونکہ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''ویقیناً صادقا...'' جس یقین صادق کو امامؑ خدا سے چاہتے ہیں وہ اہم ترین عنایت و نعمت الٰہی ہے، جو یقین صادق اور حق الیقین کے نتیجے میں انسان کو ایک ایسا قلبی اعتقاد حاصل ہوتا ہے کہ پروردگار عالم کی قدرت کے علاوہ کسی طاقت کو کائنات پر حاکم نہیں جانتا ہے اور وہ تمام امور کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کے حضور میں دیکھتا ہے اور وہ اس بات کی طرف متوجہ ہے کہ کوئی ناشائستہ کردار اس سے سرزد نہ وہ اور خدا کی مرضی کے خلاف کوئی عمل انجام نہ پائے۔

روایتوں میں یقین کا مرتبہ انسان کے لئے خدا کی ایک بڑی نعمت ذکر ہوئی ہے اور جیسا کہ پہلے نقل ہوا کہ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے'': انسان کے درمیان یقین سے کم تر کوئی چیز تقسیم نہیں ہوئی ہے، یعنی بہت کم ہیں ایسے لوگ ہیں جو یقین کے مرحلہ تک پہنچے ہیں۔''حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں'': لا یجد عبد طعم الایمان حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطئہ و ان ما اخطاہ لم یکن لیصیبہ و ان الضّار النافع ہو اللہ عزّوجل''۔[1] ''کوئی بھی بندہ ایمان کے مزہ کو نہیں چکھتا ہے یہاں تک جان لے کہ جو کچھ اسے ملا ہے، وہ اس سے دور نہیں ہوگا اور جو کچھ اس سے دور ہوا ہے وہ اسے نہیں ملے گا اور یہ کہ نفع اور نقصان پہنچانے والا تنہا خدائے متعال ہے''اگر انسان یقین و معرفت کی اس بلند مرحلہ تک پہنچ جائے کہ یقین کرے کہ ہر مصیبت و مشکلات اور ہر خیر جو اسے ملا ہے، ممکن نہیں تھا کہ اسے نہ ملے اور جو کچھ اسے نہیں ملا ہے، وہ ملنے والا نہیں تھا، تو وہ اپنے اندر ایک خاص آرام و سکون کا احساس کرتا ہے اور ایمان

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۹۷

کی حلاوت پاتاہے۔ اور جو معرفت کی اس حد تک پہنچ جائے، اگر چہ وہ مادی و معنوی لذتوں کا خواہشمند ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک حساب و کتاب ہے اور ایک خاص نظام کی بنیاد پر اسے ملتی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جو بھی چاہے اسے ملے گا اور جو نہ چاہے اس سے روک دیا جائے گا ۔ بہت سے چیزیں جنھیں انسان نہیں چاہتا ہے، وہ خدا کی مصلحت کی بنیاد پر اس کے لئے مقدر ہوتی ہے اور اس کے بر عکس بھی ممکن ہے ایسے چیزیں جنھیں ہم چاہتے ہیں، لیکن مصلحت الٰہی کا تقاضا نہیں ہے کہ وہ چیزیں ہمیں ملیں، لہذا جتنی بھی جستجو کریں ہم ان تک نہیں پہنچتے۔

اولیائے الٰہی اور تقدیرات الٰہی پر رضا مندی:یقین کی منزل تک پہنچنے کے بعد انسان اپنی خواہشات او رمطالبات کو نظر انداز کرتاہے اور خدا کی مرضی پر امید رکھتا ہے اور اس کے بعد اپنے وقت کو حاصل نہ ہونے والی آرزوؤں اور خواہشات کے بارے میں سوچنے پر صرف نہیں کرتاہے اور صرف اپنے فرائض اور تکالیف انجام دینے کا عزم و ارادہ کرتاہے۔ وہ اس فکر میں ہوتاہے کہ خدائے متعال اس سے کیا چاہتاہے او رجو کچھ اس کے لئے مقدر (تقدیر میں) ہے اسی پر راضی ہوتاہے۔ اہل یقین اس کے علاوہ کہ وہ جانتے ہیں جوان کے مقدر میں ہے وہ انھیں ملے گا، یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے لئے خیر مقدرات الٰہی میں ہے ۔ یعنی احسن نظام کے بارے میں آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ جو کچھ خدائے متعال نے مقدر فرمایاہے وہ ان کے لئے بہترین ہے، اور خدا کی طرف سے مقدر ہوئی چیز، نظام کلی عالم کا ایک جز ہے اور وہ بہترین نظام ہے اور ایک خاص اسباب و شرائط او رخاص زمان و مکان کے پیش نظر جو کچھ ہوا ہے اس سے بہتر انجام پانا ممکن نہیں ہے ۔

جی ہاں! جو معرفت کی اس حد تک پہونچا ہے کہ وہ یقین رکھتے ہیں جو بھی خدا چاہے گا وہ انھیں ملے گا، وہ اپر خوش ہوتے ہیں اور فکر مند نہیں ہوتے: انھیں اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھلے دل سے اس کا استقبال کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی خیر اسی میں ہے جو رونما ہواہے، یہ مقام رضاہے۔ مقام رضا کے مالک وہ ہوتے ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام تقدیرات الٰہی بندوں کے فائدہ میں ہے، اس سلسلہ میں فراوان حدیثیں پائی جاتی ہیں من جملہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں'': عجب للمرء

المسلم لا یقضی اللہ عزّوجل لہ قضاء الّا کان خیرا لہ و ان قرض بالمقاریض کان خیرا لہ و ان ملک مشارق الارض و مغاربھا کان خیرا لہ[1]"؛ "میں تعجب میں ہوں اس مسلمان کے بارے میں کہ خدائے متعال اس کے لئے اس کے سواء کوئی سرنوشت و تقدیر معین نہ کرے مگر یہ کہ اس میں اس کے لئے خیر ہو،اگر اس کے بدن کے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کردے تو بھی اس میں اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے تمام مشرق و مغرب کی زمینوں کا مالک بنادے تو بھی اس میں خیر ہے" امامؑ فرماتے ہیں کہ تمام تقدیرات جو خدانے مومن کے لئے معین کی ہیں وہ خیر ہیں، خواہ وہ ظاہر میں پسندیدہ ہوں یا نا پسندیدہ ۔ ناپسندیدہ حوادث جو پیش آتے ہیں وہ یا تو اس کی صلاح کے لئے یا اخروی صلاح کے لئے ۔

جو بھی اس قسم کی معرفت پیدا کرے کہ جو پیش آئے اس سے خوش اور اسی پر راضی رہے ،بندگی کے مقام پر کوتاہی نہ کرے، اپنے فریضہ کو انجام دے، تو اس کو یہ فکر و پریشانی نہیں ہوتی کہ اس کا رزق کم ہے یا زیادہ یا یہ کہ کیا پیش آنے والا ہے، اس پر خائف نہیں ہوتا ہے ، اس نے اپنے کام کو خدا کے سپرد کردیا ہے اور خود عبادت و بندگی میں مصروف ہے اور تہہ دل سے جانتا ہے جو بھی پیش آتا ہے اسی میں خیر و بھلائی ہے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے ۔ وہ تمام حوادث اور رودادوں پر خوش فہمی سے نظر ڈالتا ہے اور مصیبتوں او رمشکلات پر راضی ہوتا ہے ۔ اگر جیل میں ڈال دیا جائے تو شکوہ نہیں کرتا، روایت کی تعبیر کے مطابق اگر اس کے بدن کے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں، تو ہی خوش ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی خیر کو اسی میں دیکھتا ہے ۔

ہم نے انقلاب اور جنگ کے دوران ایسے افراد کو دیکھا ہے جو کچھ انھیں پیش آتا تھا اس کا کھلے دل سے استقبال کرتے تھے ۔ محاذ جنگ پر ایسی مائیں ، باپ ، بھائی، بہنیں اور شہید کی بیوی بچے ہوتے تھے کہ ان کے عزیزوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے بدن یا جلے ہوئے جنازے ان کے پاس لائے جاتے تھے، لیکن و ہ ہنسی خوشی او رفخر کے ساتھ اس روداد پر خدا کا شکر بجالاتے تھے! تقدیرات الٰہی پر راضی ہونے او رپیش آنے والی مصیبتوں پر خوش ہونے کے بارے میں کہنا آسان ہے، لیکن میدان عمل میں

[1] اصول کافی ، ج ۳، ص۱۰۲

اترنا بہت مشکل ہے۔ اس معنی کو درک کرنا بہت دشوار ہے، کیسبعض خدا کے بندے ایسے بلند مقام تک پہنچتے ہیں کہ رونما ہونے والے حوادث کے بارے میں انھیں کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے، ان کے لئے کوئی فرق نہیں ہے کہ کل کیا پیش آنے والا ہے، ان کا رزق ملے گا یا نہیں۔ اگر ان کا کوئی عزیز محاذ جنگ پر گیا ہے تو انھیں اس کے قتل ہونے کی کوئی فکر و پریشانی نہیں ہے یا اگر خود فداکاروں کے ہمراہ محاذ جنگ کا رخ کیا ہے، تو اسے گھربار کی کوئی فکر نہیں ہے، کیونکہ جس نے اپنے جان اور پوری ہستی کو اخلاص کی ہتھیلی پر رکھا ہے، شہادت کے لئے آمادہ ہے، تو وہ گھر بار کی فکر میں نہیں ہو سکتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر جمالِ یار کے متوالے زندہ بچ کر صحیح و سالم اپنے گھر واپس لوٹتے، اور ان بلند معنوی جذبات اور خصوصیات کو حفظ کرکے قضائے الٰہی اور تسلیم کے بارے میں لوگوں کو ہمیشہ فداکاری و رضامندی کا سبق دیتے اور ان کی زبان پر یہ ہوتا:

گر درد دہد بہ ما و گر راحت دوست

از دوست ہر آنچہ آید نیکوست

ما را نبود نظر بہ نیکی و بدی

مقصود رضا و خوشنودی اوست

(مجھے دوست کی طرف سے درد ملے یا آرام و سکون، دوست کی طرف سے جو بھی ملے اچھائی ہے۔ ہمیں نیکی و بدی سے سروکار نہیں ہے، بلکہ ہمارا مقصود اس (خدا) کی رضا و خوشنودی ہے) مرحوم ملا مہدی نراقی فرماتے ہیں: قضائے الٰہی پر راضی ہونا دین کے بلند ترین مقامات اور مقربین کے شریف ترین منازل میں سے ہے اور یہ پروردگار کا عظیم دروازہ ہے۔ جو اس دروازہ سے داخل ہوجائے، بہشت میں وارد ہوتا ہے۔ مقام رضا کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبرؐ سے نقل کی گئی ایک روایت میں آیا ہے کہ قیامت کے دن خدائے متعال میری امت میں سے ایک گروہ کو ایسے بال و پر عطا کرے گا جن کے ذریعہ وہ اپنی قبروں

سے بہشت کی طرف پرواز کریں گے اور من پسند بہشت کی نعمتوں سے استفادہ کریں گے۔ ملائکہ ان سے سوال کریں گے: کیا تم نے حساب لینے کی موقف کو دیکھا؟ وہ کہیں گے: ہم سے کوئی حساب نہیں مانگا گیا۔ ان سے پوچھیں گے: کیا تم لوگوں نے پل صراط کو عبور کیا؟ جواب میں کہیں گے: ہم نے کوئی پل صراط نہیں دیکھا۔ پوچھیں گے: کیا جہنم کو دیکھا؟ کہیں گے: ہم نے کسی جہنم کو نہیں دیکھا۔ ملائکہ ان سے سوال کریں گے: تم لوگ کس کی امت سے ہو؟

جواب دیں گے: ہم امتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہیں۔ملائکہ انھیں قسم دلاکے پوچھیں گے: تم لوگ دنیا میں کیا کرتے تھے اور کس طرح کا عقیدہ و تصور رکھتے تھے؟ کہیں گے: ہم میں دو خصلتیں تھیں او رخدائے متعال نے ہمیں انہی دو خصلتوں کی وجہ سے اپنی ان رحمتوں سے نوازا ہے اور نتیجہ میں اس مقام پر پہنچایا ہے ''کنّا اذا خلونا نستحیی ان نعصیه و نرضی بالیسیر مما قسّم لنا[1]'' پہلی خصلت یہ کہ ہم خلوت میں ہونے کے باوجود بھی معصیت انجام دینے میں خدا سے شرم و حیا محسوس کرتے تھے۔ دوسری یہ کہ ہم اس پر راضی تھے جو خدا نے ہمارے مقدر میں رکھا تھا[2]۔

خدائے متعال مقام رضا پرپہنچے ہوئے افراد کے بارے میں فرماتا ہے: (یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة[3]) یہ آیۂ شریفہ مقام رضا واطمینان کو بیان کرتی ہے جو انسان سے ہر قسم کے اضطراب پریشانی اور تشویش کے دور ہونے کا سبب ہے۔اس مقام کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان راضی بھی ہے مرضی بھی یہ معنی دوسری آیت میں یوں بیان ہوا ہے: (رضی اللہ عنهم ورضوا عنه[4]) ''پروردگار ان سے راضی ہے اور وہ بھی پروردگار سے راضی ہیں'' کلمہ ((راضیة))اور((مرضیہ کے بارے میں علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ اس آیہ مبارکہ کے ضمن میں فرماتے ہیں'': اگر خدائے متعال نے نفس مطمئنہ کو ''راضیہ'' و ''مرضیہ'' سے توصیف فرمایاہے وہ اس لئے ہے کہ پروردگار سے دل کے اطمینان و سکون حاصل کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان خدا سے راضی

[1] بحارلانوار،ج۱۰۳،ص۲۵
[2] جامع السعادات ،ج۳،ص۲۰۲
[3] فجر/۲۷۔۲۸
[4] مائدہ/۱۱۹

ہو اور جو بھی قضا و قدر اس کے لئے مقدر فرمائے، اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرے، خواہ وہ قضا و قدر تکوینی ہو یا تکلیفی کہ جسے خدانے شرعی حیثیت دی ہو۔ پس کوئی بھی غضب و غصہ پیدا کرنے والا حادثہ اسے خشمگین نہیں کرتاہے اور کوئی گناہ اس کا دل کو منحرف نہیں کرتاہے او رجب بندہ خدائے متعال سے راضی ہوگیا تو قہری طور پر خدائے متعال بھی اس سے راضی ہو گا، چونکہ بندہ کا خدا کی بندگی کی حالت سے خارج ہونے کے علاوہ کوئی اور عامل اسے غضبناک نہیں کرتاہے اور جب خدا کا بندہ عبودیت کی راہ میں قدم رکھتا ہے تو خدا کی رضامندی کا حقدار بن جاتاہے۔

لہذا خدائے متعال نے کلمہ ''راضیہ'' و ''مرضیہ'' کو استعمال کیاہے''لہذا انسان کے لئے مکمل اطمینان و آرام اس وقت حاصل ہوتاہے جب وہ خدائے متعال سے راضی ہوتاہے۔ دوسرے سے راضی ہونا اس معنی میں ہے کہ انسان اس کی صفات و افعال کو پسند کرتاہے اور شخص موحد کو جب معلوم ہوتاہے کہ اس کائنات کے تمام امور تدبیر الٰہی کے تحت ہیں اور جب وہ مقام رضا تک پہونچ جاتاہے، تووہ کسی بھی حادثہ و روداد سے پریشان نہیں ہوتاہے، کیونکہ وہ اس حادثہ کو خدائے متعال کی طرف سے دیکھتا ہے اور اس کے ارتباط کو ذات حق سے درک کرتاہے۔

وہ جانتا ہے کہ خدا کے اذن، ارادہ او رمشیت کے بغیر کوئی حادثہ رونما نہیں ہو سکتا اور ناراض نہ ہونے کے علاوہ، اس کے پیش نظر کہ وہ حادثہ خدا کی مرضی کی بنیاد پر رونما ہواہے، اس سے خوش ہوتاہے۔ حقیقت میں مقام رضا مقام صبر سے بالاتر ہے، چونکہ صبر ناراضگی سے بھی سازگار ہے؛ انسان دانت پیس کر صبر کرتاہے، کیونکہ وہ حادثہ اس کے لئے تلخ ہے۔ لیکن جو شخص مقام رضا تک پہنچا ہے، وہ سختی اور دشواری کو درک نہیں کرتاہے تا کہ اس پر صبر کرے، بلکہ تمام چیزیں اس کے لئے شیریں ہوتی ہیں، جو بھی پیش آئے اسے پسند ہے پریشانی کی اس کے لئے کوئی بات نہیں ہے۔ یقیناً اس مقام کے بارے میں تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، چہ جائے کہ ہم اس مقام کو حاصل کریں کیسے ممکن ہے ایک انسان اپنی صحت و سلامتی سے بھی راضی ہو اور بیماری سے بھی راضی ہو! اگر دولت مند ہے تو اپنی دولت سے بھی راضی ہے اور اگر فقیر ہو جائے تو اپنی فقیری سے بھی راضی ہے! اس سے بڑھکر یہ کہ، جو

افراد مقام رضا تک پہنچے ہیں، انھوں حالت نفسانی، (فطرت)اور رضایت نفسانی یعنی وہ اعمال کہ جو ظاہراً رضایت سے سازگاری نہیں رکھتے ہیں دونوں کو جمع کیا ہے: یقیناًائمہ اطہار علیہ السلام من جملہ امام حسین علیہ السلام مقام رضا کے بالاترین مرحلہ پر فائز تھے اور ہم دیکھتے ہیں جو کچھ انھیں پیش آتا تھا، اس لحاظ سے کہ خدا کی طرف سے تھا راضی تھے، لیکن پھر بھی ناراض تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شمشیر بکف ہو کر جہاد کیا اور آخری لحۂ حیات تک جنگ کرتے رہے۔ یہ جہاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ بنی امیہ کی حکومت سے راضی نہیں تھے۔ کیسے ممکن ہے انسان ایک حادثہ سے اس لحاظ سے کہ خدا کی طرف سے ہے راضی بھی ہواور ناراض بھی!۔ ان دو کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے اور انسان کو چاہئے کہ تکامل کے ان مراحل تک پہونچ جائے تاکہ مراتب او رحیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کا نفس مراتب طولی کے اعتبار سے مختلف صورتوں کا مالک ہوتا کہ ایک مرتبہ میں حوادث کو اس کے فاعل قریب کی حیثیت سے دیکھے اور اس کیرفتار سے ناراض ہو۔ ان کے انجام دئے جانے والے گناہ، ظلم اور خیانتوں سے ناراض ہواور ان پر حملہ آور ہوجائے، اور عین اسی حالت میں دوسرے مرتبہ پر اس کا نفس شاد و مسرور ہو۔

ذہن کو اس مطلب و مفہوم سیقریب کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں: فرض کریں کسی کے سر میں درد ہے اور طبیب اس کے لئے ایک کڑوی دوا تجویز کرتا ہے، یہاں پر انسان چونکہ اپنی سلامتی چاہتاہے اس لئے اس دوا کو کھاتا ہے، اس لحاظ سے اس کے کھانے پر راضی ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ یہ دوا تلخ ہے ناراض ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں انفکشن ہوگیا ہے اگر اسے نہ کاٹا جائے تو وہ مرض اس کے سارے بدن میں سرایت کرجائیگا اور اس کی جان خطرے میں پڑجائیگی تو وہ شخص اپنے ہاتھ یا پیر کے کاٹے جانے پر راضی ہوجاتاہے کیونکہ اسی میں اس کی جان کا تحفظہے اور وہ عمل اس کے لئے ناراض کنندہ نہیں ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ ایک ہاتھ سے محروم ہوجائیگاناراض ہے خاص کر درد واذیت اور وہ پریشانیاں جو آپریشن کے بعد رونما ہوتی ہیں۔ حقیقت میں انسان کے اندر اس دورخی حالت او رخاصیت کا وجود عجیب و غریب ہے کہ ایک ہی لمحہ میں، ایک حادثہ کے بارے میں دو مختلف

حالتوں سے روبرو ہوتا ہے البتہ ان دونوں حالتوں کا وجوددوسرے دو مختلف عوامل کا حاصل اور نتیجہ ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا اس کی سلامتی کا سبب ہے،تو خوش ہوتاہے اور اس لحاظ سے کہ اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہورہاہے اور درد کی سختی کررہا برداشت کرتاہے ،تو ناراض ہوتا ہے ۔مذکورہ مثال کے پیش نظر ہم عرض کرتے ہیں: جس انسان کی معرفت کمال تک پہنچ گئی ہے، وہ جانتا ہے کہ دنیا کے حوادث خدائے متعال کے ارادہ کے بغیر رونما نہیں ہوتے ہیں،لہذا وہ اس لحاظ سے کہ وہ حوادث خدا کے ارادہ سے رونما ہوئے ہیں راضی ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ حوادث ایک ظالم کے توسط سے انجام پائے ہیں ا ور وہ اس ظالم کی پستی و ، انحطاط نیز اس کے جودی نقص کی علامت ہے، لہٰذا ناراض ہے کہ ایک انسان کو کیوں اس قدر جاہل و گناہگار ہوکہ اس طرح کے نازیبا اور ناشائستہ عمل کا مرتکب ہو ۔ لہذا ممکن ہے انسان ایک حادثہ کے بارے میں دونظریہ رکھتا ہواور ہر نظریہ کے مقابلہ میں متناسب رد عمل دکھائے ۔

مومن کو اس جہت سے خوش ہونا چاہئے کہ حوادث ومصائب خدا کے ارادہ او رمشیت سے رونما ہوئے ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدائے متعال کسی کام کو حکمت کے بغیر انجام نہیں دیتا ہے او ر احسن نظام کا تقاضا ہے کہ حوادث کو اپنی جگہ پر مناسب شرائط سے جس طرح واقع ہونا چاہئے اسی صورت میں رونما ہو۔ جب اسے معلوم ہواکہ خدائے متعال حکیم و دانا ہے اور لغو و بیہودہ کام انجام نہیں دیتاہے، تو وہ جانتا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں رونما ہوتاہے ،اس جہت سے کہ ایک ہم آہنگ اور کامل نظام کے تحت ہے، جو مخلوقات عالم کے لئے تکامل کا سبب ہے او رانسان ان گوناگوں حوادث کے سایہ میں خداوند متعال سے نزدیک ہوتا ہے اور ایسے کمالات تک پہونچتاہے جو دنیوی لذتوں سے قابل موازنہ نہیں ہے ۔

لہذا مومن مجموعی حوادث کی نسبت کلی طور پر خوش ہےنہ ۔ یہاں تک اس نظریہ کے مطابق پیغمبروں او رائمہ کے قتل ہونے سے بھی ناراض نہیں ہوتاہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوکر ایک بلند مرتبہ پر پہونچ گئیہیں اور اسی طرح ان کی شہادت دین کی ترقی اور پیش رفت کا سبب بنی ہے ۔ سیدالشہدا ء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی شہادت کے ذریعہ بلند ترین مقام

تک پہنچے اور آن کی شہادت اسلام کے بقا او رپیش رفت کا سبب بنی اور اس امر کا بھی سبب بنی کہ دوسرے لوگ بھی آپ کی معرفت او ریاد کے سایہ میں معنوی کمالات تک پہونچیں او رصحیح زندگی او ردنیوی و اخروی سعادت کی راہ کو پہچان لیں۔ اگر آپؑ شہید نہ ہوتے، تو نہ آپؑ اس مقام تک پہنچتے، نہ اسلام زندہ ہوتا اور نہ ہم امام شناس ہوتے تا کہ آپؑ کی شفاعت ہمیں نصیب ہو۔ اس جہت سے ہمیں آپؑ کی شہادت سے خوش ہونا چاہئے کہ یہ تقدیر الٰہی ہے اور ایک احسن و اصلح نظام کی کڑی میں مؤثر ہے ۔ لیکن غمگین اور آنسو بہانا انسانی جذبات او رہمدردی کی جہت سے ہے، چونکہ انسان ایک مہربان اور ہمدرد مخلوق ہے اور اس کی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب اس کے محبوب کو کوئی مصیبت او رمشکل پیش آئے تو وہ غمگین ہو۔

جی ہاں، ضعیف افراد وہ چاقت نہیں رکھتے ہیں جو ان حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کریں اور پھر ایک دوسرے کی ردیف میں قرار دیں او ربعض اوقات ان کے وجود کا عقلانی اور جذباتی پہلو ایک دوسرے سے تزاحم و تضاد کا حامل ہوتا ہے، اس جہت سے وہ ان دونوں کو آپس میں جمع نہیں کر سکتے۔ لیکن جن کا نفس کامل ہے، وہ ان دنوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور حیثیتوں کا جدا ہونا سبب بن جاتاہے کہ مختلف حالات حتیٰ ایک ہی حادثہ کے بارے میں اور ایک ہی زمانہ میں خود بخود رونما ہوں، کہ البتہ یہ نفس کے گوناگوں مراتب سے مربوط ہے کہ ایک جہت سے نفس شاد ہوتاہے اور دوسری سے غمگین ہوتاہے.جی ہاں، جو شخص مقام رضا پر فائز ہے وہ خوشیوں او رغموں کو، اس جہت سے کہ تقدیر الٰہی ہے دل و جان سے قبول کرتاہے اور ان پر راضی ہوتاہے۔

مقامِ صبر اور اس کی اہمیت پر ایک نظر: بہر حال مقام ،رضااور معرفت و یقین ، ایک عظیم نعمت اور بلند عطیہ ہے کہ انسان تمام تقدیرات الٰہی پر راضی و خوشنود ہو، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پروردگا راس کی بھلائی چاہتاہے۔ لیکن ہر شخص اس مقام پر فائز نہیں ہوتاہے او ریہ معرفت آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئےتہذیب نفس اور بہت زیادہ کوشش کی ضرورت ہے ۔ اگر کوئی اس بلند مقام تک نہیں پہونچ سکا،تو مختصر طور پر اسے جان لینا چاہئے کہ تقدیرات الٰہی انسان کے لئے خیر

ہے اگر چہ مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنا اس کے لئے تلخ و دشوار ہے، لیکن اسے صبر و تحمل کا مظاہر کرنا چاہئے اور خودکو صبر کے زیور سے مزیّن کرنا چاہئے ۔ جو مومن رضا کے مقام تک نہیں پہنچاہے، لیکن حوادث کے مقابلہ میں صابر اور ثابت قدم ہے، اگر چہ وہ نہیں چاہتاہے کہ تلخ حوادث دنیا میں رونما ہوں، اور وہ اپنے فرائض پر عمل کرتا ہے اور اپنے فریضہ کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتاہے، اگر کبھی دشمن کے ساتھ جہاد و مبارزہ کا موقع آگیا تو وہ اپنے فریضہ الٰہی کے تحت جہاد و مبارزہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے باوجودیکہ وہ تلخ حوادث سے خوش نہیں ہے او ردل سے راضی نہیں ہے، لیکن اسے قبول کرتاہے او راگر سختی و پریشانی بھی ہوئی تو اسے برداشت کرلیتا ہے، یہ اس کے لئے ہے جومقام رضا تک نہیں پہنچا ہے، اس لئے کہ مقام صبر مقام رضا سے کمتر ہے، لہٰذا مطلوب ہے۔ صبر، مفاہیم اخلاقی میں سے ایک ہے کہ اخلاق اسلامی میں اس پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ جو کچھ اس لفظ سے ذہن میں آتا ہے، وہ ایک نفسانی حالت ہے جو بعض خاص افراد کے لئے مشکلات، مصیبتوں کے وقت پیش آتی ہے۔ حوادث سے روبرو ہوتے وقت، لوگوں کے حالات متفاوت ہوتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے حوادث کے مقابلہ میں فوراً رونا پیٹنا شروع کردیتے ہیں، یہ پریشان کن حالت ان کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور انھیں ان کے امور اور فعالیتںے معطل کر کے رکھ دیتی ہے، ایسے لوگ بے صبر و کمزور تصور کئے جاتیہیں اس کے بر خلافبعض افراد سختیوں اور مشکلات کے مقابلہ میں، بہت صابر آزما ہوتے ہیں اور آرام و سکون کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تلخ حوادث ان طبیعت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں کرتے، یہ لوگ صبر و تحمل والے ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ اگر چہ تلخ حوادث کے بارے میں دل سے راضی نہیں ہوتے، لیکن انھیں برداشت کرتے ہوئے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔

نا مناسب حوادث کا استقبال نہیں کرتے، ان کا دل نہیں چاہتا ہے کہ وہ محا ذ جنگ پر جائیں اور شہید ہوجائیں وہ بارودی سرنگوں پر جانا نہیں چاہتے ہیں، لیکن جب فریضہ و تکلیف کا تقاضا ہوتا ہے کہ محاذ جنگ پر جائیں، ایسی صورت میں روگردانی نہیں کرتے ہیں، ان کے ماں باپ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کا فرزند محاذ جنگ پر جائے لیکن جب شرعی فریضہ کے تحت جہاد واجب ہوجاتا ہے تو

وہ اپنے بیٹوں کے درمیان حائل نہیں ہوتے ہیں اور صبر کرتے ہیں اور اپنے دانت پیستے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان صبر و تحمل سے مشکلات اور مصیبتوں پر قابو پا سکتا ہے اور بہتر صورت میں منزل مقصود کو طے کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو منظم کر کے اخروی سعادت کو حاصل کر سکتا ہے ۔بعض اوقات صبر کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور وہم وگمان کیا جاتا ہے کہ سختیوں کے مقابلہ میں صبر کرنایعنی ذلت کے سامنے تسلیم ہوجا نا ہے اور دوسروں کے حق میں رونما ہونے والے ہر حادثہ وظلم کے مقابلہ میں غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنا ہے ۔یہ تفسیر اور تصور غلط ہے اور مفہوم صبر سے لا علمی کا نتیجہ ہے ۔

اسلامی لغت میں صبر یعنی سختی کے مقابلہ میں برداشت کرنا اور انسان کو باطل کی طرف کھینچنے اور کمال کی راہ میں مانع بننے والے عامل کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے۔یہ عامل کبھی داخلی ہوتے ہیں اور کبھی خارجی ۔خواہ وہ عوامل انسان کو حرکت کرنے کی دعوت کرے ،لیکن ناحق حرکت،اور خواہ اسے سکون کی دعوت دیں چاہے یہ توقف ناحق ہی ہو، مثلا انسان گرسنگی اور بھوک کے وقت کھانے کی طرف تمایل رکھتا ہے اب اگر اسے جو غذا فراہم و دستیاب ہے وہ غیر شرعی ہے یا مشکوک ہے ،یہاں پر غریزہ اشتہا ہمیں دعوت کرتی ہے کہ ہم اس غذا کو کھا لیں ،لیکن اسے کھانا ناحق ہے اور اسکے مقابلہ میں استقامت کا مظاہر کرنا صبر ہے۔

محاذ جنگ پر دشمن نے حملہ کیا ۔ہر طرف سے بمباری ہورہی ہے ،نفس کہتا ہے بھاگ جاؤ اور اپنے آپ کو میدان کارزار سے باہر نکال لو ،لیکن خدائے متعال فرماتا ہے استقامت کرو تاکہ اسلام کی فتح ہوجائے یہاں پر نفسانی عامل جو انسان کو فرار کرنے کی دعوت دیتا ہے ،اس کے مقابلہ میں استقامت دکھانا صبر ہے۔کبھی خارجی عامل انسان کو کسی ناحق چیز کی طرف دعوت دیتا ہے اور وہ بیرونی عامل کبھی انسان کے توسط سے رونما ہوتا ہے اور کبھی غیر انسان کی جانب سے کہ جسے تقدیرات الہی سے تعبیر کرتے ہیں۔مثلا زلزلہ آتا ہے اور گھر کی چھت گر جاتی ہے۔اگر ہم اس حادثہ کے موقع پر تحمل کا مظاہرہ کریں اور اپنے فریضہ پر عمل کریں تو ہم نے صبر کیا ہے ۔پس روایات میں ذکرشدہ صبر کی مشترک تقسیم (مصیبت پر صبر اور اطاعت پر صبر)اپنے آپ پر کنٹرول کرنا اور خلاف حق اقدام نہ کرنا ہے،اور انسان کو باطل کی طرف دعوت کرنے والے عامل کے مقابلہ میں استقامت کرنا ہے۔جب

صبر کی اہمیت واضح و روشن ہوگئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی اوراس کے تکا مل وترقی کی راہ میں صبر کا کونسا کردار ہے اور اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کس وسیلہ سے تکامل وترقی حاصل ہوتی ہے ۔انسان کاتکامل اور اس کی ترقی اس کے اختیاری اعمال کے تحت ہی ممکنہے ،یعنی جب دو متضاد کششوں کے درمیان مقابلہ ہو اور انسان اس کشش کا انتخاب کرے جو اسے کمال کی طرف لے جائے،تو انسان کا کمال اور اس کا جوہر ظاہر ہوتاہے ایسی صورت میں انسان کو چاہئے کہ جس میں خدا کی مرضی ہواسے انتخاب کرے. لہٰذا انسان کاتکامل اور اس کی ترقی دو متضاد کششوں کی معرکہ آرائی ہی ممکن ہے ۔ ایسے میدانوں میں انسان کوایسی چیز کا انتخاب کرنا چاہئے جس میں خدا کی مرضی ہو.اگر اس صورت انسان کا میں ایمان اوراس کا فطری شوق زیادہ طاقتور ہوگا تو وہ اسے حق کی طرف دعوت دے گا اوروہ اپنے لائق کمال تک پہونچے گا، لیکن اگر نفسانی اور شیطانی عنصر زیادہ طاقتور ہوا، تو دوکششوں کے درمیان جنگ میں انسان پسل جائے گااور ایک ایسی سمت کی طرف جھکتا چلا جائیگا جس میں اس کے لئے زلت وپستی ہے ۔

یہ در حقیقت وہی آزمائش کا معنی ہے ۔ (''تبارک الذی بیدہ الملک و ہو علی کل شی ء قدیر ۔ الذی خلق الموت و الحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا..[1]) ''بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں سارا ملک ہے اور وہ ہر شی پر قادر و مختار ہے۔ اس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے''جی ہاں، ہم اپنے تکامل و ترقی کی راہ میں ایسے عوامل سے روبرو ہیں، جو ہمیں گوناگوں جہات کی طرف دعوت کر دیتے ہیں۔

عقلانی، ملکوتی، او رالہی عوامل ہمیں ایک طرف دعوت کردیتے ہیں اور نفسانی، حیوانی او رشیطانی عوامل ہمیں دوسری طرف دعوت کردیتے ہیں۔ صحیح انتخاب یہ ہے کہ ہم باطل کی طرف دعوت کردینے والے عوامل کے مقابلہ میں استقامت کریں۔ پس حقیقت میں اگر ہماری زندگی تکامل وترقی چاہتی ہے تو صبر کے ساتھ توام ہونی چاہئے۔ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و

---

[1] ملک/۱۔۲

سلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ صبر کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کی "یصبر فی الضراء کما یصبر فی السّراء و فی الفاقة کما یصبر فی الغنی، و فی البلاء کما یصبر فی العافیة فلا یشکوا حالہ عند الخلق بما یصیبہ من البلاء[1]" "صبر یہ ہے کہ سختیوں اور پریشانیوں میں تحمل و استقامت کا مظاہرہ کرو، تونگری و خوشحال کی طرح فقر و افلاس میں بھی ثابت قدم رہو، صحت و سلامتی کی طرح حالت بیماری میں بھی استوار رہو، لہٰذا صابر وہ ہے جو مصیبت اور پریشانیوں میں خلق خدا کے سامنے گلہ مند نہ ہو۔"

جی ہاں، جو لوگ مقام یقین تک نہیں پہنچے ہیں تا کہ واضح طور پر پا سکیں اس بات کو درک کر سکیں جو کچھ پیش آرہا ہے وہ سب خیر ہے، وہ بلاؤں کا دل کھول کر استقبال نہیں کر سکتے، انھیں چاہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ان کے مطالبات کو پورا کرے اور نامناسب حوادث کے رونما ہونے پر بردباری کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ ہم نے کہا، جو رضا کے مقام تک پہنچا ہے وہ حوادث اور مصیبتوں سے رنجیدہ نہیں ہوتا، بلکہ خوشی کا اظہار کرتا ہے اور خدا کا شکر بجا لاتا ہے۔

اگر اس کا بیٹا شہید ہوتا ہے، تو کہتا ہے: الحمد للہ، کاش میرے پاس دوسرا بیٹا ہوتا اسے بھی محاذ جنگ پر بھیجتا تا کہ وہ بھی شہید ہوتا! نہ صرف رنجیدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ فخر کرتا ہے اور اپنے اوپر ناز کرتا ہے اور شکر بجا لاتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس حد تک نہیں پہنچے ہیں اور خدائے متعال نے بھی فرمایا ہے..."و قلیل من عبادی الشکور[2]" "میرے شکر گزار بندے کم ہیں"، جو رضا کی منزل تک نہیں پہنچے ہیں تا کہ مصیبتوں کے مقابلہ میں اعتراض کے لئے لب کشائی نہ کریں اور شکر کریں، اگر نامناسب حوادث پر صبر کریں تو خدائے متعال انھیں صابروں کی اجر و ثواب دیتا ہے۔

صبر کریں گریہ و زاری نہ کریں اور اطمینان کا مظاہرہ کریں، اس امید سے کہ خدائے متعال انھیں پاداش دے گا۔ اگر چہ بلائیں اور مصیبتیں ان کے لئے تلخ ہیں، لیکن ان تلخیوں کو برداشت کرلیں، اس شخص کے مانند جو تلخ دوا کھاتا ہے اور اس سے لذت کا احساس

[1] بحار الانوار، ج۷۷ص۲۰
[2] سباء/۱۳

نہیں کرتاہے، لیکن جانتا ہے کہ اس کے کھانے سے صحت یاب ہوگا ۔ جیسے کوئی شخص مجبور ہے آپریشن کے ذریعہ اس کے بدن کا ایک عضو، مثلا ایک پیر کو کاٹ لیا جائے، اس کے لئے اگرچہ یہ مشکل ہے، لیکن چونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اس لئے قضا کے سامنے تسلیم ہوتاہے، او رحاضر ہوتا ہے، اس کا پیر کاٹ لیا جائے تا کہ اس کے بدلے اس کی جان بچ جائے ۔

خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے کا اثر :مذکورہ بیان کے پیش نظر ، قرآن مجید کی بعض آیات اور روایت میں، ان افراد کی تربیت و تھذیب کے لئے (جو دل میں آرزو رکھتے ہیں اور ابھی مقام تسلیم ورضا تک نہیں پہنچے ہیں) وعدہ کیاگیا ہے کہ اگر تقوی کو اپنا شعار بنالیا تو خدائے متعال تمہارے دنیوی مطالبات کو پورا کرے گااور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلامصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''یا اباذر؛یقول اللہ جلّ ثناؤہ و عزّتی و جلالی لایؤثر عبدی ہوای علی ہواہ الا جعلت غناہ فی نفسہ و ہومہ فی اخرتہ''''...اے ابوذر! خدائے تبارک و تعالی فرماتاہے:مجھے اپنی عزّت و جلال کی قسم میرا بندہ میری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح نہیں دیتا ہے مگر یہ کہ میں اسے بے نیاز کردیتا ہوں او رایسا کرتا ہوں کہ اس کی فکر اور خود وہ امور اخروی میں مصروف ہوجائے''.

خدائے متعال مطلب کی تاکید کے لئے قسم کھاتاہے،کیونکہ اس بات کا قبول کرناعام لوگوں کے لئے آسان نہیں ہے، اسی لئے قسم کھاتاہے تا کہ لوگ باور کریں. فرماتاہے، اگر کبھی میری مرضی او رمیرے بندہ کی درمیان تزاحم و تضاد پیدا ہو اور اس نے میری مرضی کو ترجیح دی (اگر اس کی مرضی خدا کی مرضی کے مطابق ہے، اس کی مرضی بھی واقع ہوتی ہے اور خدا کی مرضی بھی گفتگو اس میں ہے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی ہے) تو اس کے لئے چند چیزوں کی ضمانت دیتا ہوں: پہلے یہ کہ اس کے دل میں دوسروں سے بے نیازی کا احساس ڈالتا ہوں ۔ البتہ انسان ہمیشہ خدا کا محتاج ہوتاہے او رخدا سے نیاز مندی کا احساس بھی اس میں ہے او رہوناچاہئے ۔ انسان کے شرف و افتخار کی انتہا اس میں ہے کہ وہ احساس کرے کہ خدا کی بارگاہ کا فقیر ہے اور جان لے کہ اس کا نیازمند ہے اور خود کو غیر خدا کا محتاج تصور نہ کریں:

با دادہ حق اگر تو راضی باشی

از ہیچ ویی کی متقاضی باشی

(اگر خدا کے دئے ہوئے پر تم راضی ہوجاؤ گے تو تم اس سے کب متقاضی ہو گے؟)اس کے پیش نظر کہ انسان کی خواہشات عام طور پر دوسروں کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں، وہ اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج تصور کرتاہے، اور دوسروں کے سامنے ضرورت کا احساس کرنا انسان کو ذلیل و خوار کردیتا ہے،اور جس حد تک انسان اپنے کو دوسروں کے سامنے محتاج تصور کرتا ہے اسی اعتبار سے اس کے سامنے خاشع و متواضع نظر آتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تملق اور چاپلوسی کرتا ہے اور کبھی درخواست و التماس کرتا ہے۔ اپنے کودوسروں کے سامنے حقیر اور چھوٹابنادیتاہے تاکہ وہ اس کے مطالبات پورے کرے اگر انسان اپنے رابطہ کو خدائے متعال سے مستحکم کرے اور اس کی مرضی اور چاہت کو اپنی مرضی پر ترجیح دے، تو خداوند متعال اس میں دوسروں سے بے نیازی کا جذبہ پیدا کردیتاہے اور اس کے مقاصد پورے ہونے کے لئے کافی وسائل مہیا کرتا ہے ۔

البتہ وہ وسائل مقاصد او راہداف کو حاصل کرنے کے لئے آلہ و اوزار کی حیثیت رکھتیہیں،انسان کا فرض ہے کہ ان وسائل کو استعمال میں لائے او ران سے بہرہ مند ہونے کے لئے خدا کا شکر بجا لائے،اگر دوسرے انسان بھی من جملہ اس کے دنیوی مقاصد تک رہنمائی کرنے کے لئے واسطہ اور وسیلہ تھے، تو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

اگر چہ وہ ان وسائل سے استفادہ کرتاہے لیکن ایسےرف اپنے آپ کو خدا کا محتاج جانتا چاہئےاور غیر از خدا کی طرف محتاج نہ ہونے کا احساس نہیں چاہئے۔ غیر سے غنی اور بے نیاز ہونے کا احساس ایک عظیم نعمت ہے جوانسان کو شخصیت بخشتا ہے۔ البتہ جو کچھ بیان ہواہے اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ دوسروں کے سامنے تواضع و انکساری کا مظاہرہ نہیں کرناچاہئے۔ انسان کو خدائے متعال کے برابر بھی اور اس کی مخلوق کے سامنے بھی تواضع و انکساری سے پیش آنا چاہئے۔ جو اسلامی معارف سے آشنا نہیں ہیں وہ

تصور کرتے ہیں اسلام نے ہم سے چاہاہے کہ حتی خدا کے سامنے بھی ذلت و حقارت کا احساس نہ کریں! ایسے لوگوں نے اسلام ہی کو نہیں پہچاناہے اور اس کے بارے میں ایک باطل تصور رکھتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد بندگی پر ہے،انسان کا انتہائی فخر اس میں ہے کہ خدا کے حضور میں ذلّت اور چھوٹے پن کا احساس کرے، اپنی پیشانی اور چہرے کو خاک پر رکھے۔

انسان کا کمال اس میں ہے کہ خود کو ذات باری تعالی کے سامنے ذلیل سمجھے، چونکہ خدائے متعال انسان کے کمال و بلندی کو چاہنے والاہے، اس لئے اس سے کہاہے کہ اس کے سامنے ذلّت کا احساس کرو اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو اس کی بارگاہ میں پیش کرو، چونکہ تکامل وسعادت خداکی بندگی میں مضمر ہے، اس کے برعکس، دوسروں کے سامنے احساس کمتری و ذلت کا مظاہرہ نہ کرے اور خود کو ان کا محتاج نہ جانے۔ کیونکہ اگر اس نے اپنے آپ کو ان کا محتاج جان لیا، تو خواہ نخواہ ضرورت و محتاجی کے احساس کی وجہ سے ذلّت کا احساس بھی کرے گا۔

جس قدر انسان یہ احساس کرتاہے کہ اس کا کام دوسروں کے ذریعہ انجام پاتاہے، اسی قدر خود کو ان کے سامنے حقیر تصور کرتاہے، اگر چہ زبان سے نہ کہے لیکن دل میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار محسوس کرتاہے۔ لیکن اگر مومن نے ایمان کی برکت سے اپنا کام خدا پر چھوڑدیا اور اپنے آپ کو صرف خدا کا محتاج جانا تو وہ دل میں بھی دوسروں کی نیازمندی کا احساس نہیں کرتاہے۔ اگر چہ ممکن ہے خدائے متعال اپنے بندہ کے ہاتھ سے اس کی احتیاج و ضرورت کو بر طرف کرے اور انسان سے چاہے کہ اس کا شکریہ بجالائے، لیکن وہ اپنے آپ کو صرف خدا کا محتاج جانتاہے۔

حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے کہ جب نمرود کے حکم سے بہت ساری آگ اکٹھا کی گئی کہ جس کے شعلہ اس قدر عظیم تھے کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے، اس کی حرارت دور کے فاصلہ سے بھی افراد کو جلادیتی تھی، یہا ں تک کہ مجبور ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعہ دور سے آگ کے اندر پھینکیں اس سخت اور

دشوار حالت میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئےتو جبرئیل امین ان کی مدد کے لئے ان کے پاس آئے او رفرمایا :ہل لک حاجۃ؟ کیا میرے لائق کوئی حاجت ہے؟حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا ''انا الیک فلا'' [1] ''تجھ سے کوئی حاجت نہیں رکھتا ہوں''،حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا : ضرورت مند ہوں او ر مدد کا محتاج اور خواہشمند ہوں، لیکن غیر خدا سے نہیں، خدا میرے اسرار سے آگاہ ہے او رمیری حاجتوں کو جانتا ہے وہ جو بہتر سمجھے گا انجام دے گا ۔ جب حضرت ابراھیم علیہ السلام اس سخت امتحان میں پاس ہوئے تو خدائے متعال نے انھیں خلت کے مقام پر فائز کیا اور انھیں اپنا خلیل اور دوست بنادیا ۔

لیکن غنی اور بے نیازی کے مقام پر پہنچنا دوسروں کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے،صرف خداکی مہربانی اور اس کی عنایت سے انسان اس مقام تک پہنچ سکتا ہے،لیکن خدائے متعال نے اس مقام تک پہنچنے کے مقدمات کو انسان کے اختیار میں قراردیا ہے اور من جملہ ان مقدمات میں سے جیسا کہ عرض کیا گیا ،یہ ہے کہ جب انسان کے لئے اپنی مرضی اور خدا کی مرضی میں سے ایک کو اختیار کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنی مرضی پر خدا کی مرضی کو ترجیح دیتا ہے اور پہلے مرحلہ میں وہ لوگوں سے غنی اور بے نیاز ہونے کا احساس کرتا ہے ۔

دوسرے یہ کہ :پھر وہ دنیوی امور کے بارے میں فکر مند نہیں رہتا ہے اور اپنے دنیوی خیر وصلاح کو خدا کے سپرد کردیتا ہے صرف آخرت کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے اوراس کا ہم وغم آخرت کے بارے میں ہوتاہے۔ وہ اس فکر میں ہوتاہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا،کیااس نے اپنے اخروی فریضہ پر عمل کیاہے؟لہذا عوہ ہمیشہ آخرت کی فکر میں رہتاہے ''و ضمنت السّماوات و الارض رزقہ و کفلت علیہ ضیعتہ و کنت لہ من وراء تجارہ کل تاجر'' ''آسمان و زمین کو اس کے رزق کا ضامن قراردیتا ہوں اور اس کے کسب معاش کی حفاظت کرتا ہوں او رمیں اس کے لئے ہرتاجر کی تجارت سے برتر ہوں۔''

[1] بحار الانوار ج۱۲ص۳۵

تیسرے یہ کہ : جو میری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا ہے، تو میں بھی اس کے مطالبات کو پورا کرتا ہوں اور زمین و آسمان کو اس کے رزق کا ضامن قرار دیتا ہوں او رانھیں حکم دیتا ہوں کہ اس کی روزی کا انتظام کریں۔چوتھے یہ کہ: اس کے کاروبار کو آفات او رنقصانات کے مقابلہ میں تحفظ بخشتا ہوں۔ ہرکوئی اپنی زندگی چلانے کے لئے کسی کسب معاش کو اپنا تاہے اور کسی شغل کا انتخاب کرتاہے تا کہ اس کے نتیجہ میں کوئی درآمد حاصل ہو سکے، فطری بات ہے کسب و کار اور کھیتی باڑی و...اور اس کے باقی رہنے اور پھل دینے کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی ہے ۔ کہاں سے معلوم کہ باغ میوے دے گا، زراعت فصل کے مرحلہ تک پہنچ جائیگی، گائے اور گوسفند زندہ رہیں، کہاں سے معلوم کہ بلا و آفات انسان کے کام، کاج کو متاثر نہ کرے گی؟ جو خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتاہے خدائے متعال ضمانت دیتاہے کہ اس کے کاروبار،اس کی زراعت اور گائے اور بکریوں بلاء و آفات اور خسارے سے محفوظ رکھے گا تا کہ موقع آنے پر نتیجہ او رپھل دے سکیں۔

پانچویں یہ کہ : میں ہر کار و بار او رتجارت میں اس کی مدد کرتاہوں تا کہ نقصان سے دوچار نہ ہو۔ جو ہمیشہ دنیا کی فکر میں ہوتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی ایسے شخص سے معاملہ کریں جس سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ ایسے معاملہ و تجارت کا انتخاب کرتے ہیں جس میں بیشتر نفع ہو۔ ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں کہ تجارت میں نقصان نہ ہوجائے یا منافع کم نہ ہوجائے ۔ خدا ئے متعال فرماتاہے کہ جو ہماری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتاہے میں اس کے ہر تجارت او رمعاملہ کی پشت پناہی کرتا ہوں تا کہ بیشتر نفع کمائے،اس کے ہر معاملہ میں میرے ہاتھ اس کی مدد کرتے ہیں۔

بجائے اس کے وہ خود فکر کرے، تدبیر کر ے اور پلان تیار کرے کہ کس سے اور کس طرح معاملہ کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع کمائے، میں اس کی ہر تجارت میں حمایت کرتاہوں اور اس کے منافع کو تحفظ بخشتا ہوں۔اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم اس نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ مومن کا ایسا یقین ہونا چاہئے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی روزی کے بارے میں فکر مند نہ رہے اور جان لے کہ جو کچھ خدائے متعال نے اس کے لئے مقدر کیاہے وہ اسے ملے گا،آپؐ فرماتے ہیں ''یا اباذر؛ لو ان ابن ادم فر

من رزقہ کما یفرّ من الموت لادرکہ رزقہ کما یدرکہ الموت'' ''اے ابوذر! اگر بنی آدم اپنی روزی سے اسی طرح فرار کرے جس طرح وہ موت سے فرار کرتا ہے تو اس کی روزی اسی طرح اس تک ضرور پہنچ جائے گی جس طرح موت اس تک پہنچتی ہے۔''انسان کو موت پسند نہیں ہے، وہ اس سے فرار کرتا ہے، لیکن بالاخر موت اسے نگل لیتی ہے۔ اس طرح اگر وہ اپنی روزی سے فرار کرے تو روزی اس تک پہونچ جائیگی اور اس کے جو مقدر میں ہے اس سے اسے راہ فرار نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی زیادہ کوشش کرتا ہے تو یہ، معلوم نہیں ہے اس کا رزق زیادہ ہوجائے گا،اس لئے کہ ایسے بھی بہت سے افراد گزرے ہیں جنہوں نے بہت زیادہ سعی و کوشش کی لیکن پھر بھی بھوک کے موت کی سو گئے. اس سلسلہ میں دولتمند ترین افراد کے بارے میں عجیب و غریب داستانیں نقل ہوئی ہیں کہ اپنی زندگی میں ایسے حوادث او رروداد سے روبرو ہوئے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں انھیں مرتے دم بھوک کے نتیجہ میں اپنے جوتے چبانے پر مجبور ہونا پڑا ہے!او ردوسری طرف ایسے افراد بھی گزرے ہیں کہ جنھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی، لیکن خدائے متعال نے انھیں ایک عظیم ثروت و دولت سے نوازا ہے اور جوان کے مقدر میں تھا وہ انھیں ملا۔

انسان کو فریضہ انجام دینے اور معاش کی تلاش میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے او راسے قضا و قدر کے بہانے سے سستی نہیں دکھانی چاہئے، کیونکہ خدائے متعال سست اور کاہل انسان سے بیزار ہے۔ لیکن اگر علم حاصل کرنے اور شغل کے انتخاب کرنے میں مختار ہو اور اس کا فریضہ ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنا ہو تو، اگر کافی معرفت رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لئے در آمد کا کم ہونا اس بات کا سبب نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے لئے نہ جائے،،بلکہ خدا کی طرف سے مقدر شدہ رزق پر اس کا ایمان، اسے مجبور کرتا ہے کہ اطمینان کے ساتھ علم حاصل کرے اور مطمئن رہے کہ اس کا رزق اسے ضرور ملے گا او رجو کچھ اس کے مقدر میں ہے وہ اس سے محروم نہیں ہوگا.

سولھواں درس

خدا کی معرفت اور اس کا حکیمانہ نظام خدا کی معرفت اور اس کا حکیمانہ نظام

''یا اباذر!الا اعلمک کلمات ینفعک اللہ عزو جل بہن ؟قلت:بلی یا رسول اللہ۔ قال :احفظ اللہ یحفظک،احفظ اللہ تجدہ امامک۔تعرف الی اللہ فی الرخاء یعرفک فی الشدۃ واذا سالت فاسال اللہ عزو جل واذا استعنت فاستعن باللہ۔ فقد جری القلم بما ہو کائن الی یوم القیامۃ ،فلو ان الخلق کلھم جہدوا ان ینفعک بشیء لم یکتب لک ماقدروا علیہ ۔ ولوجہدوا ان یضروک بشیء لم یکتبہ اللہ علیک ماقدروا علیہ۔ فان استطعت ان تعمل للہ عزوجل بالرضا والیقین فافعل وان لم تستطع فان فی الصبر علی ماتکرہ خیرا کثیرا وان النصر مع الصبر والفرج مع الکرب وان مع العسر یسرا ۔یا اباذر!استغن بغنیا للہ یغنک اللہ۔ فقلت:وماہو یا رسول اللہ ؟قال:غداء ۃ یوم وعشاء لیلۃ،فمن قنع بما رزقہ اللہ فھو اغنی الناس''انسان اور اس کا خدا سے رابطہ:پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا یہ حصہ،خدا سے رابطہ،مشکلات میں اسکی طرف توجہ،اس سے مدد مانگنے اور دوسروں سے بے نیازی کے بارے میں ہے ۔خدا سے رابطہ کے بارے میں کہنا چاہئے کہ:انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ قرب الہی کے مقام تک پہنچ جائے لہذا اس کی تمام سر گرمیاں خدا سے رابطہ کو تحفظ بخشنے کے سلسلے میں ہونی چاہئے۔

اگر وہ اپنی توانائیوں کو دوسرے امور میں صرف کرتاہے،تو اس نے انھیں ضائع کیا ہے ۔ مام باطنی اور ظاہری توانائیوں اور ساری نعمتوں کو خدا سے رابطہ کی راہ میں استعمال کرنا چاہئے،گویا یہ راستہ کافی وسیع اور مختلف صورتوں میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک ہماری روح کی مختلف جہتوں میں سے کسی ایک جہت سے مربوط ہے،کیونکہ خدائے متعال نے ہماری روح کو مختلف چہروں پہلوؤں اور گوناگون حیثیتوں سے سزاوار کیا ہے،یہتمام پہلوایک سمت میں معین کئے گئے ہیں اور سب کا رخ خدا کی طرف ہے ۔ایسا نہیں ہے کہ ہمارے وجودی پہلوؤں میں سے ایک پہلو خدا کی جہت میں ہے اور دیگر تمام پہلو ایسے نہیں ہیں۔انسان کے وجودی پہلوؤں کے

بارے میں کچھ تقسیم بندیاں ہوئی ہیں ،مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ وجود انسانی کا ایک پہلو خدا سے رابطہ کے لئے ہے اور اس کا ایک پہلو اپنے آپ سے رابطہ کے لئے ہے اور ایک پہلو دوسرے انسانوں سے رابطہ کے لئے ہے اور اسکا ایک اور پہلو تمام مخلوقات سے رابطہ کے لئے ہے ۔یہ تقسیم بندی انسان سے مربوط احکام کی نظرسے صحیح ہو سکتی ہے انسان کے اپنے آپ سے رابطہ کے پہلو میں بیان ہوتا ہے کہ کونسی چیزیں اس کے بدن کے لئے نفع بخش ہیں اور کونسی چیز مضر ہیں، فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ۔ انسان کے بعض احکام خدا سے رابطہ کو معین کرتے ہیں،جیسے نماز اور روزہ .انسان کے بعض احکام مخلوق سے رابطہ کو معین کرتے ہیں ،جیسے ماں باپ سے برتاؤ،رشتہ داروں،دوستوں اور دشمنوں سے برتاؤ۔یہ تقسیم بندی قابل قبول ہے،لیکن اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہئے کہ انسانی حیثیتوں کی یہ تقسیم بندی اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم خدا کی بارگاہ میں تقرب کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے ہوں،بلکہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمارے تمام وجودی پہلو ان میں موجودہ اختلاف کے باوجود ایک نقطہ پر منتہی ہوئے ہیں ۔یعنی وہی رابطہ جو انسان دوسرے انسانوں سے رکھتا وہی خدا اور دوسروں سے رکھنا چاہئے ۔

ہمارے کاموں کی صورت میں فرق ہے:ایک کام نماز کی صورت میں ہے اور ایک سبق پڑھانے کی صورت میںیا درس پڑھنے کی صورت میں یاروز مرہ کے امور انجام دینے کی صورت میں، لیکن یہ سب امور ہمارے لئے اسی وقت اور اسی حالت میں مفید ہیں کہ جب خدا کے لئے ہوں،لہذا انسان کے اپنے تمام کام حتی اس کے تفکرات خدا کے لئے ہونا چاہئے اور وہ اس کے علاوہ کسی کو نہ چاہے،نہ طلب کرے اور نہ ڈھونڈے ۔

یارب زتوآنچہ من گدامی خواہم افزون زہزار پاد شاہ می خواہم ہر کس زدرتو حاجتی می خواھد من آمدہ ام از تو ترامی خواہم

(اے پروردگار ! میں بھکاری ،جو تم سے مانگنا چاہتا ہوں وہ ہزاروں بادشا ہوں سے زیادہ چاہتا ہوں ، ہر کوئی تیرے در سے کوئی حاجت چاہتا ہے، میں آیا ہوں اور خود تجھے چاہتا ہوں)انسان جو اپنے مادی وجوداور مادی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے جو محدود کششیں رکھتا ہے ،اس کے علاوہ اپنی نا محدود زندگی ،نامحدود مقصد، نامحدودجمال و کمال اور نامحدود توانائی کے

لئے بھی کچھ کششیں رکھتا ہے ۔ حقیقت میں انسان کی وجودی عمارت بے نہایت مقصد کے لئے تعمیر کی گئی ہے اور بے نہایت عالم کی طرف حرکت کرنے کے لئے انسان کے اندر فطرتیں معین کی گئی ہیں اور جو کچھ دنیا کے بارے میں محدود ہوتا ہے یہ اس کا مقد ماتی پہلو ہے اور اس لئے ہے کہ انسان کی حرکت کا انجن رکنے نہ پائے اور اپنی راہ کو خدا کی طرف جاری رکھے۔ یاد رکھنا چاہئے جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے وہ خدا سے انسان کا رابطہ ہے، کیونکہ انسان کا انتہائی کمال خدا سے رابطہ میں منحصر ہے اور یہ رابطہ پہچان اور عمل سے حاصل ہوتا ہے، اس کے بغیر انسان دوسرے حیوانات کی فہرست میں ہوتا ہے بلکہ ان سے پست تر: (اولئک کا لانعام بل ہم اضل[1]) ''یہ (گمراہ) چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں '' اس کے درمیان، انبیاء اور اولیائے الٰہی کا وجود ان کے علمی آثار، سنت و سیرت اور ان سے ظاہر ہونے والی طاقتیں ان کے خدا سے رابطہ کی نشانیاں تھیں ۔

البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عقلی تجزیہ کے مطابق ہر شئے کا وجود، خالق سے عین رابطہ ہے اور ممکن نہیں ہے کی خالق اپنی مخلوق سے رابطہ نہ رکھے، لیکن یہ رابطہ تکوینی ہے کہ جو نظام ہستی کے مجموعہ میں واقع ہوا ہے اور ناقابل گریز ہے اور کوئی بھی مخلوق ممکن نہیں ہے خدا سے تکوینی رابطہ نہ رکھے ۔ بالاخر اس تکوینی رابطہ کے علاوہ انسان ایک اور خصوصیت رکھتا ہے اور خدائے متعال نے یہ قدرت اسے عنایت کی ہے کہ وہ اپنی عقل، فہم و شعور کی برکت سے اس رابطہ کو درک کر سکتا ہے اور اسکی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ اس رابطہ کو بہتر اور زیادہ عمیق صورت میں درک کرے ۔ عام طور پر شناخت کا آغاز اور خدا سے رابطہ علم حصولی کے ذریعہ ہوتا ہے جو فکر اور عقلی و فلسفی استدلال کو بروئے کار لاکر حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن یہ معرفت و شناخت آخری اور نقطۂکمال کی انتہا نہیں ہے اور اسے مقصد و منزل تک نہیں پہنچاتی ہے اور اس میں راسخ اعتقاد و یقین ایجاد نہیں کرتی ہے ۔ مکمل شناخت، شناخت حضوری ہے ۔ یعنی انسان ایک ایسے مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں سے پورے وجود سے خدا سے رابطہ کو درک کرتا ہے، بلکہ وہ خدا سے خود عین رابطہ ہوتا ہے، نہ یہ کہ صرف جان لے ۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایسے مقام تک پہنچا دے ۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ

---

[1] اعراف۱۷۹

السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا '' : مارأیت شیئاً الا و رأیت اللّٰہ قبلہ وبعدہ ومعہ '' ''میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا ،مگر یہ کہ اس سے پہلے اس کے بعد اور اس کے ساتھ خدائے متعال کو دیکھا ''اگر انسان کوجو کمال تک کوشش کرتا ہیاس دنیا میں یہ معرفت مکل طورپر حاصل نہ ہوئی،تو اسے ایسے مواقع فراہم کر نا چاہئے تاکہ دوسری دنیا میں اس رابطہ کو مکل طور پر حاصل کر سکے ۔ اس جہت سے دین کی زبان میں اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں، خداسے رابطہ کے سلسلہ میں '' رویت '' سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور کہاگیا ہے کہ بہشتیوں کی بالا ترین نعمت یہ ہے کہ اپنے کمال کے درجہ کے مطابق انوار الٰہی کے مشاہدہ سے فیضاب ہوتے ہیں ۔جو بلند ترین مقامات تک پہنچے ہیں ان کے لئے ہمیشہ انوار الٰہی کا مشاہدہ میسر ہوتا ہے اور جن کامقام پست ہے ،ان کے لئے کمتر تجلیات الٰہی حاصل ہوتی ہیں ۔

نقل کیاگیا ہے کہ ایک تہرانی عالم دین جو ایک متقی و پرہیزگار شخص تھے کینسر کی بیماری کی وجہ سے اس دنیا سے چلے گئے مرحوم کے ایک رشتہ دار نے جو ان سے بہت زیادہ محبت و عقیدت رکھتے تھے ان کو خواب میں دیکھا اور اپنے خواب کو حقیقت میں ایک سچا خواب قم کے ایک عالم دین کی خدمت میں یوں بیان کیا :جب میں نے ان کو خواب میں دیکھا توان سے سوال کیا :کیا آپ اس دنیا (برزخ)میں ائمہ اطہاراور امام حسن علیہم السلام کی زیارت کرتے رہیں؟انھوں نے جواب میں کہا :کیا کہتے ہو!اس دنیا میں ہمارے اور سید الشہداء علیہ السلام کے درمیان تیس ہزار سال کا فاصلہ ہے،ہمیں تیس ہزارسال انتظار کرنا ہے تاکہ انکی زیارت کر سکیں !جی ہاں!دیکھنا چاہئے انسان اپنادل کس کے سپرد کرتاہے اور انسان کی قدروقیمت اس چیز کی وجہ سے ہے جس چیز کو اس نے اپنادل حوالے کیا ہے ۔جس کادل باغ اور گھر سے تعلق رکھتا ہو،اسکی قدرومنزلت اسی حد میں ہے لیکن اگر اس کادل خدا سے متعلق ہواوراس کے دل کا رابطہ خدا سے ہے،تو اس کی قیمت بے بہا ہے ،پھر وہ دنیا کی محدود اور ناپائدار تعلقات کی قید میں نہیں ہوتا ہے، وہ خدا کے علاوہ تمام لوگوں اور چیزوں سے دل کھینچ لیتا ہے

:آنکس کہ ترا شناخت جان را چہ کند فرزند وعیال وخانمان را چہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ تو ہر دو جہا نرا چہ کند

جس نے تجھے پہچان لیا اس کو اپنی جان کے ساتھ کیا کام ہے ۔اپنے اہل و عیال اور خاندان سے اسے کیا لینا دینا ہے ۔(پہلے تو اپنی محبت میں) دیوانہ کرتے ہو اور پھر دونوں جہاں بخشتے ہو تیرے دیوانہ کو دونوں جہاں سے کیا کام ہے!لہذا انسان کی حقیقی قدر و منزلت خدا سے اس کے رابطہ اور اس کے تقرب میں ہے ،نہ مادی لذتوں اور سرمایہ میں ۔انسان کی انسانیت اس کے درک اور قلبی توجہات میں ہے ،دیکھنا چاہئے کہ اس کا دل کہاں پر رابطہ بر قرار کر چکا ہے اور جس قدر اسکا رابطہ خدائے متعال سے عمیق تر ہوگا اتنا ہی محکم و مستحکم تر ہوگا ۔

جب انسان اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے لگتا ہے تو انوار الٰہی اس کے لئے بیشتر تجلی کرتے ہیں اور عطیات و نعمات الٰہی سے وہ زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ''یا اباذر!الا اعلمک کلمات ینفعک اللہ عزوجل بہن ؟قلت:بلی یارسول اللہ.قال:احفظ اللہ یحفظک''''اے ابوذر!کیا میں تجھے ایسی باتیں نہ سکھاؤں کہ خدائے متعال ان کی برکت سے تجھے نفع پہنچائے ؟میں نے عرض کی: جی ہاں،اے اللہ کے رسول۔آپؐ نے فرمایا :خدائے متعال سے اپنے رابطہ کو حفظ کرو تاکہ خدائے متعال اپنے رابطہ کو تیرے ساتھ حفظ کرے''،جتنی بھی نصیحتیں اب تک بیان ہوئیں فائدہ منداور نفع بخش تھیں پس یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو توجہ دلاتے ہیں کہ تیرے لئے ایسی باتیں بیان کروں کہ خدائے متعال ان کی وجہ سے تجھے بخشے گا ۔گویا اس کا یہ معنی ہے کہ یہ باتیں گزشتہ مطالب کا خلاصہ اور منتخب مجموعہ ہے اور اس کی خاص اہمیت ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو ان کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ خدائے متعال نے تمہارے اور اپنے درمیان ایک تکوینی رابطہ رکھا ہے اور یہ رابطہ اعظم الوہیت اور تمہارے جیسے بندہ حقیر کے درمیان استوار ہے، کوشش کرو یہ رابطہ بر قرار رہے اور

ٹوٹنے نہ پائے۔ اگر اس رابطہ کو تحفظ بخشنے کیلئے تم نے تلاش وکوشش کی تو خدا وند متعال بھی تمھاری حفاظت کرے گا ۔ اس مفہوم کو حافظ نے اپنے ایک خوب صورت شعر میں یوں بیان کیا ہے:

گرت ہواست کہ معشوق نگسلد پیوند نگہدار سر رشتہ تا نگہدارد

اس سے بڑھ کر کونسی سعادت ہو سکتی ہے کہ ایک بندۂ حقیر جو دنیا میں کسی چیز میں شمار نہیں ہوتا خالق کائنات سے رابطہ رکھتا ہے اور اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہو سکتی ہے پس اس کی حفاظت کے لئے کوشش کرنی چاہئے تاکہ اس کی وجہ سے خدا کی عنایتیں ہمیشہ اس پر نازل ہوتی رہیں. لیکن اگر اس کی حفاظت کے لئے کوشش نہ کی اور بندگی کی رسم بجانہ لایا ،تو اسے خدائے متعال کی مہربانیاں اور عنایتیں حاصل کرنے کی توقع نہیں رکھنا چاہئے ۔

شاید بعض لوگوں کے لئے یہ امر مبہم ہو کہ میرے اور خدا کے درمیان کس قسم کا رابطہ ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں،میں جو اس عالم خاکی میں زندگی کرتا ہوں اورخدائے متعال اور عرش الٰہی کے درمیان کونسا رابطہ ہو سکتا ہے۔ اس ابہام کو دور کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':احفظ اللہ تجدہ امامک'''' خدا سے اپنے رابطہ کی حفاظت کرو تاکہ اسے اپنے سامنے پاؤ'' یعنی تمھارے اورخداکے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے وہ ہمیشہ تمھارے پاس حاضر ہے اور تجھ سے جدا نہیں ہے۔ (وہو معکم اینما کنتم واللہ بما تعلمون بصیر[1]) ''ور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو وہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے'' اس بنا پر انسان کو خداکی عنایات میں شامل رہنا چاہئے تاکہ وہ بلاؤں،شیطان کے شراور نفسانی وسوسوں سے اس کی حفاظت کرے (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں حفاظت کرنا مطلق ہے اور اس میں انسان کو ہر مادی ومعنوی خطرہ سے حفاظت کرنا شامل ہے) خداکے ساتھ اپنے رابطہ کو محفوظ رکھنا چاہئے اوراسے کمزور ہونے نہیں دینا چاہئے۔ مشکلات اور آسائش میں خداکی طرف توجہ کرنے کی رورت: پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '':تعرف الی اللہ فی الرخاء یعرفک فی الشدۃ''

[1] حدید،۴

''گنجائش کے وقت اپنے آپ کو خدائے تعالے سے آشنا کروتاکہ وہ تجھے تنگدستی کی حالت میں پہچانے۔''اس کے پیش نظر کہ خدائے متعال بے نہایت قدرت رکھتا ہے اور جو کچھ کائنات میں انجام پاتا ہے اسکے ارادہ ومشیت سے ہے اور اس کے ارادہ کے دائرہ سے کوئی چیز خارج نہیں ہے ،ہر حالت میں انسان کو اس کی طرف توجہ رکھنی چاہئے.اگر مشکل اور گرفتاری سے دوچار ہے تو صرف خدا کی طرف توجہ کرے اور اس سے مشکلات کو دور کرنیکی درخواست کرے اسی طرح جب آسائش نصیب ہو تو خدا کو مد نظر رکھے،کیونکہ آسائش کی نعمت کو خدائے متعال نے اس کے اختیار میں قرار دیا ہے۔

فطری بات ہے کہ جب انسان کسی گرفتاری اور نامناسب حادثہ سے دو چار ہوتا ہے تو خدائے متعال کی طرف رخ کرتا ہے ،چنانچہ پروردگار عالم مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے:(فا ذا رکبوا فی الفلک دعوااللہ مخلصین لہ الدین فلما نجیھم الی البر اذا ہم یشرکون[1])

''پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں(اور کشتی خطرے سے دو چار ہوتی ہے)تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات پاکر خشکی میں پہونچ جاتے ہیں تو مشرک ہوجاتے ہیں'' یہ کوئی کمال نہیں ہے کہ انسان سختیوں ومشکلات اور ہر طرف سے بلاؤں کے حملوں کے وقت خدا کی طرف توجہ کرے ،البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو بارگاہ الہی سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ حتی مصیبتوں میں بھی خدا کو یاد نہیں کرتے،لیکن جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے توکم ازکم سختی اور مشکل کے وقت خدا کو یاد کرتا ہے.پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:اگر چاہتے ہوکہ ہر وقت خدا کو یاد کرو ،وہ تجھے جواب دے اور تیری فریاد رسی کرے ،توآرام و آسایش کے وقت خدا سے اپنے رابطہ کی حفاظت کرو اور اس سے آشنائی حاصل کرنا ،چونکہ اگر اس وقت اس سے ناآشنا ہوئے، تو یہ توقع نہ رکھنا کہ وہ گرفتاری کے وقت تیری فریاد رسی کرے گا،آرام وآسائش کے وقت خدا کو یاد کرو ،تاکہ مشکلات میں اس کو پکارتے وقت وہ تجھے لبیک کہے۔ ہم سب،کم وبیش،اپنی اپنی زندگی میں مشکلات اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں،اور تھوڑی دیر یا زمانے کے بعد اس سے نجات اور جھٹکا رہ پاجاتے ہیں ،لیکن ہم بہت ہی سادگی کے ساتھ ان قضیوں

---

[1] عنکبوت،٦٥

پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اس رہائی اور آسائش کی نعمت جسے خدائے متعال نے ہمیں مشکلات کے بعد ہمیں عنایت کی تھی اس کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے ۔جبکہ بلائیں اور مشکلات انسان کو بیدار کرنے اور اسے خدا کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہوتی ہیں تاکہ وہ نعمتوں کی قدر کو جان لے ۔اگر ہمارے لئے کوئی خطرناک صورت حال پیش آجاتی ہے ۔مثلا ہمارا کوئی عزیز سخت بیمار ہوجاتا ہے امیدوں کے تمام دروازے ہمارے لئے بند ہوجاتے ہیں اور شدید خطرے سے دو چار ہوتے ہیں،اگر اس مایوسی و ناامیدی کے عالم میں کسی نے ہماری مدد کردی ،ایک طبیب یا ڈاکٹر اچانک آگیا اور اس نے ہمارے بیمار کا علاج کردیا اور اسے ہلاک ہونے سے بچالیا اور اسی طرح سیکڑوں حوادث جو ہمارے لئے پیش آتے ہیں اور ہم اس سے نجات پاجاتے ہیں،ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ان مشکلات سے رہائی کے بارے میں ہم کیا اخذ کیا ہے ؟کیا ان سب کو ہم اتفاقی سمجھیں اور کہیں کہ اتفاقا ایسا ہوا ہے ؟ہر گز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سب خدائے متعال کی مہربانیاں ہیں ،خدائے متعال کی مہربانیاں اور عنایتیں ہمارے شامل حال ہوتی ہیں اور ہم ان خطرات سے بچ جاتے ہیں۔

نظام خلقت میں جو کچھ واقع ہوتا ہے ،سب ارادۂ الٰہی کے نتیجہ میں ہے اور کوئی چیز خدا کی مرضی کے خلاف واقع نہیں ہوتی ۔اگر انسان کو کوئی نعمت ملتی ہے یا کوئی بلا اس سے دور ہوتی ہے ،سب خدائے متعال کے ارادہ سے ہے ۔ وہ اسباب اور شرائط کو فراہم کرتا ہے ،خواہ وہ اسباب معمولی ہوں یا غیر معمولی خواہ ہم انھیں جانیں یا نہ جانیں ۔(اگرچہ جب ہم غیر معمولی اسباب جنھیں ہم اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں پر توجہ کرتے ہیں تو متأثر ہوتے ہیں)یہ خدائے متعال ہے جو ہمیشہ انسان کو رزق پہنچاتا ہے ،خواہ معمولی اسباب کے ذریعہ جیسے کسب معاش یا خواہ غیر معمولی اسباب کے ذریعہ ،جیسے مائدہ آسمانی ۔ انسان کی مشکلات کا دور ہونا بھی خدائے متعال کے توسط سے ہے ،خواہ معمولی راستوں سے یا غیر معمولی راستوں سے ۔ایک تقسیم بندی کے ذریعہ انسانوں کو خدا کی طرف توجہ کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :پہلا گروہ :وہ لوگ ہیں جو ہر حالت میں،خواہ خوشحالی اور آسائش میں یا گرفتاری اور بلا میں خدائے متعال کی طرف توجہ رکھتے ہیں اور قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق صبح وشام اس کی یاد میں مصروف ہیں اور صرف

مثلاتمیں اسے یاد نہیں کر تے ہیں:(واذکر ربک فی نفسک تضر عا وخیفة ودون ا لجہر من القول بالغدو والاصال ولاتکن من الغافلین[1]) ''اور خداکو اپنے دل ہی دل میں بغیر منھ سے آواز نکالے ہوئے تضرع اور تنہائی کے عالم میں بھی کم بلند آواز سے صبح وشام یاد کرو اور خبردار غافلوں میں نہ ہوجاؤ''(فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیھا اسمہ یسبح لہ فیھا بالغد و والا صال[2])(یہ چراغ)ان گھروں میں(جیسے مساجد،انبیاء اوراولیاء کے گھر)ہے ،جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ انکی بلندی کا احترام کیا جائے اور ان میں اس کے نام کاذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح وشام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

اس گروہ کی ہر حالت میں خدا کی یاد میں ہونے کا راز یہ ہے کہ خد اکی طرف سے تمام نعمتیں حاصل کرنے کے باوجود بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں،اور کم از کم ان نعمتوں کی پائد اری کے لئے خود کو خدا کا محتاج جانتے ہیں،چونکہ وہ اپنے مراتب میں اختلاف کے مطا بق خدا سے اپنی نیاز مندی کو درک کرتے ہیں ،لہذا ان کے لئے نعمت و بلا میں کوئی فرق نہیں ہے وہ شائستہ بندے ہیں اور ہمیشہ خدائے متعال کو مد نظر رکھتے ہیں اور خدا کی طرف سے بھی ان پر توجہ ہوتی ہے ۔

دوسرا گروہ :اکثر مو منین اس گروہ میں شامل ہیں ،یہ وہ لوگ ہیں کہ نعمت وآسائش کی حالت میں کم و بیش غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں،لیکن جب کوئی مشکل اور گرفتاری پیش آتی ہے تو بیدار ہوجاتے ہیں اور خدا کی نسبت نیاز مندی کا احساس کرتے ہیں ،یہ لوگ بھی نسبتا اچھے ہیں ،لیکن خدائے متعال ان سے شکوہ کر تا ہے کہ کیوں جب ہم انھیں کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو ہمیں فراموش کردیتے ہیں اور جب وہ نعمت ان سے چھین لی جاتی ہے تو ہماری (خدا متعال کی)طرف متوجہ ہوتے ہیں:(و اذا انعمنا علی الانسان اعرض ونئا بجانبہ و اذا مسہ الشر فذودعا ء عریض[3]) اور ہم جب انسان کو نعمت دیتے ہیں تو ہم سے کنارہ کش ہوجاتا ہے اور پہلو بدل کر الگ ہو جاتا ہے اور جب سخت موقع آتا ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے ۔تیسرا گروہ : یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بھی حالت

---

[1] اعراف،۲۰۵
[2] نور،۳۶
[3] فصلت،۵۱

ہیں ،حتی مصیبت اوربلاؤں میں بھی خدا کی طرف رخ نہیں کرتے اس گروہ کے بعض افراد بلاؤں کو خداکی طرف سے جانتے ہیں ،لہذا جب وہ بلائیں ان پر نازل ہوتی ہیں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں کیونکہ ان بلاؤں کو غیر طبیعی اسباب کی پیداوار اور خدا کا قہر و غضب جانتے ہیں ۔قوم یونس کی طرح کہ جب ان کے لئے عذاب کا وقت آگیا اور نزدیک تھا ان پر عذاب نازل ہو جائے ،چونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ عذاب خدا کی غضب کی نشانی ہے اس لئے ہوش میں آگئے اور توبہ کی ،اور خدائے متعال نے بھی انھیں نجات دی ۔اس گروہ کے اکثر لوگ بلاؤں کے بارے میں یہ تصور نہیں کرتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہے،لہذا وہ خداکی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں، خدائے متعال ان لوگوں کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے:(فلولا اذجاء ہم بأسنا تضرّعوا ولکن قست قلوبہم وزین لہم الشیطان ماکانوا یعملون[1]) پھر ان سختیوں کے بعد انھوں نے کیوں فریاد نہیں کی، بات یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہوگئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کر دیا ہے ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:(ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فہی کالحجارۃ او اشد قسوۃ وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الأنہار وان منہا لما یشقق فیخرج منہ الماء وان منہا لما یہبط من خشیۃاللہ وما اللہ بغافل عما تعلمون[2]) ''پھر تمہارے دل سخت ہوگئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت کہ پتھروں میں سے بعض سے نہریں بھی جاری ہو جاتی ہیں اور بعض شگافتہ ہو جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض خوف خداسے گر پڑتے ہیں،لیکن اللہ تمھارے اعمال سے غافل نہیں ہے''خدا سے درخواست کرنے اور مدد چاہنے کی ضرورت:پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بارے میں کہ انسان کو صرف خدائے متعال سے درخواست کرنی چاہئے اورخدا کے علاوہ کسی اورسے مدد نہیں مانگنی چاہئے، فرماتے ہیں'': واذا سالت فاسال اللہ عزوجل واذا استعنت فاستعن باللہ، فقد جری القلم بما ہو کائن الی یوم القیامۃ''اگر درخواست کرنا چاہتے ہو تو خدائے متعال سے درخواست کرو ۔ اور کسی سے مدد چاہتے ہو توپروردگار سے مدد مانگو کیونکہ قیامت تک رونما ہونے والا سب کچھ لکھا جا چکا ہے ۔طبعی بات ہے کہ انسان کی کچھ حاجتیں ہیں اور

[1] انعام،۴۳
[2] بقرہ،۷۴

وہ ان کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، اور اپنی تمام خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ لہذا خواہ نخواہ کسی کے پیچھے دوڑتا ہے کہ اس کی مدد کرے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذر سے فرماتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی چیز مانگنا چاہتے ہو تو خدائے متعال سے مانگو ۔ جب دیکھتے ہو کہ کسی چیز کے حاجت مند ہو اور خود اس کو پورا نہیں کر سکتے ہو اور کسی اور سے مدد مانگنے پر مجبور ہو تو خدائے متعال سے مانگو، کیونکہ تیری حاجت کے بارے میں اس سے بہتر کوئی آگاہ نہیں ہے اور اس کی طرح کوئی یہ طاقت نہیں رکھتا ہے کہ تیری حاجتوں کو پورا کر سکے پوری ھستی اس کی ملکیت ہے اور اس کی قدرت تمام چیزوں پر تسلط رکھتی ہے اگر کوئی امر واقع ہونا چاہتا ہے تو وہ اس کے ارادہ و مشیت سے واقع ہوتا ہے اس کے علاوہ خدائے متعال ہر شخصسے زیادہ اپنی مخلوق اور اپنے بندہ سے محبت رکھتا ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے، اس لئے خود اپنے بندہ کو حکم دیا ہے کہ اس کو پکارے اور اسی سے مدد کی درخواست کرے. ہم دعائے افتتاح میں پڑھتے ہیں ''؛اللھم اذنت لی فی دعائک و مسئلتک'' ''پروردگارا !تم نے مجھے اجازت دی ہے کہ تجھے پکاروں اور تجھ سے درخواست کروں''،فطری و طبیعی بات ہے جب خدائے متعال انسان کے لئے دعاومناجات کا دروازہ کھولتا ہے ۔

تو اس کا جواب دینے اور قبول کرنے کیلئے آمادہ ہے اور اس کے علاو ہ خدائے متعال انسان کو ہمیشہ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے ۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اسکی جملہ نعمتوں میں بلاؤں سے رہائی اور ان کو دور کرنا بھی ہے یہ نعمت بھی خدا کے توسط سے انسان متواتر خدا کی مہربانیوں اور محبتوں کا مرہون منت ہے اور اسے جاننا چاہئے کہ صرف خدا اس کی مدد کرنے پر قادر ہے اور کائنات میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا ہے، لہذا صرف اس سے مدد مانگنی چاہئے ۔ ہم دعائے افتتاح کے ایک دوسرے حصے میں پڑھتے ہیں '': فکم یا الھی من کربۃ قد فرجتھا و ھموم قد کشفتھا و عثرۃ قد اقلتھاورحمۃ قد نشرتھا وحلقۃ بلاء قد فکلتھا''،پروردگارا!کتنی زیادہ مصیبتوں کو تونے مجھ سے دور کیا اوراسے برطرف کردیا، میری لغزشوں کو معاف فرمایا، رحمتوں کو پھیلایا اور بلاؤں کے حلقہ کو توڑدیا ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں '': اذا اراد احدکم ان لا یسال ربہ شیئا الا اعطاہ

فلییاس من الناس کلھم ولایکون لہ رجاء الا عنداللّٰہ فاذا علم اللّٰہ عزوجل ذلک من قلبہ لم یسال اللّٰہ شیئا الا اعطاہ ''چونکہ اگر تم میں سے کسی نے یہ چاہا کہ جس چیز کی پروردگار سے درخواست کرے وہ اسے مل جائے تو اسے لوگوں سے ناامید ہوجانا چاہئے اور جو خدا کے پاس ہے اس کے علاوہ کسی چیز کی امید نہیں رکھنا چاہئے ،چونکہ خدائے متعال اس کے دل پر نظر رکھتا ہے اور جو بھی اس سے چاہتاہے، عطا کرتا ہے ہم میں سے ہر ایک کم از کم روزانہ کہتا ہے : ''ایاک نستعین''،لیکن ہم عمل میں ایسے نہیں ہیں ۔ جیسے کہ ہم بہت سے لوگوں کا عمل یہ ثابت کرتاہے کہ ہم صرف خدا سے مدد نہیں چاہتے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی مدد طلب کرتے ہیں ۔البتہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بات میں صادق ہیں اور جب ''ایاک نعبدوا وایاک نستعین''، کہتے ہیں تو حقیقت میں اسی کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی سے مدد طلب کرتے ہیں ۔

لیکن ہم سچ نہیں کہتے ہیں اور ہمیشہ خدا کے بندوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں ۔ مصیبتوں اور مشکلات میں امید رکھتے ہیں کہ ماں ،باپ ،بھائی،بہن اور دوست و احباب ہماری مدد کریں اور کبھی اپنی امید اور توقع کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔پیغمبر اسلام صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرماتے ہیں کہ صرف خدائے متعال سے درخواست کرو اور اسی سے مدد چاہو ۔اس کے بعد جناب ابو ذر کو قضا و قدر اور تقدیرات الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں بحث ہوئی ہے ۔

تقدیرات الٰہی اور قضاوقدر پر اعتقاد کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اگر انسان کو آرام وآسائش ،دولت اور خوشحال کرنے والا کوئی واقع پیش آتاہے تو بہت زیادہ اترتا نہیں ہے اسی طرح پریشانی اور ناگواری کے کوئی واقعات پیش آتے ہیں تو بہت زیادہ رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتاہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے وہ تقدیرات الٰہی ہے،اس سے فرار نہیں کیاجاسکتا ۔ (ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبراہا ان ذلک علی اللّٰہ یسیر[1]) زمین میں کوئی بھی مصیبت (قحط،آفت،فقر وظلم)وارد ہوتی ہے یا تمہارے نفسے تم کو پہنچتی ہے تو دنیا میں وارد ہونے سے پہلے وہ کتاب الٰہی (لوح محفوظ)میں

---

[1] حدید،۲۲

ثبت ہو چکی ہے اور یہ خدا کے لئے بہت آسان شے ہے۔ یہ تصور نہ کیا جائے کہ خدائے متعال اپنے بے شمار بندوں میں سے ہر بندہ کے لئے پوری تاریخ میں جو کچھ اس کے لئے واقع ہوا ہے یا واقع ہو گا وہ کس طرح مقدر کرتا ہے !کیونکہ یہ کام اسکے لئے آسان ہے جیسے ہی وہ ارادہ کرتا ہے تمام معلومات جو اس کے پاس موجود ہے لوح محفوظ میں بھی درج ہے۔ پھر بعد والی آیت میں اس مطلب کی دلیل یوں ذکر کرتا ہے: (لکیلا تاسوا علی مافاتکم ولاتفرحوا بما اتکم واللہ لا یحب کل مختال فخور[1]) یہ تقدیر اس لئے ہے کہ جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اس کا افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر غرور نہ کرو کہ اللہ اکڑنے والے مغرور افراد کو پسند نہیں کرتا ہے ۔

تقدیرات الٰہی پر اعتقاد کے من جملہ فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی نظر ہمیشہ خدا پر ہوتی ہے،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس چیز کو اس نے مقدر بنایا ہے وہ اس میں تبدیلی لا سکتا ہے ،غیر از خدا دوسرے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے ہیں ،کہ کوئی ان سے امید رکھے ۔اگر اس کے لئے کوئی ناخوشگوار واقعہ اور مصیبت پیش آئے،تو وہ جانتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت کے پیش نظر اسے مقدر فرمایا ہے ۔یا اگر اس سے کوئی چیز چھین لی جاتی ہے،تو وہ جانتا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھی گئی ہے اور خدا کے حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر اس قسم کے واقعات رونما ہونے چاہئے ،اس لئے ناراض نہیں ہوتا ہے اور پھر بھی بارگاہ الٰہی میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اس سے چاہتا ہے اس کی مشکلات اور گرفتاریوں کو دور کرے ۔

اگر ہمیں کوئی نعمت عطا ہو تو ہمیں مست و مغرور نہیں ہونا چاہئے اور خدائے متعال کو نہیں بھولنا چاہئے ،بلکہ اس حالت میں بیشتر خدا کی طرف توجہ کریں اور اس نعمت کے عطا ہونے پر شکر بجا لائیں اور بارگاہ الٰہی میں اپنی تواضع اور گدائی کی حالت کی حفاظت کریں ،نہ یہ کہ قارون کے مانند ان نعمتوں کو اپنی تلاش و جستجو کا نتیجہ جان لیں: (قال انما اوتیتہ علی علم عندی اولم یعلم ان اللہ قد اہلک من قبلہ من القرون من ہواشد منہ قوۃ واکثر جمعا[2])قارون نے کہا کہ مجھے یہ سب کچھ میرے علم کی بنا پر دیا گیا ہے تو کیا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی نسلوں کو ہلاک کر دیا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور اور مال کے اعتبار سے دولت

[1] حدید۲۳
[2] قصص۷۸

مند تھیں اور ایسے مجرموں سے تو ان کے گناہوں کے بارے میں سوال بھی نہیں کیا جاتا ہے .جان لو جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ تقدیر الٰہی کی بنیاد پر تجھے ملا ہے اور خدائے متعال نے اس کے اسباب فراہم کئے ہیں، اس بنا پر اگر کسی سے مدد کی درخواست کرنا چاہتے ہو ،تو اس سے مدد طلب کرو کہ تمام امور جس کے ہاتھ میں ہیں اور تمام کام اس کی تقدیر کے مطابق انجام پاتے ہیں ،اگر وہ مصلحت جان لے تو اپنے مقدرات میں تبدیلی لا سکتا ہے،بہر حال تمہیں اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے اور اسی کی رحمت سے امید باندھنی چاہئے اور جب کسی بلا یا مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ تو، تم میں کوئی خاص تبدیلی رو نما نہیں ہونی چاہئے ،کیونکہ وہ بلا و مصیبت ایک حساب شدہ پروگرام کے تحت اور حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر رو نما ہوئی ہے لہٰذا گریہ وزاری نہ کرو اور اپنے گریبان چاک نہ کرو کہ کیوں ایسا ہوا ؟!ہمارے جزع فزع اور آہ وزاری سے خدائے متعال اپنے حکیمانہ تدبیر سے صرف نظر نہیں کریگا ۔

اگر کوئی نعمت تجھے عطا کی گئی ہے ،تو یہ تصور نہ کرو کہ اسے تم نے اپنی فطانت اور زیرکی سے حاصل کیا ہے ,بلکہ تقدیرات الٰہی اور خدا کی حکیمانہ تدبیر کے سبب وہ نعمت تجھے ملی ہے اس کے علاوہ یہ تیرے امتحان وآزمائش کے لئے ہے کہ تم اس نعمت سے کیا کرتے ہوپس قضا وقدر پر اعتقاد کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ انسان جان لے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر ہوتا ہے اوراگر اس نے کسی قسم کی کمی بیشی کا مشاہدہ کیا تو زیادہ ناراض نہیں ہوتا ہے ،کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس نے اس نظام کو قائم کیا ہے ،اس نے اس تقدیر کوتدبیر قرار دیا ہے ،وہ اپنے کئے پر اس سے آگاہ تھا اور اپنے بندوں کی بھلائی اور مصلحت سے واقف تھا ۔مذکورہ مطالب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوذرکو خدا سے مدد مانگنے کی تاکید کرنے کے بعد انھیں تقدیرات الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں'' :فقد جری القلم بما ہو کاءن الی یوم القیامۃ''،کیونکہ جو کچھ قیامت تک واقع ہوگا ، قلم اس پر جاری ہو چکا ہے ہم نے اس سے پہلے بھی یاددہانی کرائی ہے اور یہاں پر بھی تاکید کر رہے ہیں کہ ہمیں قضا و قدراور معارف الٰہی کے مسئلہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے ۔ایسا نہ ہو کہ ہم بیان معارف میں پوشیدہ حکمتوں سے غافل ہو جائیں اور فکر کریں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ واقع ہوکر رہے گا ،اور ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے!پس ہم کنارہ کشی کریں اور اپنے فرائض اور ذمہ

داریوں سے پہلو تہی کریں ؛بلکہ ہمیں جاننا چاہئے ہماری تلاش وکوشش بھی تقدیرات الٰہی کے زمرے میں ہے ،اس بناپر ہمیں بیشتر کوشش و جستجو کرنی چاہئے اور اپنے فرائض کے بارے میں بیشتر عزم و ارادہ کا مظاہرہ کرنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ قضاو قدرپر بھروسہ کر کے فرائض و تکلیف سے پہلو تہی اختیار کی جائے اور سستی وکاہلی کو اپنا یا لیا جائے ،یہ شیطان کے وسوسے میں سے ہے۔ قضا وقدر پر اعتقاد اس امر کا سبب بننا چاہئے کہ ہم خدا کی طرف بیشتر توجہ کریں اور صرف اس کادامن تھا رہیں اور بیہودہ طور پر دوسروں کے پیچھے نہ جائیں اور ان کی چاپلوسی نہ کریں اور اپنی ذاتی غرض کے لئے اپنے فرائض او رتکالیف کو ترک نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم شیطان کے دھوکے میں آئیں اور تصور کریں ،اب جب کہ سب چیزیں مقدر ہیں ،ہما رے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔

لہذا گوشہ نشینی اختیار کریں ،اگر علم حاصل کرنے میں مشغول ہیں تو اسے چھوڑ دیں ،اپنی جگہ پر کہیں کہ اگر مقدر میں ہوگا ہم عالم بن جائیں، توخواہ درس پڑھیں یانہ پڑھیں عالم تو ہو ہی جائیں گے !حقیقت میں اگرمقدر میں عالم ہونا ہے از راہ تعلیم تو اگر ہم درس پڑھیں گے تب عالم بن جائیں اور اگر ہم درس نہ پڑھیں تو عالم نہیں بنیں گے البتہ ممکن ہے کسی تلاش و محنت کے بغیر ہی کوئی علم انسان کو عطا ہو جائے تو یہ فضل الٰہی ہے جو کبھی انسان کو نصیب ہوتا ہے ،لیکن بہر حال انسان کواپنے فریضہ کو انجام دینے کی راہ میں کوشش کرنی چاہئے اور کسی بھی کوشش سے فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو جاری رکھتے ہوئے اپنے گذشتہ بیانات کی تاکید میں فرماتے ہیں ''؛فلوان الخلق کلھم جھدوا ان ینفعوک بشیء لم یکتب لک ماقدروا علیہ ولو جھدواان یضروک بشیء لم یکتبہ اللہ علیک ما قدروا علیہ ''اگر تمام انسان تجھے کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں جسے خدائے متعال نے تیرے مقدر میں نہیں لکھا ہے تو وہ اس کی قدرت نہیں رکھتے ہیں،اسی طرح اگر تمام لوگ تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں جسے خدا نے تمھارے لئے نہ لکھا ہو تو وہ ہرگز ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔اگر خدائے متعال کی مرضی وارادہ کسی کام سے متعلق ہو تو، دنیا کی تمام قابل تصور طاقتیں اسے روک نہیں سکتی ہیں: (واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لایعلمون[1]) اور اللہ اپنے کام پر غلبہ رکھنے والا ہے یہ اور

[1] یوسف۲۱

بات ہے اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے. ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے: (و ان یمسسک اللہ بضرّ فلا کاشف لہ الاّ ھو وان یمسسک بخیر فھو علی کل شیء قدیر[1]) اگر خدا کی طرف سے تم کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کے علاوہ کوئی ٹالنے والا بھی نہیں ہے اور اگر وہ خیر دے تو وہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے ۔اس لحاظ سے آخری فیصلہ اور قطعی وحتمی ارادہ خدائے متعال کے ہاتھ میں ہے ،پس اگر کوئی چیز چاہتے ہو تو اس سے مانگو جس کے پاس اس قسم کا ارادہ و قدرت موجود ہو ایسے افراد کے پیچھے نہ جاؤ جو تمھارے مانند دوسروں کے گدا ہوں اور وہ کوئی کام نہ کر سکیں اور جان لو کہ اگر خدائے متعال نہ چاہے تو کوئی تمھاری مدد نہیں کر سکتا ہے ۔خدا کی حکیمانہ تدبیر کی معرفت اور یقین کا نتیجہ:آخری نکتہ جس کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابو ذر کو یاد دہانی کراتے ہیں،کہ اگر اپنے اندر یہ وصف پیدا کر لو تو اس کا بہت زیادہ ثمرہ اور فائدہ ہے،وہ نکتہ یہ ہے کہ خدا کے بارے میں اس کی معرفت یقین کی منزل تک پہنچ جائے یقین پیدا کرے کہ جو کچھ خدا نے مقدر کیا ہے وہ واقع ہوگا اور جو مقدر میں نہیں ہے وہ انجام نہیں پائے گا اور جو مقدر ہے وہ لغو اور بیہودہ نہیں ہے بلکہ وہ حکیمانہ تدبیر کے مطابق انجام پاتا ہے ۔

اس معرفت و شناخت سے مومن اطمینان پیدا کرتا ہے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اسکی مصلحت میں ہے،کیونکہ خداوند متعال اپنے بندہ کا ضرر و نقصان نہیں چاہتا ہے بالخصوص اس بندہ کے لئے جس نے اپنا کام خدا کے سپرد کیا ہے ۔ وہ اطمینان کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، وہ مطمئن ہے کہ جو واقع ہوتا ہے وہ حکمت الٰہی کے موافق ہے اور اس کی مصلحت اور نفع میں ہے ،خواہ وہ ظاہراً خوش گوار ہو یا ناخوش گوار ۔وہ جانتا ہے کہ جو کچھ قضاو قدرالٰہی کی بنیاد پر رونما ہوتا ہے اس میں خیر ہے اور تقدیرات الٰہی میں شر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ فطری بات ہے کہ اگر انسان یقین اور معرفت کے اس مرحلہ تک پہنچ جائے کہ دنیا کے تمام حوادث اور روداد کو خیر اور حکیمانہ تدبیر الٰہی کے تناظر میں دیکھے تو جو بھی واقع ہوگا اس پر راضی اور مطمئن ہوگا اور جو بھی واقع ہوگا وہ خیر ہے اور انسان خیر سے خوشحال ہوتا ہے اور ممکن نہیں ہے وہ اسے برا لگے۔البتہ یہ یقین اور و معرفت اور یہ

[1] انعام۱۷

ایمان کا بلند درجہ آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا ہے اور ہرآدمی اس قسم کے ایمان کو آسانی کے ساتھ اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتا ہے اور ہر کوئی یہ لیاقت نہیں رکھتا کہ اس مقام تک پہنچ جائے ۔ جو شخص اس قسم کے مقام تک پہنچنا چاہے اسے چاہئے کہ وہ تہذیب نفس کے لئے سخت کوشش کرے اور ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اپنے نفس پر مکمل طور پر کنٹرول حاصل کرلے اور الہی احکام پر عمل کرنے کے لئے اور اولیائے الہی کی سیرت سے سبق حاصل کرے نیز انسانیت کے عالی مراتب تک پہنچ جائے تاکہ ہمیشہ اپنی مرضی پر خدا کی مرضی کو ترجیح دے اور فطری بات ہے کہ ہر کوئی اس مقام تک پہنچ سکتا ہے،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید کرتے ہیں کہ اگر کسی یقین و معرفت کی منزل کو اس حد تک درک کرلیا کہ حوادث کو اپنی صلاح اور خیر کے تناظر میں دیکھے اور ناخوشگوار حالت پر رنجیدہ و کبیدہ خاطر نہ ہو اور کم از کم تلخ اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں صبر اور بردباری کا مظاہرہ کرتا ہو۔اسے جاننا چاہئے کہ مقدر کے مطابق انجام پانے والے حوادث کے مقابلے میں کمزوری اور بے صبری کا کوئی فائدہ نہیں ہے انسان جس قدر بے تابی کرے ،خدا کی مرضی کے مطابق انجام پانے والا حادثہ انجام پائے گا اور اس کو روکنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں اگر اس کے لئے کوئی مصیبت پیش آئے ،کسی بیماری یا فقر میں مبتلا ہوجائے ،زلزلہ یا سیلاب کے نتیجہ میں اس کا سب کچھ لٹ جائے ،یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے،تو وہ صبر کرے اور برداشت کو اپنا پیشہ قرار دے ،تو اس صورت میں وہ خدا کی عنایتوں کا حقدار و مستحق ہے ۔البتہ اگر کسی حادثہ کی پہلے سے پیش بینی (اطلاع) سے پہلے ہو تو کچھ مقدمات کے بارے میں غور و حوض کر کے اسے روکا جاسکتا ہے تو انسان پر فرض ہے اسے روکے ۔

لیکن بہت سے ترقی یافتہ مما لک بھی تمام امکانات اور جدید ترین وسائل کے باوجود یسے ناگہانی حادثات و آفات سے روبرو ہوتے ہیں کہ جس کی پہلے سے اطلاع اور پیش بینی ممکن نہیں ہوتی اور وہ اسکے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں چنانچہ مشہور ہے کہ جاپان سب سے زیادہ زلزلہ کی زد میں آنے والا ملک ہے ،اور سے مقابلہ کرنے کیلئے مدافعت کرنے والی عمارتیں وہاں تعمیر کی گئی ہیں،متوقع مصیبت اور حادثہ سے متاثر ہونے والوں کی بر وقت امداد کے لئے پہلے سے ہی وسائل آمادہ رکھے گئے ہیں ،کیونکہ وہ

ملک اس سلسلہ میں کافی رکھتا ہے اور وہ لوگ ترقی یافتہ ہیں اور اس پر کافی سرمایہ بھی خرچ کرتےہیں ۔ اس کے باوجود مشاہدہ کیا گیا ہے کہ دنیا ایک سب سے افسوس ناک اور خطر ناک زلزلہ جاپان میں آیا اور اس کے نقصانات ان نقصات سے کہیں زیادہ تھے جو دوسرے پسماندہ ممالک میں زلزلوں سے ہوا کرتے ہیں، پس حوادث مقدر ہیں اور رونما ہوتے ہیں ۔ لوگ اس سے بے خبر ہیں ۔ ان حوادث کا امر ایک ایسے مدبر عالم کے ہاتھوں میں ہے کہ کائنات اسکی تدبیر سے چلتی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ کس فارمولے کے مطابق ،کب اور کہاں زلزلہ آنا چاہیئے ۔ اور کہاں سیلاب آنا چاہیئے ۔ ممکن ہے خدا نہ کرے ہمارے لئے بھی کوئی مصیبت نازل ہو جائے ،اب اگر ہم خدا کی حکیمانہ تدبیر اور خدا کے احسن نظام پر یقین اور معرفت رکھتے ہیں تو ناراض نہیں ہوں گے،کیونکہ ہم الہی تدبیروں پر حسن ظن رکھتے ہیں اور سب کو خیر اور اپنی اصلاح کے ذریعہ جانتے ہیں .جب ہم کمی اور کسی کمزوری کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس سے ناراض ہوتے ہیں ، لیکن اگر ہم اسے سو فیصدی اپنی مصلحت اور بھلائی میں دیکھیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس سے ناراض ہو جائیں اور ہمیں غصہ آئے ۔

ممکن ہے کوئی انسان تکلیف اور بیماری کی شدت سے تڑپے اور درد اسے فرصت نہ دے، لیکن جب دیکھتا ہے وہ بیماری اس کے حق میں بہتر ہے اور اس کے لئے صلاح کا باعث ہے تو اس کی آؤ بھگت کرتا ہے بالکل اسی طرح کہ جس کا دانت خراب ہو گیا ہے اور اسے نکالوانا چاہتا ہے ۔ وہ دانت نکالنے کے لئے خود پیشکش کرتا ہے اور اس کے لئے پیسے بھی صرف ہے،کیونکہ وہ اس کام کو اپنی مصلحت میں جانتا ہے اور کبھی ناراض نہیں ہوتا ہے کہ اس کا کیوں دانت کو نکالا گیا،کیونکہ وہ جانتا ہے خراب شدہ دانت بدن کے لئے مضر ہے اور اسے نکالا جانا چاہیئے ۔ کبھی انسان ایسی تکلیف اور بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے علاج کرنے کے لئے کسی دوسرے ملک جانے کی ضرورت ہوئی ہے اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے ، یا اپنی صحت یابی کے لئے مجبور ہوتا ہے اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم ہو جائے اور اس کے معالجہ کے لئے پیسے بھی خرچ کرتا ہے یا جس کے کسی اعضاء کے کاٹے جانے پر راضی ہوجاتا ہے، لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ مقام رضا تک پہنچا ہے اور دل سے اس کے لئے آمادہ ہے جو اسے درپیش ہے

اور کسی قسم کا شکوہ نہیں رکھتا ہے ۔ بلکہ ممکن ہے پیش آنے والی چیز سے گلہ مند ہو ،اگر جرأت ہوتیتو خدا سے شکوہ کے لئے لب کشائی کرتا ۔چنانچہ ضعیف الایمان افراد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اپنی طاقت کو کھو دیتے ہیں اور حتی خدائے متعال سے بھی شکوہ کرتے ہیں. اسی مطلب کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں '': فان استطعت ان تعمل للہ عز وجل بالرا والیقین فافعل وان لم تستطع فان فی الصبر علی ماتکرہ خیراً کثیراًوان النصر مع الصبر والفرج مع الکرب وان مع العسر یسرا '''،پس اگر تم اپنی رضا و یقین کے ساتھ خدا کے لئے کوئی کام انجام دے سکتے ہو تو اسے انجام دو اور اگر انجام نہیں دے سکتے تو جس چیز سے تمہیں نفرت ہے اس پر صبر و تحمل کرنے میں تمھارے لئے فراوان خیر ہے ۔کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور آسائش و آسودگیغم واندوہ کے ساتھ ہے ۔ بیشک ہر دشواری کے ساتھ آسانی بھی ہے۔''

اگر مقام رضا تک تمہارے لئے پہونچنا ممکن ہوتا کہ البتہ رضا یقین کے سایہ میں حاصل ہوتی ہے اور جب تک انسان مقام یقین تک نہیں پہونچتاہے وہ مقدرات الٰہی پر راضی نہیں ہو سکتا ،تم کتنے خوش قسمت ہو کہ انسانیت کے بہترین مقام تک پہونچ گئے .اس لئے انسان کا بہترین مقام اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ تقدیر ات الٰہی پر راضی ہواور تہہ دل سے خوش ہو اور کسی قسم کا گلہ وشکوہ نہ کرے ۔پس کوشش کرو کہ تمھاری رفتار رضا و یقین کی بنیاد پر ہو۔

اس صورت میں تلخ و شریں حوادث کے لئے اپنے آپ کوآمادہ کر سکتے ہو اور کسی قسم کی ناراضگی اور شکوہ سے عاری ہو ۔ لیکن اگر اس حد تک نہیں پہنچے اور ناراضگیوں اور ناخوشگوار حوادث کے بارے میں اپنے لئے توجیہ نہیں کر سکتے کہ جس کی وجہ سے راضی ہوسکو،تو سختیوں کے مقابلہ میں صابر بننے کی کوشش کرو ، گریہ وزاری نہ کرو اور اپنے آرام وسکون کی حفاظت کرو .اگر ان مشکلات کے بارے میں دل سے راضی نہ ہو سکے ،تو جان لو کہ یہ تمھاری معرفت کی کمی ہے کہ مقام رضا تک نہیں پہونچ سکے ہو،کم از کم بے تابی نہ کرو اس لئے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اپنی عقل وایمان کی حفاظت کرو ۔ جان لو کہ اگر تم نے مصیبتوں اور مشکلات کے مقابلہ میں صبر کیا تو خدائے متعال تمہیں فراوان خیر عنایت کرے گا ۔

انسان کی معنوی بلندی اور تکامل میں مشکلات کا رول: اس کے بعد اپنی بات کی تاکید فرماتے ہیں :صبر و شکیبائی کے سائے میں کامیابی ہے اور ہر غم واندوہ کے ساتھ راحت و آسودگی ہے اور ہر سختی کے ساتھ آسانی بھی ہے ۔قرآن مجید میں خدائے متعال بھی فرماتا ہے:(فان مع العسر یسرا ۔ان مع العسر یسرا[1]) ہاں زحمت کے ساتھ آسانی بھی ہے ۔بیشک تکلیف کے ساتھ سہولت بھی ہے ۔قرآن مجید میں بہت کم کوئی مطلب دوبار تکرار ہوا ہے اور وہ بھی صرف تاکید ''ان'' سے،یہ خدائے متعال کی اس مطلب کے بارے میں توجہ اور عنایت کی دلیل ہے ۔خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ میں فرما تا ہے :ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے ،یہ نہیں فرماتا ہے کہ ہر سختی کے بعد آسانی ہے ،گویا آسانی خود سختی کے اندر پوشیدہ ہے۔خدا ئے متعال سورہ ''انشراح'' میں محبت آمیز لہجہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہ جو گویا آزردہ خاطر ۔تسلی دیتا ہے اور آپ کو آرام و اطمینان دلاتا ہے کہ کس طرح خدائے متعال نے ان کے کندھوں سے سنگین بوجھ کو اٹھا کر،دشواریوں کو آسانیوں میں تبدیل کیا ہے ۔

اس کے بعد فرماتا ہے :ہر رنج و سختی کے ساتھ آسانی ہے ،پس اگر فراغت ملے تو اپنے آپ کو پھر سے زحمتوں میں ڈالنا اور کوشش کو پھر سے شروع کرنا . حقیقت میں خدائے متعال اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سختیاں اور مصیبتیں انسان کے کمال و پیش رفت کا مقدمہ ہیں ،جو اس کے لئے توانائی حاصل کرنے کا سبب بنتی ہیں ۔ اس لحاظ سے مصیبتیں اور سختیاں انسان کے تکامل و ترقی کے لئے ضروری ہیں: (لقد خلقنا الانسان فی کبد[2]) ''بیشک ہم نے انسان کو رنج و مشقت میں رہنے والا بنایا ہے ۔''

یہ آیہ شریفہ انسان کی خلقت اور تکامل ترقی میں رنج و مصیبت کے اہم رول کو بیان کرتی ہے ۔اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو خدائے متعال جو مہربانیوں اور رحمتوں کا سرچشمہ ہے اور اپنے بندے کے لئے ہمیشہ خیر و سعادت چاہتا ہے اسے رنج و مصیبت سے دوچار نہ کرتا ۔ مذکورہ مطالب کے علاوہ ،خدائے متعال اپنے بندوں کی متواتر آزمائش کرتا ہے تاکہ شائستہ افراد کی پہچان کی جا سکے ،اس سلسلہ میں خدائے متعال نے انسانوں کی تربیت و پرورش کے لئے دو پروگرام مقرر فرمائے ہیں:عبادات کا تشریعی

---

[1] انشراح،۵۔۶
[2] بلد،۴

پروگرام اور مصائب ومشکلات کا تکوینی پروگرام ۔بالآخر جو احکام الٰہی کی صحیح معنوں میں پیروی کرتے ہیں اور سختیوں اور دشوایوں کو دل وجان سے قبول کرتے ہیں،ان کی رحمت اور معرفت الٰہی کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے:(ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس و الثمرات وبشر الصابرین ۔الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون[1])اور ہم یقیناً تمھیں تھوڑے خوف تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر!ان صبر کرنے والوں کوبشارت دیں جو مصیبت پڑنے کے بعد یہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں : ((ان اللہ عزو جل لیتعاہد المومنین بالبلاء کما یتعاہد الرجل اہلہ بالہدیۃ من الغیبۃ[2])خدائے متعال اپنے بندہ پر مہربانی کرتاہے اور اس کے لئے بلاؤں کو تحفہ کے طور پر پیش کرتاہے، اسی طرح جیسے ایک مرد سفر سے اپنے بال بچوں کے لئے تحفے لاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مسلمان کے گھر مدعو ہوئے۔آپؐجب میزبان کے گھر میں داخل ہوئے تو ایک مرغی کودیکھا کہ جس نے دیوار کے اوپر انڈا دیا تھا اور وہ انڈا ایک میخ پر رک گیا اور زمین پر نہیں گرا ،رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب میں پڑگئے۔میزبان نے کہا :آپؐنے تعجب کیا؟اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبری کے لئے مبعوث فرمایا ہے،مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچا ہے!رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جیسے یہ جملہ سنا،آپؐ کھڑے ہوگئے اور اس شخص کے گھر میں کھانا نہیں کھایا اور فرمایا :جس نے کبھی کوئی مصیبت نہ دیکھی ہو اس پر خدا کی مہربانی نہیں ہوتی ہے!اس بنا پر اگر بلاؤں کو صحیح نگاہ سے دیکھا جائے،تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ سختیاں اور بلائیں تربیت اور بیداری کا رول انجام دیتی ہیں ۔ مشکلات اور سختیاں سوئے ہوئے اور بے حرکت انسانوں کو بیدار و ہوشیارکر دیتی ہیں اور ان کے عزم وارادہ کو ابھارتی ہیں اور حقیقت میں سختیاں انسان کواستقامت و مقامت کی قدرت بخشتی ہیں۔انسان کی دنیوی زندگی کی خاصیت سختیوں کے ساتھ ہے،اس میں جس قدر انسان کی قوت مقاومت میں اضافہ ہوگا

---

[1] بقرہ،۱۵۵۔۱۵۶
[2] اصول کافی ،ج۳ص۳۵۴

اسی اعتبار سے اس کے تکامل میں اضافہ ہوتا جائیگا اور رفتہ رفتہ اس کی فطانت اور پوشیدہ قابلیتیں ظاہر ہوتی جائیں گی اور یہ لطف وعنایت الٰہی کی دلیل ہے۔ مولانا رومی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

گندمی را زیر خاک انداختند پس ز خاکش خوشہ ہا بر ساختند

بار دیگر کوفتند ش ز آسیا قیمتش افزون و نا ن شد جانفرا

با ز نان را زیر دندان کوفتند گشت عقل وجان وفہم سود مند

(گندم کے ایک دانہ کوزیر خاک رکھا جاتا ہے ،پھر اس کے خوشے نکل آتے ہیں،پھر اس گندم کے دانے کو چکی میں پیسا جاتا ہے ،اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے پھر وہ روٹی میں تبدیل ہوجاتے ہیں، پھر اس روٹی کودانتوں سے چبایا جا تاہے،پھروہ فائدہ بخش عقل،جان وشعورمیں تبدیل ہوجاتے ہیں)(سیجعل اللّٰہ بعد عسر یسرا[1])۔ ''عنقریب خدا تنگی کے بعد وسعت عطا کرے گا ''۔یہ آیت ان افراد کے لئے قابل توجہ ہے جن کی ظرفیت کم ہے اور جب وہ سختی اور مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو نا امید ی سے دوچار ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں سب کچھ لٹ گیا ہے۔

حتی، دعا اور اولیائے الٰہی سے تو سل اورخدا سے التجا کی طرف بھی رخ نہیں کرتے اور اپنے لئے تمام دروازے بند دیکھتےہیں .مومن کو مصیبتوں کے مقابلہ میں بیقرار ہو کر اپنے ہوش نہیں کھونا چاہئے،بلکہ اسے اپنے آرام وسکون کی حفاظت کرنی چاہئے اور جاننا چاہئے کہ ہر سختی کے بعد ایک آسانی ہے اور خدائے متعال نے ایسا مقدر نہیں کیا ہے کہ اس کا بندہ ہمیشہ سختیوں سے مقابلہ کرتا رہے اور پوری زندگی سختیوں اور مشکلات میں گزارے ۔بلکہ اگر خدا ئے متعال سختی کو قرار دیتا ہے تو اس کے بعد آرام وآسائش کو بھی قرار دیتا ہے اور اس کے انتظار میں رہنا چاہئے۔قناعت اور لوگوں سے بے نیازی:اس بحث کے اختتام پر پیغمبر اسلام صلی اللّٰہ

[1] طلاق،۷

علیہ وآلہ وسلم حدیث کے اس حصہ میں فرماتے ہیں'':یا اباذر!استغن بغنی اللہ یغنک اللہ''''اے ابو ذر !خدا داد دولت کے توسط سے بے نیازی کی جستجو کرو تاکہ خدا تجھے بے نیاز کردے۔''گویا اس بیان سے پیغمبر اسلام ﷺ کا مقصود جناب ابوذرؓ کے لئے صحیح طور پر واضح نہیں تھا۔چونکہ معلوم ہے کہ جو شخص دولت حاصل کرتا ہے وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے اورکسی کی تلاش میں نہیں جاتا اور اس میں کوئی مفہوم نہیں ہے کہ ایسے شخص کو کہا جائے کہ اپنے کوبے نیاز شمار کرواور کسی کی طرف اپنا ہاتھ نہ پھیلاو۔پس قطعا پیغمبر اکرم ﷺ کے کلام میں کوئی راز مضمر ہے اور اس میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے ۔ اسی جہت سے آنحضرت ﷺ کے مقصود کے بارے میں جناب ابوذرؓ سوال کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ جواب میں فرماتے ہیں'':غداء ۃ یوم و عشاء لیلۃ،فمن قنع بمارزقہ اللہ فھو اغنی الناس''''(خدا کی دولت کا مقصود جس سے تم اپنے کو دوسروں سے بے نیاز سمجھتے ہو) تمہاری شب وروز کی غذا ہے جو شخص خدا کی دی ہوئی ہرچیز پر قناعت کرے وہ غنی ترین لوگوں میں سے ہے۔''

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:جب آج دن کے لئے تیرے پاس غذا موجود ہے تو دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاو اور اس فکر میں نہ رہوکہ کل کیا ہوگا ۔جو کچھ اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اسی پر قناعت کرو اور اس کے علاوہ اپنے کو بے نیاز جانو اور دل میں دوسروں کی نیازمندی کا تصورتک نہ کرو اگر نیاز مندی کا احساس کیا اور کل کی بہبودی کی فکر میں رہے تو خود کو دوسروں کا محتاج بنا یا ہے اور کل کی بہبودی کے لئے وسائل حاصل کرنے کی غرض سے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوگے اور اس طرح ذلیل ہوگے،کیونکہ جو بھی دوسروں کے سامنے اپنی نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے ۔

لہٰذا اگر عزیز اور سربلند رہنا چاہتے ہو اسی رزق پر قانع وراضی رہو جسے خدائے متعال نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے ۔ اگر انسان طمع اورلالچ میں مبتلا ہوا،تو جس قدر آرام وآسائش کے وسائل اس کے لئے فراہم ہو جائیں،پھر بھی وہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کیا کروں تاکہ اپنے مال ودولت میں اضافہ کروں اور اپنے لئے مزید و سائل و امکانات حاصل کروں ۔وہ اس طرز تفکر کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کودوسروں کا محتاج پاتا ہے اور اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت پیدا نہیں کرتاہے تاکہ کمالات انسانی کے بارے میں غورو

فکر کرے ۔ کہ کس لئے پیدا کیا گیا ہے ،اپنی آخرت کے لئے کیا کیا ہے ۔ وہ دنیا میں طمع اور لالچ کے دام میں گرفتار ہوتا ہے اور ایک لمحہ بھی فراغت وآسائش سے نہیں گزار تااور بالآخر زاد راہ کے بغیر خالی ہاتھ اس دنیاسے رخت سفر باندھتا ہے ۔ اگر انسان آج کے رزق پر مطمئن ہو جائے اور خود کو بے نیاز کرلے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، تو وہ اپنا وقت اپنی ترقی ،بلندی اور کمال حاصل کرنے کے لئے صرف کر سکتا ہے ۔ اپنے قناعت کے سرمایہ سے کہ جس کو اس نے ذخیرہ کر رکھا ہے اسے مواقع فراہم کرلے تا عبادت، تحصیل علم ،جہاد ،خدمت خلق بالآخر خدا کی مرضی کے مطابق اور اپنی آخرت کے لئے ہر مفید کام کو انجام دے ۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں'':اظہر الیاس من الناس فان ذلک من الغنا[1] ۔ '''' لوگوں سے ناامیدی کا احساس ظاہری کرو،کیونکہ یہ حالت غنی اور بے نیاز ہونے کا نتیجہ ہے۔''

اور حضرت امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں'': اشرف الغنی ترک المنی[2]'''' بالا ترین بے نیازی طولانی آرزؤں سے دوری ہے'' انسان کو لوگوں کے پاس موجودہ چیزوں سے زیادہ اس پر امید رکھنی چاہئے جو خدا کے پاس موجود ہے اور یہ نفس و خلق سے بے نیازی تب تک حاصل نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ انسان خدائے متعال پر اطمینان ،اس پر توکل، دوسروں پر اعتماد نہ کرنا اور نفع و نقصان کے خدا کے ہاتھ میں ہونے کا یقین پیدا نہ کرے اور جان لے کہ جو بندوں کے حق میں ہے اسے خدا انجام دیتا ہے ،اور جوان کی صلاح میں نہیں ہے اس سے انھیں باز رکھتا ہے ،اس صورت میں بندہ دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے ،حتی اگر اس کا ہاتھ مال دنیا سے خا لی بھی ہوتو بھی اپنے آپ کودولت مند تصور کرتاہے ،چنانچہ نبی اکرم ؐ فرماتے ہیں: ''لیس الغنا فی کثرۃ العرض انما الغنی غنی النفس[3]'' '' دولت مندی اور غنی ہونازیادہ مال میں نہیں ہے اور بیشک دولت مندی نفس کی بے نیازی میں ہے۔ ''

---

[1] بحار الانوار ،ج ۷۱،ص ۱۸۵
[2] نہج البلا غہ (فیض الاسلام)حکمت ، ۳۳، ص ۱۱۰۳
[3] بحار الانوار ج۱۰۳،ص۳۰

سترہواں درس

خدا کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار

خدا کی نظر میں قدر و منزلت کا معیار

''یا اباذر!ان اللہ عز و جل یقول:انی لست کلام الحکیم اتقبل ولکن ھمہ وھواہ،فان کان ھمہ وھواہ فیما احب وارضی جعلت صمتہ حمد الی وذکرا و[وقارا]وان لم یتکلم۔یا اباذر!ان اللہ تبارک وتعالی لاینظر الی صورکم ولا الی اموالکم و اقوالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم۔یا اباذر! التقوی ھہنا،التقوی ھہنا واشار الی صدرہ''چنانچہ ملاحظہ فرمایا کہ گزشتہ بحثوں کا محورتقوی تھا ۔ان بحثوں میں تقوی کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کے آثار کے بارے میں بحث کی گئی ہے اسکے علاوہ تقوی کے اخروی ثمرات کے بارے میں بھی ذکر کیا گیا ہے،چونکہ ممکن ہے بعض افراد تقوی کے بارے میں غلط تصور رکھتے ہوں اور حقیقی تقوی اورظاہر و تصوراتی تقوی کے درمیان فرق نہ کرسکیں،اس لئے اس بحث میں اعمال و رفتار کی قدر و قیمت کے معیار پر بحث کی جائے گی ۔

بہت سے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ افراد کے متعلق ظاہری بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں ۔ اگر کوئی زیادہ عبادت کرتا ہے،ذکر خدا بجالاتا ہے،قرآن پڑھتا ہے اور نماز کو اول وقت انجام دیتاہے،تو اسے باتقوی جانتے ہیں ۔یااگرکوئی طہارت کے بعض مسائل کی زیادہ رعایت کرتا ہے اسے ایک باتقوی شخص کی حیثیت سے پہچانتے ہیں یہ سرسری نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔قدر و قیمت کے معیار کو پہچاننے کے لئے علمائے اخلاق نے کام کے اچھے یا برے ہونے اور انسان کی قدر و قیمت کے معیار کے بارے میں نظری اور بنیادی بحث کی ہے۔ ہم یہاں پر اس کی طرف اشارہ کریں گے:ایمان و عمل صالح اور انسان کی بلندی کا معیارقرآن مجید کی نظر میں انسان کی قدرو قیمت ایمان اور عمل صالح ہے، شاید قرآن مجید کے ایسے کم صفحات ملیں گے جن میں ان دو مسئلوں کاذکر نہ آیا ہو:

(و اما من امن و عمل صالحا فلہ جزاء الحسنی وسنقول لہ من امرنا یسرا[1]) ''اور جس نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیاہے اس کے لئے بہترین جزا ہے اور میں بھی اس کے امور کو اسی پر آسان کردوں گا ۔ ''دوسری جگہ فرماتا ہے: (الا من تاب وٰامن و عمل صالحا فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئا[2]) ''علاوہ ان کے جنھوں نے توبہ کرلی ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیاوہ جنت میں داخل ہوگے اور ان پر کسی طرح کاظلم نہیں کیا جائیگا ۔ ''انسان دو مد مقابل اوصاف اور مقام کا مالک ہے :ان میں سے ایک صاحبان تقوی اور صاحبان فضیلت ،یعنی انبیاء، صالحین، اولیاء، صدیقین اور شہداسے مربوط ہے ۔اسی لئے حضرت آدمؑ مسجود ملائکہ قرار پائے اور اسی وجہ سے انسان ایک ایسے مقام پرپہنچا تا ہے،جہاں پراس کے وصف میں کہا گیا ہے:(فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر[3]) ''اس پاکیزہ مقام پرجو صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں ہے ۔''

اس نقطۂ اور پہلو کے مدمقابل،زوال،پستی اور خداسے دوری ہے جب کوئی انسان خدا کی بندگی و عبادت اور انفرادی واجتماعی فرائض کو انجام دینے،خلاصہ یہ کہ انسانیت کے اصول سے جب انسان پہلو تہی اختیار کرلیتا ہے اور زوال کی راہ پر قدم رکھتا ہے توایک ایسی جگہ پر پہنچ جاتا ہے ،جہاں پر وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتاہے:(ان ہم الاکا لانعام بل ہم اضل[4]) ''یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی گمراہ ہیں ''انسان کے ملکوتی والٰہی پہلوؤں کے لحاظ سے قدر ومنزلت کے بعد اس کا وجود ہے جواس کے دل کا سرچشمہ ہے اور وہاں سے دوسرے اعضاو جوارح پر جاری ہوتا ہے ۔خدا کی یاد میں زبان کا ایک کردار ہے،آنکھ کا قرآن مجید کی تلاوت میں ،کانوں کا حق بات کے سننے میں اور ہاتھ اور پاؤں کا خدا کی راہ میں گامزن ہونے کے لئے ایک اہم رول ہے ۔پس اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کے ذکر کی اس قدرتعریف کی گئی ہے یااگرانسان کے لئے واجب قرار پایا ہے کہ روزانہ پانچ وقت نماز پڑھے ،وہ اس جہت سے ہے کہ انسان کی زندگی کی ذکر خدا کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف اسی راہ

---

[1] کہف، ۸۸
[2] مریم، ۶۰
[3] القمر، ۹۵۵
[4] فرقان، ۴۴

سے قرب الٰہی تک پہنچ سکتا ہے۔اسلام اور تمام الٰہی ادیان انسان کیلئے دو متضاد اقدار، مثبت ومنفی کے بے حد قائل ہیں ۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جوانسان کے معمولی معیا روں سے قابل درک نہیں ہیں اور صرف الٰہی معیاروں سے قابل توجیہ ہیں ۔اس کے علاوہ اسلام نہ صرف انسان کی مجموعی عمر کے لئے اس قسم کی قدر وقیمت کا قائل ہے بلکہ اس کی عمر کے گھنٹوں کے لئے بھی اس قدر واہمیت کا قائل ہے یعنی اسلام کہتا ہے : انسان ایک گھنٹے کے اندر اپنے وجودی قدر ومنزلت کو لامتناہی منزلتک پہنچا سکتا ہے،وہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو خوش قسمت بنا سکتا ہے اور ابدی و بے نہایت سعادت تک پہنچ سکتا ہے اور ایک گھنٹے کے اندرشقاوت اور بے نہایت بد قسمتی کو بھی اپنے لئے فراہم کرسکتا ہے۔

پس اسلام کی نظرمیں قدر ومنزلت کا معیار انسان کی صلاحیت،اور خود کی شائستگی اوراسکی صالح نیت ہے اورحتی اسلام کی نظر میں ایک شخص کا معاشرے کے لئے مفید ہونا قدرومنزلت کامعیار نہیں ہے ،اگر چہ معاشرہ فرد کے لئے جس اہمیت کا قائل ہے وہ اس فرد کا معاشرے کے لئے مفید ہونے کے اعتبار سے ہے ،اسلام نہ صرف ایسے فرد کے لئے قدر وقیمت کا قائل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے منفی تصور رکھتا ہے،چونکہ وہ شخص اندر سے فاسد ہے اور اپنے دلفریب وپسندیدہ ظاہر کے پیچھے ایک گری ہوئی اور پست وآلودہ ذہنیت رکھتا ہے۔

اس بنا پر ممکن ہے ایک فرد معاشرے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو،لیکن خود بد بخت اس عالم دین کے مانند جولوگوں کودینی معارف سکھاتا ہے اور لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں اور سعادت حاصل کرتے ہیں،لیکن وہ خودبد بخت ہے چونکہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کر تاہے ،اس لئے جہنم میں جائے گا ۔یا اس دولت مند کے مانند جو اپنامال معاشرے پر خرچ کر تاہے اور عوام کی بہبودی کے خدمت انجام دیتا ہے ،لیکن اس کا مقصد شہرت حاصل کر نا اور لوگوں کے درمیان سر بلند ہوناہے اس لئے یقینااس کا کام اسلام کی نظر میں کوئی قدرو قیمت نہیں رکھتا ہے ۔جو چیز انسان کے وجوداور اس کے اعمال کو قدرو قیمت بخشتی ہے،وہ اس کا ابدیت اور عالم بے نہایت سے رابطہ ہے یہ رابطہ ایک قلبی رابطہ ہے اور نیت و خداسے دل کی توجہ کے ذریعہ حاصل ہو تا ہے۔

پس اگر خدا کے لئے کوئی کام انجام دیا جاتا ہے،اس کی قیمت بے نہایت ہے،خواہ ظاہر میں وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا ۔ فطری بات ہے کہ جس قدر خدا کے بارے میں انسان کی معرفت زیادہ ہوگی اور کام کو اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائیگا اسی اعتبار سے ،اس کی قدر وقیمت زیادہ ہوگی ،اس کے برعکس جس قدر اس کا خلوص کم تر ہوگا اوراس کی توجہ لوگوں کی طرف اور ان کا دل جیتنے کے لئے اور شہرت وجاہ طلبی پر مرکوز ہوگی اس کی اہمیت اور وقعت کم ہوتی جائیگی اگر چہ حجم کے لحاظ سے عظیم بھی ہو ،نتیجہ کے طور پر جو چیز انسان کی زندگی کو قدر واہمیت بخشتی ہے ،وہ حقیقت میں خدا کی طرف توجہ ہے ۔اگر انسان خدائے متعال کی یاد میں ہو تواس کے لئے کام انجام دے سکتا ہے،اس کے بغیر ممکن نہیں ہے وہ خدا کے لئے کام کرے اور نتیجہ کے طورپر اس کے کام کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوگی۔

اسلام کی نظر میں مفید اور قابل قدر مشغلے:بہت سے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ ہر وہ کام جو معاشرے کے لئے مفید ہے،اس کی معنوی قدر قیمت بھی زیادہ ہے اور اس کام کا انسان کی معنوی بلندی اور روحی کمالات پر بہت زیادہ اثر ہو۔وہ تصور کرتے ہیں کہ وہ کام خدا کے لئے یا خدا کی راہ میں ہے جو لوگوں کے لئے سود مند ہو اور اس لحاظ سے وہ زیادہ ترکام کے حجم کو اہمیت دیتے ہیں ۔کہتے ہیں کہ فلاں نے کس قدر اپنا سرمایہ خرچ کیا ہے اور ہسپتال یا مسجد کی تعمیر کرائی ہے ۔یہ تصور اور نظریہ بہت ہی سطحی ہے۔

صحیح ہے کہ اچھے کام کے معیاروں میں سے ایک یہ ہے کہ کام معاشرہ اور لوگوں کے لئے مفید ہو،لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہر اچھا کام جو حسن فعلی رکھتا ہے ،وہ انجام دینے والے کے لئے کمال کا سبب بنے ،بلکہ وہ کام کمال کا سبب بنتا ہے جو حسن فعلی کے علاوہ وہی عمل کی نیکی ہے حسن فاعلی بھی رکھتا ہو ۔یعنی فاعل کی نیت اور اس کے کام کرنے کا مقصد خدا اور اس کی مرضی کے لئے ہو۔اسلام کی نظر میں کام کا خدا کے لئے ہونے اورخدا کی راہ میں ہونے اور اسکی انسان کی بلندی وکمال میں اس کا موثر ہونا ،اس میں نہیں ہے کہ وہ کام صرف لوگوں کے لئے سود مند ہو۔بلکہ خدائی کام کا معیار یہ ہے کہ انسان اس کام کوخدا کی مرضی کے لئے انجام دے اورخدائی محرک اسے وہ کام انجام دینے پر مجبور کرے ۔خدا کی راہ میں ہونا یعنی کام ایک ایسی راہ اور جہت میں قرار پائے جس کی

انتہا خدائے متعال ہو ،اور جب تک مقصد و ہدف خدائے متعال نہ ہو اسے خدائی راستہ نہیں کہا جاسکتا ۔اگر مقصد لوگوں کی توجہ حاصل کرنا ہے ،تو راہ بھی لوگوں کی توجہ جلب کرنے کیلئے ہے۔اس وقت کام خدا کے لئے اور اس کی راہ میں انجام پاتا ہے کہ فاعل کی توجہ اس کو انجام دیتے وقت خدا کی طرف ہواور یہ اس کے لئے ممکن ہے جو خدائے متعال کو پہچانتا ہواور اس کے تقرب کی قدر و قیمت کو سمجھتا ہو۔اگر چہ کام کے نیک ہونے اور کام کے حسن کا ایک معیار، اسکا لوگوں کے لئے سود مند ہونا بھی ہے،اور جو بھی اپنے کام سے معاشرے کی زیادہ خدمت کرے گا،اس کا کام نیک ہے ۔ ہمیں قرآن مجید کی آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہبعض کام جو ہماری نظر میں اچھے ہیں،نہ صرف قرآن مجید نے ان کی تمجید نہیں کی ہے ،بلکہ انھیں پست اور ناپسند کے طورپر بیان کیا ہے۔

من جملہ ان میں سے دوسروں کوانفاق کرنا ہے کہ ہم اسے نیک اور اچھے کاموں میں شمار کرتے ہیں اور اگر کسی کو رفاہی اور امدادی امور انجام دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تواس کی ستائش کرتے ہیں جبکہ بعض خالص نیت نہ رکھنے والے انفاق کرنے والوں کی قرآن مجید نے سرزنش کی ہے اور وہ قیامت کے دن پشیمان ہوں گے اورکف افسوس ملیں گے کہ کیوں اپنے مال کولوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہم نے خرچ کیا ۔ ممکن ہے دنیا میں لوگ انھیں ستائش کریں ،اس کی تصویر کو درودیوار پر نصب کریں یا حتی اس کا یادگاری مجسمہ بھی بنائیں ،تاکہ سب لوگ اسے ایک خیر کے عنوان سے پہچان لیں۔

لیکن قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے:(یا ایھا الذین آمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والأذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس[1]) ''ایمان والو !اپنے صدقات کومنت گزاری اور اذیت سے برباد نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو دنیا والوں کو دکھانے کے لئے صرف کرتا ہے۔ ''اگر انفاق، ریااور خودنمائی کی غرض سے ہو خدا اور معاد پر ایمان کی بناء پر نہ ہو،تو اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے ۔اس ریا کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جوبیج کو زرخیز زمین کے بجائے ایک ہموار پتھر پر رکھ کر اس کے اوپر تھوڑی سی

---

[1] بقرہ ،۲۶۴

مٹی ڈالتا ہے اور منتظر رہتا ہے سبز ہوکر اس سے پھل حاصل ہوگا! وہ اس سے غافل ہوتا ہے کہ ایک تیز ہوا یا بارش سے وہ مٹی دُھلجائے گی !اس بنا پر اس قسم کا انفاق کرنے والوں کو،ان کے خرچ کئے گئے پیسوں اور محنتوں کے عوض میں کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ ان کا عمل خدا اور آخرت پر ایمان کی بنیاد نہیں تھا ۔یہ لوگ خود نمائی،دوسروں سے مقابلہ اور رقابت نیز اپنی نیک نامی اور شہرت کے لئے انفاق اور معاشرے میں خدمت کرتے ہیں کہ لوگ ان کی ستائش کریں ۔ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر فائز ہے، لوگوں کا نمائندہ ہے، تو یہ اس لئے خدمت کرتا ہے کہ لوگ اسے دوسرے انتخاب میں ووٹ دے کر پھر سے انتخاب کریں یا اگر کوئی انتظامی منصب رکھتا ہے تو اس لئے خدمت کرتا ہے کہ اسے ترقی ملے ۔پس اس قسم کے افراد کے انفاق کی خدا کے نزدیک ذرہ برابر قدر و قیمت نہیں ہے اوراس کا اخروی سعادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے ۔

اس بنا پر اچھے اور شائستہ کام کا ملاک جو انسان کے لئے آخرت میں سعادت کا سبب بنے یہ ہے کہ وہ کام ایمان کے ساتھ ہمراہ ہو اور اس کا سر چشمہ ایمان ہو ۔ اس جہت سے خدائے متعال قرآن مجید میں ایمان کو عمل صالح کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وبشر الذین آمنوا وعملوا الصالحات ان لہم جنات تجری من تحتہا الانہار[1]) ''پیغمبر !آپ ایمان اور عمل صالح والوں کو بشارت دیں کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔'' (والذین امنوا وعملوا الصالحات اولئک اصحاب الجنۃ ہم فیہا خالدون[2]) ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیا وہ اہل جنت ہیں اور وہیں ہمیشہ رہیں گے''

خدائے متعال دوسری جگہ فرماتا ہے: (من عمل صالحا من ذکر او انثی وہو مومن فلنحیینہ حیواۃ طیبۃ ولنجزینہم اجرہم باحسن ماکانوا یعملون[3] (''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انھیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔'' اس بنا پر ایمان و عمل کے درمیان رابطہ محفوظ ہونا چاہئے

[1] بقرہ ۲۵
[2] بقرہ۸۲
[3] نحل،۹۷

،کیونکہ صرف وہ عمل خدا کی طرف پہونچنے والا ہو سکتا ہے،جس کا سر چشمہ خدا پر ایمان واعتقاد ہو۔ (الذی یوتی مالہ یتزکی وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی ۔الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی[1]) ''جو اپنے مال کو (خدا کی راہ میں)دے کر پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے۔جبکہ اس کے پاس کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کی جزا دی جائے، سوائے یہ کہ وہ خدائے بزرگ کی مرضی کا طلبگار ہے''وہ انفاق کرتاہے.زکوۃ دیتا ہے ،لیکن اس کاارادہ خود نمائی، لوگوں کی توجہ جلب کر نا،اور ان سے تشکر اور قدر دانی حاصل کرنا نہیں ہوتا ہے حتی اگر لوگ اسے برا بھلا بھی کہتے ہیں ، وہ اپنے کام سے ہاتھ نہیں کھینچتا ہے چونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ انفاق کرو لہذا وہ انفاق کرتا ہے:(و یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا[2] (((یہ اس کی محبت میں مسکین،یتیم،اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں))مذکورہ آیت کے ضمن میں فرماتا ہے: (انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا[3]) (کہتے ہیں) ''ہم صرف اللہ کی مرضی کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں ورنہ نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ''

پس اگر ہمارے عمل کا سر چشمہ ایمان ہو اور وہ کام خدا کے لئے ہو ،تو صالح ہوتا ہے،لیکن اگر تقرب الٰہی کی نیت کے بغیر انجام دیا جائے اور غیر خدا کی نیت کے ساتھ ہو ، تو ایک بے روح اور مردہ جسم کے مانند ہے،جس کے ڈھانچے کو ہم نے بنایا ہے ،لیکن روح نہیں رکھتا ہے تاکہ تحول اور ترقی کا سبب بنے ،اور طبعی طور پر بے روح بدن کیطرح گلکر نابود ہوجاتاہے ۔پس جس عمل میں روح نہ ہو،نہ صرف وہ نمو نہیں کرتاہے،بلکہ خرابیاں بھی ایجاد کرتاہے ۔ اس لئے یہ طرز تفکر صحیح نہیں ہے کہ جوبھی کام عام لوگوں کے مفاد میں ہو اور معاشرے کے لئے خدمت شمار ہوتا ہے اسے ہم اچھا جان لیں اور اس کے ساتھ اس کی نیت اور اس کے مقصد کو مد نظر نہ رکھیں۔مذکورہ مطالب صرف عام لوگوں سے مخصوص نہیں ہیں ۔بلکہ بعض تعلیم یافتہ بھی عمل کی شائستگی اور اچھا ئی اس میں جانتے ہیں کہ ظاہری عدالت کی بنیاد پر عام لوگوں کی خدمت اور منفعت کے لئے انجام دیا جائے ،جبکہ عمل کی خوبی اوراچھائی اور انسان کی سعادت کے لئے موثر ہونے کا معیار دوسری چیز ہے۔ظاہر پرست اور سرسری نظر رکھنے والا انسان کام

---

[1] لیل، ۱۸،۲۰
[2] انسان، ۸
[3] انسان، ۹

کے حجم اوراس کے اجتماعی اثرات کو اپنے فیصلہ کامعیار قرار دیتا ہے ،لیکن یہ الٰہی معیا ر نہیں ہے اورخدائے متعال کام کے حجم پر نظر نہیں رکھتا ہے ۔وہ نہیں دیکھتا ہے کہ کس قدر پیسہ خرچ ہواہے، کس قدر توانائی صرف ہوئی ہے،بلکہ وہ دیکھتا ہے یہکام کتنا خدا کے لئے انجام دیا گیا ہے اور اسی اعتبار سے وہ کام انسان کی سعادت کا باعث ہوگا ۔لیکن عبادات میں قصد قربت کی شرط سے مراد یہ ہے کہ اگر ذرہ برابر بھی نیت میں غیر خدا شامل ہو جائے یعنی اس عمل میں کسی کو خدا کا شریک قرار دے ،تو وہ عمل باطل ہو جاتا ہے ۔تعبدی واجبات اور مستحبات اور وہ اعمال جن میں قصد قربت ضروری ہے ،وہ صرف خدا کے لئے انجام دیا جائے اور اگر انسان نے ایسے کسی کام میں خودنمائی کی ،اور لوگوں کی خوشنودی کے لئے آداب کی رعایت کی، نیزنماز کو آب وتاب کے ساتھ بجا لائے اور مقصد لوگوں کی توجہ جلب کر نا ہو،تونہ صرف اس کا عمل باطل ہے،بلکہ حرام ہے اور سزا کا بھی مستحق ہے ۔

حتی عمل کا وہ حصہ جو خدا کے لئے انجام دیا گیا ہے، وہ بھی قبول نہیں ہوتا ہے،کیونکہ خدائے متعال فرماتا ہے ''انا خیر شریک من اشرک معی غیری فی عملہ لم اقبلہ الا ما کان خالصا[1]'' ''میں بہترین شریک ہوں جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک قرار دے اس کے عمل کو میں قبول نہیں کرتا ہوں ،اس عمل کے سوا جو خالص ہو''پس اگر کسی نے تعبدی عمل میں غیر خدا کو خدا کے ساتھ شریک قرار دیا ہے ،تو چونکہ یہ عمل خالص نہیں ہے ضائع ہو جاتاہے۔

ممکن ہے ایک عمر تلاش و کوشش کے بعدانسان کے دن سیاہ ہو جائیں اور بد بخت ہو جائے ، جیسے ایک عمر اس نے علم حاصل کرنے میں بسرکی اس خیال میں خداکے لئے علم حاصل کر تا تھا ،لیکن جب وہ اپنی نیت کو ٹٹو لتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد مقام اور عہدہ حاصل کر نا تھا یا اپنی اجتماعی حیثیت کو بنانا تھا، وہ اس لئے کوشش کرتا تھا کہ لوگ اسے نیک اور پارسا جان لیں اور لوگوں میں شہرت پائے یا کسی عہدے پر فائز ہو جائے ۔اگراس قسم کا شخص کہے : میں نے لوگوں کی خدمت کی ہے ،بہت سے فقیروں کو بھوک سے نجات دلائی ہے ، بہت سے بیماروں کے لئے علاج ومعالجہ کے وسائل فراہم کئے ہیں اور میں نے مدرسہ

[1] بحار لانوار ج ۷۰،ص۲۴۳

وہسپتال بنائے ہیں، توخدائے متعال اسے فرماتاہے :ان میں سے کوئی چیز تمھارے فائدے کی نہیں ہے ،تمھارا اجرو ثواب وہی لوگوں کا تمہاری تعریفیں کرنا،تمھاری تصویر کودیواروں پرنصب ہونا ، جرائد واخباروں میں تمہاری شہرت کا اعلان ہونا اور وہ ستائش ہے جوتمھاری ایک خیراورنیک انسان کی حیثیت سے کی گئی ہے۔ پس عمل کی شائستگی و پستی کا ملاک ومعیاراس کے دل سے مربوط ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ ان امور کوانجام دینے کا سرچشمہ کیا تھا،کیا سر چشمہ دنیا کی محبت ہے یا خدا کی محبت؟اگر کام خدا کے لئے مخلصانہ انجام دیا ہے تو انسان کی بلندی اور کمال کا موجب ہے اگر ایسا نہیں ہے تونہ صرف انسان کی بلندی اور روحی کمال کا سبب نہیں ہے ،بلکہ ممکن ہے زوال اور اس کی تنزلی کا باعث ہو۔

اگر وہ کام عبادات کے زمرے میں ہوگا تو ریا کے ذریعہ باطل بھی ہو جائیگا اوراگر امور توصلی سے وابستہ تھا اور قصد قربت اس میں شرط نہ تھی تو وہ اپنی قدر وقیمت کھو دیتا ہے، اورجوثواب قصد قربت کی وجہسے اس پر مرتب ہوتا ہے وہ نہیں ملتاہے۔پس ہر وہ کام جو لوگوں اور اسلا می یاغیر اسلامی معاشرے کے نفع سے مربوط ہے،وہ قدر وقیمت کا حامل نہیں ہے۔ حتی کام کی قدرو قیمت صرف اس لئے نہیں ہے کہ دین اور دینداروں کے لئے فائدہ مند ہے،بلکہ، ممکن ہے انسان ایک کام انجام دے کہ جو دین کے لئے سودمند ہو،لیکن نہ صرف یہ کہ خود اس کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہبلکہ مضر بھی ہو،کیونکہ اس کا یہ کام اخلاص کی بنا پر نہیں تھا ۔

تاریخ اسلام میں کتنے ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے کچھ ایسے کام انجام دئے ہیں جو دین کے لئے مفید تھے اور کبھی دین کی ترویج اور نشر کا سبب بھی بنے ہیں لیکن چونکہ وہ قصد قربت نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ کام ان کے لئے سود مند نہیں تھے،ان کا قصد کشور کشائی،شہرت حاصل کرنا اور لوگوں میں اپنے لئے محبوبیت پیدا کرنا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی کام انسان کے کمال وبلندی کا سبب نہیں بن سکتا ایک روایت میںآیا ہے''،ان اللہ یؤید ہذا الدین برجل فاجر'''[1]'خدائے متعال کبھی اپنے دین کوفاسد شخص کے توسط سے تائید کراتاہے''،ممکن ہے پوری تاریخ میں کچھ فاسق وفاجر حکام نے،اپنے شخصی اغرض اور شہوت طلبی کی بنا پراپنی

---

[1] کافی ج، ۵،ص، ۱۹

مملکت کو وسعت بخشنے کیلئے کشور کشائی کی ہو اور وہ اسطرح دین اسلام کی ترویج کا سبب بھی بنے ہوں اور اگرچہ ان کا یہ کام دین اسلام کے لئے مفید تھا ،لیکن خود ان کے لئے فائدہ مند نہیں تھا۔اس بناء پر اندرونی عوامل اور نیت کے نقش کو ملحوظ نظر رکھنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہجو چیز امور کی اہمیت و منزلت کا باعث ہے وہ صرف خدائی عنصر اور الٰہی انگیزہ ہے،اور ممکن ہے کوئی کام ظاہر میں حقیراور پست نظر آئے،لیکن چونکہ شائستہ اور خالص الٰہی انگیزہ کے تحت انجام دیا گیا ہے ،اسلئے وہ مقدس اور قیمتی ہے۔ ثقافتی اور مذہبی پروگراموں میں اخلاص کی اہمیت:اس سلسلہ میں دین کے مبلغین اور مروجین کو توجہ کرنی چاہئے کہ تبلیغ اور دینی اورمذہبی پروگراموں کے انعقاد میں نیز ،مذہبی مراکز کی تاسیس اور ان امور کیطرف دوسروں کوتشویق کرنے میں ان کا محرک اور نیت خالص ہونی چاہئے۔

یہ ممکن ہے کہ تبلیغات اوراپنے موعظوں سے دوسروں کی صحیح راستہ پر رہنمائی کریں اور انھیں دینی وثقافتی مسائل کی طرف جذب کریں اور مسجد تعمیر کرنے اور مذہبی مراکزتاسیس کرنے میں تلاش اورعزم وارادہ کا مظاہرہ کریں اس طرح ثقافتی مسائل کی ترویج کے لئے ،اور معاشرے کے ثقافتی پہلوؤں کو مقدار و کیفیت کے اعتبار سے فروغ دینے کے لئے ماحول ساز گار بنائیں ۔لیکن انھیں یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ ان کی یہ سرگرمیاں ہمیشہ خودان کے لئے سود مند ثابت ہوں گی اور قطعاان سے اخروی اعتبار سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

وہ سرگرمیاں اس وقت ہمارے لئے مفید ہیں اور ہمارے لئے کمال وبلندی کا سبب ہیجب ہمارا مقصد خدائے متعال ہو۔ہماری فعالیت اور کوشش صرف ترویج دین کے لئے ہو اور ان سے ہمارے ذاتی اغراض وابستہ نہ ہوں تو اس صورت میں ہمیں ایک عظیم سعادت ملے گی ،لیکن اگر ہمارے ذاتی اورمادی اغراض، ہماری فعالیت اورکوشش کا سبب بنے ہوں،تو ہمیں اپنے کام کے بارے میں خدائے متعال سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔پس ہمیں اس نکتہ سے غافل نہیں ہونا چاہئے اور خیال نہیں کرنا چاہئے کہ جب کسی کام کا بہت اچھا نتیجہ نکلے،تو ہمارے لئے بھی مفید ہے اور ہم مغرور ہو جائیں ،بلکہ ہمیں اپنی نیت کوٹٹو لنا چاہئے،اس صورت میں

نہ صرف ہم مغرور نہ ہوں گے بلکہ ممکن ہے شرمندہ بھی ہو جائیں ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مطلب کے بارے میں فرماتے ہیں ''یا اباذر!ان اللہ عز وجل یقول: انی لست کلام الحکیم اتقبل ولکن ہمہ وہواہ ،فان کان ہمہ وہواہ فیما احب وارضی جعلت صمتہ حمدا لی وذکرا ووقارا وان لم یتکلم '''اے ابوذر!خدائے عزوجل فرماتا ہے:میں دانشمند حکیم کی اس بات کو قبول نہیں کرتا ہوں جووہ زبان پر جاری کرتا ہے ،بلکہ اس کو قبول کرتا ہوں جو اس کے دل میں ہے اور وہ اس کا ہدف مقصد ہے ۔ اگر اس کا ارادہ وقصدوہ ہو جسے میں چاہتا ہوں اور جس پر راضی ہوں ،تواس کی خاموشی کو بھی اپنے ذکروحمدوثناکے طور پر قبول کرتا ہوں ،اگر چہ اسنے بات نہ کی ہو ۔''جولوگ حکمت آمیز باتوں کو سیکھ کرلوگوں کو بتاتے ہیں ،ان کی لوگوں کی طرف سے ستائش وتمجید کی جاتی ہے اور لوگ انھیں حسن ظن سے دیکھتے ہیں اور ان کے لئے شائستہ مقام کے قائل ہو جاتے ہیں البتہ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھے ،لیکن بولنے والے کواپنے بارے میں دیکھنا چاہئے کہ اس کے کام پر کس قدر اطمینان کیا جا سکتا ہے ۔

کیا جس وقت اچھی اور نصیحت آموز باتیں کر تا ہے ،تو خدا اسے قبول کرتا ہے اور اسکا تقرب حاصل کرتاہے یا نہیں ؟خدائے متعال نے خوداس سوال کا جواب دیا ہے کہ مجھے حکیمانہ باتوں سے کوئی کام نہیں ہے ،بلکہ میں اس مقصد و نیت کو دیکھتا ہوں جو اس بات کے پس پردہ پوشیدہ ہے ۔میں افراد کے میلانات اوررجحانات کو دیکھتا ہوں ۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ بات کرتے وقت اس کا دل لوگوں کی طرف متوجہ ہے تا کہ لوگ اس کے بیان کی ستائش کریں اوراس سے خوش ہوں ،یا یہ کہ وہ صرف اپنے فریضہ کودیکھتا ہے اور اس فکر میں ہے کہ اپنے فریضہ پر عمل کرے اوراس کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ لوگ اس کی باتوں سے خوش ہوں یا خوش نہ ہوں ، حتی اگر اس کی باتیں انھیں بری بھی لگتی ہیں جب بھی وہ اپنے فریضہ کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرتا ۔

پس جب اسکے میلانات اوررجحانات میری مرضی کے مطابق ہوں ،تو میں اسکی خاموشی پر بھی اس کو ذکر اورحمدوثنا کا ثواب بخشتا ہوں ،کیونکہ اس کادل میری طرف متوجہ ہے اوروہ ایسا کام انجام دیناچاہتاہے جو میری مرضی کے مطابق ہے ۔وہ جب میری مرضی کوخاموشی میں دیکھتا ہے تو خاموشی اختیار کرتا ہے،اس لحاظ سے اسکی خاموشی عبادت ہے،اور ممکن ہے اس کی یہ خاموشی

دوسروں کی عبادتوں سے زیادہ ثواب رکھتی ہو اور اسکی روحی اور معنوی تکامل ترقی میں زیادہ مؤثر ہو جس کی باتیں اور جس کے کام لوگوں کے لئے ہوں اور اس کا دل لوگوں کیطرف متوجہ ہو،وہ کوئی فضیلت وثواب حاصل نہیں کرتاہے۔ اس کا ثواب وہی لوگوں کی تعریف وتمجید ہے،کیونکہ اس نے خدا کے لئے کام ہی نہیں کیا ہے کہ وہ اسجزا دے ۔مذکورہ مطالب اور عمل کی ہویت ومایت میں اندورونی محرکات ومیلانات کے اثرات کی شناخت کے پیش نظر اگر ہم نے مشاہدہ کیاکہ کوئی شخص اپنے فریضہ کو تشخیص دینے کے بعد بات کرتا ہے،اگر چہ لوگ اسے پسند بھی نہ کریں،توہمیں جاننا چاہئے کہ اس کا مقصدو ہدف الہی تھا،اس لحاظ سے اس کا عمل اور بیان بلند قدروقیمت کا حامل ہے ۔

لیکن اگر بات کرنے میں لوگوں کو مد نظررکھے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اس بات کے کہنے پرخدائے متعال بھی راضی ہے، لیکن چونکہ اجتماعی شرائط کے تحت حالات کے نا مساعد ہونے کی وجہ سے بات نہیں کر تا ہے،اورڈرتاہے کہ لوگ اس کی بات سے ناراض ہو جائیں،تواس کا انگیزہ و ہدف خدائی نہیں ہے اوراس کا دل لوگوں کی مرضی کا پابند ہے،اس جہت سے اگر دوسرے مواقع اور فرصتوں میں بھی بات کرے،تواس کی باتوں کا کوئی فائدہ اور کوئیقدروقیمت نہیں ہے،کیونکہ اسکی توجہ لوگوں کی طرف ہے۔

نیت اور اندورونی رجحانات کی اہمیت ''یا اباذر!ان اللہ تبارک وتعالی لاینظر الی صورکم ولا الی اموالکم و اقوالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم ''''اے ابوذر!خداوند تبارک وتعالی تمہاری چیزوں یا تمہارے مال ودولت (اور باتوں)کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتاہے۔''(اصطلاح ''صورکم''کے بعد اصطلاح ''اقوالکم''کا استعمال مناسب تر و صحیح تر لگتا ہے البتہ اصطلاح ''اموالکم''کا استعمال بھی ممکن ہے صحیح ہو۔)خدائے متعال افراد کے ظاہر پر نگاہ نہیں کرتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کیادعوی کرتے ہیں ۔یعنی کس کی پیشانی پر سجدہ کے نشان نمایاں ہے یا کس نے کون سالباس پہنا ہے،اس پر نظر نہیں کر تا ہے،بلکہ افرادکے دلوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اعمال کو دیکھتاہے کہ کس قدر وہ اپنے دعوے میں سچاہے ۔ وہ دیکھتاہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے کیا وہ اسکے ظاہر سے بہتر ہے،یاخدانخواستہ اس کا باطن پلید اور آلودہ ہے اورظاہر خوشنما!کہ اس صورت میں نہ

صرف خدائے متعال اسے کوئی ثواب نہیں دیتاہے بلکہ اسے منافقین کے زمرے میں قرار دیتاہے ۔حدیث کا یہ حصہ دل ہلا دینے والا اور متنبہکر نے والا ہے اوراگران انتباہات پر سنجیدہ گی سے غور کیا جائے تو اس صورت میں اپنے بارے میں بہت سے فیصلے کو تبدیل کرنا پڑے گا ۔ (البتہ دوسروں کے بارے میں ہمیں حسن ظن رکھنا چاہئے) اگر انسان اپنی نیتوں کوٹٹولے ،تواسے معلوم ہوگاکہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور وہ خدا کے لئے خالص نہیں ہے،کم از کم اسکی نیتوں کا ایک حصہ غیرالٰہی ہے اور وہ کسی دوسرے انسان کوخدائے متعال کا شریک قرار دیتا ہے اورخدائے متعال نے خود فرما یا ہے کہ اگر کسی نے کسی دوسرے کومیرا شریک قرار دیا،تو اپنے حصہ کوشریک پر ہی چھوڑتا ہوں۔ (یعنی اسے چاہئے کہ اس کی جزا شریک سے دریافت کرے) ہمیں دیکھنا چاہئے کہ جو ہم بات کرتے ہیں جوکام انجام دیتے ہیں ،سبق پڑھتے ہیں ،موعظہ کرتے ہیں یاجونماز ہم باجماعت پڑھتے ہیں انمیں ہماری نیت اورغرض کیاہے .کیا ہم اس لئے نماز جماعت کے لئے جاتے ہیں کہ خدااسے پسند کرتاہے ،یااس کے علاوہ دوسرے اغراض و مقاصد ہیں؟اگر ہمارے عبادی کام خالص نہ ہوں اور ان میں غیر الہی اغراض شامل ہوں تو ہمارے دیگرتمام کاموں میں بھی نیت خالص نہیں ہوگی۔

اس کے علاوہ اگر ہمارے عبادی اعمال وفرائض خالص نہ ہوں تو وہ اصلا باطل ہیں ۔ممکن ہے لوگوں کی ہدایت کرنے والوں کی عبادتوں میں ریا ،ظاہرداری ،اور نفسانی اغراض کی دخالت جیسی آفتیں ،دوسروں سے زیادہ پائی جاتی ہوں ۔ایک مزدوراور کسب معاش کرنے والاجو روز مرہ کے کام اورتکان کے بعد،سورج ڈوبتے ہی ایک مختصرنماز پڑھتاہے ،وہ ریا نہیں کرتاہے۔لیکن جو امامت جماعت کی ذمہ داری انجام دیتاہے اور لوگوں کو موعظہ، علوم دینی کی تعلیم اوردوسروں کی ہدایت میں وقت صرف کرتا ہے ،اس کے لئے ریاکا مسئلہ اورغیرالٰہی عناصر و مقاصدسےآلودہ ہونا واقعی طور پر حساس ہے اس لئے کہ ریا میں آلودہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے انسا ن دنیوی ضرر سے بھی دوچارہوگا اور آخروی نقصان سے بھی اٹھانا پڑے گا ۔اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بیان کہ ظاہری رفتارواعمال اورتقوی کا دعوی کرناتقوی کی دلالت نہیں ہے اورتقوی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو افراد کے

باطن اور اس کے دل کے اندر پایا جاتا ہے اور یہ عمل کی بلندی اورنیت ومقصد کے خالص ہونے کا معیار ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''یا اباذر!التقوی ہہٰنا،التقوی ہہٰنا ''''اے ابوذر !تقوی یہاں ہے ،تقوی یہاں ہے'' ،جو بھی ظاہر میں،شائستہ اعمال انجام دیتا ہے ،نمازیں زیادہ پڑھتا ہے اہل ذکراور لوگوں کی خدمت کرنے والا ہے تو یہ سارے امور اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ وہ شخص باتقوی ہے،بلکہ اس کی نیت اور اس کے اندر کے عوامل کو دیکھنا چاہئے اگر خالص خدا کے لئے تھے تو وہ شخص متقی ہے ورنہ ظاہرا تقوی نمائی کرتا ہے ۔ہم نے اس سے پہلے کہا کہ کبھی محرمات سے پرہیز ،تکالیف اور واجبات پر عمل کرنا تقوی ہے اور کبھی اس ملکہ نفسانی کوتقوی کہتے ہیں جو شائستہ وصالح اعمال کا سرچشمہ ہو،اس تصور کے پیش نظر،ہمارے اعمال،ہماری عبادتیں اور دیگر نیکیاں اس وقت تقوی کا مصداق بنیں گی کہ جب ان کا منشا وبنیاد خدا کی محبت ہو اور ان کا محرک رضای الہی ہو۔پس ہمیں عمل کی بنیادپر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے ،کیونکہ کوئی بھی کام کسی محرک اورنفسانی انگیزہ کے بغیرانجام نہیں دیا جاتا ۔

انسان کے اختیاری اعمال اس کے اندرونی ارادے اورنیت کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور وہ انگیزہ انسان کے اندر کام کوانجام دینے کا شوق پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں وہ رفتار وگفتارہماری نیت وارادہ کا مظہر ہے ۔البتہ ممکن ہے انسان کسی کام کو انجام دینے کی نیت رکھتا ہواوراپنے آپ کواس کام کوانجام دینے کیلئے آمادہ کرے ،لیکن اس کام کے خارجی عوامل ایک دفعہ نابو دہو جائیں اور وہ اس کام کوانجام دینے سے قاصر ہو جائے۔اس صورت میں کام کا معنوی اثر اس کے دل میں باقی رہتاہے،اگر چہ خارج میں اسکا کوئی اثر رونما نہیں ہوا ہے۔وہ اثرمعنوی اسکے داخلی میلان اورنیت پر منحصر ہے کہ جس کو روایت میں لفظ (ھم)سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:دیکھ لو کہ تمھارے کام کا محرک کہاں سے وابستہ ہے تمھارے داخلی رجحانات کس سمت میں گامزن ہیں۔کیاخدا اوراس کی مرضی پر تمہاری نظر ہے ،یالوگوں اور اپنے دنیوی منافع پر ؟اگر تم نے کام کوغیر الٰہی محرک

کے ایماء پر انجام دیا ہے، خواہ وہ کام نیک اور پسندیدہ ہو،لیکن اس میں معنوی اور الہی اثر پیدا نہیں ہوسکتا ،حتی اگر وہ کام دین کی ترویج اور اشاعت کا سبب بھی بنے جب بھی انسان کی سعادت کا سبب نہیں بن سکتا ، کیونکہ الٰہی نیت اس میں نہیں ہے جو خدا کا تقرب حاصل کرنے کا سبب ہو۔ خدائے متعال ، عمل کے باطن اورا سکے انجام دئے جانے والے منشا پر نظر رکھتا ہے۔اب اگر وہ منشا و محرک الٰہی تھا تواس عمل کو قبول کرتا ہے ورنہ عمل کو مسترد کردیتا ہے اور عمل کی ظاہری صورت سے کوئی سرو کار نہیں رکھتا ہے:(لن ینال اللہ لحومھا ولادماوہا ولکن ینالہ التقوی منکم[1]) ''خدا تک ان جانوروں کا نہ گوشت جانے والا ہے نہ خون ۔

اس کی بارگاہ میں صرف تمہارا تقوی جاتاہے۔''محرک اورنیت کو صحیح وسالم بنانے کاراستہ:پس صورت عمل کا خدا سے کوئی ربط نہیں ہے ،بلکہ صورت عمل کالوگوں اورطبیعت سے رابطہ ہے جوچیز عمل کوخدا سے مربوط بناتی ہے وہ انسان کادل اور اسکی نیت ہے۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات کے پیش نظر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کونسا محرک ہمیں وہ کام انجام دینے کا سبب بنا ہےاگر ہمارے محرکات خالص نہ تھے،ہمیں انھیں خالص کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ۔

البتہ نیتوں اور محرکات کوخالص کرنا ایک مشکل کام ہےاور اسکے لئے مقدمات و مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہےاس راہ میں سب سے پہلے ہمیں خدا سے مدد مانگنی چاہئے اورغیر الہی تمایلات کے شائبوں سے اپنے نفس کو پاک کرنے کے لئے عزم وارادہ کی ضرورت ہے ریاضت،مشق اور خود سازی سے ہمیں یہ مرحلہ حاصل ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے جب انسان دیکھے کہ اس کی نیت خالص نہیں ہےاور اس میں غیر الٰہی عنصر شامل ہے تو وہ اپنی نیت کو خالص کرنے کے لئے کوشش کرنے کے بجائے کام کوہی ترک کردے ۔یہ بھی شیطان کا پھندا ہے کہ جو انسان کونیک کام انجام دینے سے روکتا ہے۔ مثلا جب عشرۂ محرم آتاہے،فیصلہ کرتاہے تبلیغ کے لئے جائے،لیکن جب اپنے انگیزہ اورنیت پر غورو خوض کرتاہے تواسے ناخالص پاتاہے اورتبلیغ پرجانے سے ہی منصرف ہوجاتا ہے اوراپنے آپ سے کہتا ہے:چونکہ میری نیت خالص نہیں ہے۔اس

---

[1] حج،۳۷

لئے تبلیغ پر نہیں جاؤں گا ۔یہ کام بالکل وہی ہے جو شیطان چاہتا ہے۔کیونکہ انسان کا فرض یہ ہے کہ تبلیغ پر جائے اور لوگوں کو ہدایت کرے ،اگر ہم نے شیطان کے وسوسہ کی وجہ سے تبلیغ پر جانا چھوڑ دیا،تو شیطان کوایک مناسب فرصت مل گئی کہ جس میں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے ۔اس بنا پر اگر ہم نے دیکھا کہ ہماری نیت خالص نہیں ہے،تو ہمیں فریضہ اور تکلیف کوترک نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیں اپنی نیت کو خالص کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔اگرہماری تبلیغی سرگرمیوں کے عوض ہمیں کچھ پیسہ دیئے گئے تو یا ہم اسے نہ لیں یا اس میں سے تھوڑا بہت قبول کرلیں یااسے ضروری امور میں صرف کرنے کا فیصلہ کریں کہ اگر ہم نے کسی کواپنے سے محتاج ترپایا،تواس کی مدد کردیں گے۔اس قسم کے کام نفسانی خواہشات اورغیر الٰہی محرکات میں کمی واقع ہونے اور عمل کے خالص تر انجام پانے کا سبب بنتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے نقل کیا ہے کہ وہ طالب علمی کے دوران اطراف تہران کے ایک شہر میں تبلیغ کے لئے گیا۔وہاں ایک محترم عالم دین تھے کہ لوگ جنھیں اچھی طرح پہچانتے تھے اور وہ لوگوں میں کافی اثر رسوخ رکھتے تھے۔مجھے اس شہر کے اطراف میں واقع ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا ۔چونکہ میں تبلیغی کام میں تجربہ نہیں رکھتا تھااورپہلی مرتبہ تبلیغ پر گیا تھا،اس لئے عشرہ کے دوران میری مجلسوں کولوگوں نے پسند نہیں کیا او رکوئی خاص آؤ بھگت بھی نہیں کی،آخر میں ایک مختصرنذرانہ مجھے دیا گیا ۔تبلیغ کے اختتام پرمیں اور دوسرے مبلغین اس عالم دین سے رخصت ہونے کے لئے ان کے پاس گئے۔

اس عالم دین نے انتہائی فروتنی اور تواضع سے ہماری مہمان نوازی کی،گفتگو ختم ہونے پر مذاق میں ہم سے کہا :دوستو!آؤ ہم اپنی آنکھوں کوبند کر کے جو کچھ اس عشرہ میں بطور زندہ ہمیں ملاہے اسے ایک جگہ جمع کریں اور اس کے بعد اسے آپس میں مساوی صورت میں تقسیم کریں !معلوم تھا کہ وہ عالم دین ایک مشہور و معروف شخصیتتھے اور ان کی مجلسیں بھی موثر تھیں اور پیسے بھی انھیں کافی ملے تھے ۔وہ چونکہ جانتے تھے کہ ہمیں کوئی خاص پیسے نہیں ملے ہیں ،اور وہ اس طرح ہماری مدد نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جس سے ہماری شخصیت مجروح ہو ،اس لئے مذاق میں ہم سے اس قسم کا تقاضا کیا ۔ہم بھی تہہ دل سے خوش ہوئے،چونکہ انہوں نے مذاق میں ہم

سے وہ درخواست کی تھی اس لئے ہمیں برا بھی نہیں لگا ۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر کے پیسوں کو ایک جگہ جمع کیا ،جب پیسے افراد کے درمیان تقسیم ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی رقم کے کئی گنا پیسے ملے تھے !جی ہاں ،ایسے افراد گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں جن میں مادی محرکات ضعیف ہیں یا اس قسم کے کام سے ان محرکات کو ضعیف کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کار انسان اپنی زندگی میں مشکلات اور ضرورتوں کا سامنا کرتا ہے ،خاص کر گرانی اور مہنگائی ،مادی رجحانات کو ہوا دیتے ہیں ،اب ان محرکات اور رجحانات میں قدرے کمی واقع ہونے کے لئے مناسب ہے کہ ہم نذر کریں اور ارادہ کریں کہ جو کچھ ہمیں بطور نذرانہ ملے گا اس میں ایک حصہ اہم ایسے لوگوں کے حوالہ کریں گے جو ہم سے زیادہ محتاج ہیں، کیونکہ جس طرح ہم سے زیادہ مالدار بہت ہیں اسی طرح ہم سے زیادہ فقیر بھی بہت ہیں جو ہم سے زیادہ محتاج ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو کچھ ہمیں ملے اس میں سے کچھ حصہ اپنے سے محتاج تر لوگوں کو پہنچادیں ۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کریں،اس طرح دنیا سے ہماری وابستگی بھی کم ہوگی اور نیکی کاروں کی صفت بھی ہم میں پیدا ہوگی۔

(لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون[1]) ''تم نیکی کی منزل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو۔ ''جب انفاق کرنا چاہتے ہو تو نئے نوٹ دینے کی کوشش کرو نہ فرسودہ اور پھٹے پرانے نوٹ،کہ یہ امر بھی تمہارے معنوی درجات میں اضافہ کرتاہے اور تمہاری دنیاسے وابستگی کو بھی کم کرتا ہے اور سبب بنتا ہے کہ تمہارے اعمال اس کے بعد خالص تر بن جائیں لہذا جیسے عرض کر چکا ہوں،طے کر لیں کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کا ایک حصہ دوسروں کو دیدیں ،کیا بہتر ہوتا اگر ہمیں ان پیسوں کی زیادہ ضرورت نہ ہونے کی صورت میں،اپنے اطراف میں موجود کسی مقروض شخص کو دیدیں ۔

جس کے گھر میں روزانہ طلب گار (قرض دینے والا) آکر اپنے پیسہ کا تقاضا کرتاہے اور وہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے شرمندگی سے دوچار ہوتا ہے ایسا کیوں نہ کریں کہ سارا پیسہ اسے دیدیں تاکہ وہ اپنا قرضہ چکادے ہم تو قرضدار نہیں ہیں، کیا حرج ہے فرض کریں ہم

---

[1] آل عمران،۹۲

تبلیغیفر پر نہیں گئے ۔ فرض کریں خدا نہ کرے ہمارے گھر میں ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوا اور اس کی بیمارداری کی وجہ سے تبلیغ پر جانا ہمارے نصیب میں نہ ہو ۔ اگر کوئی مقروض مسلسل اپنے قرض کو ادا کرنے میں تاخیر کرتا ہے اور اس کی آبرو خطرے میں پڑی ہے اور وہ جانتا ہے کہ اگر تبلیغ پر نہیں گیا تو اپنا قرض ادا نہیں کر سکتا ہے، تو اسے تبلیغ پر جانے سے نہیں روکنا چاہئے ۔ بہر حال قرض ادا کرنا ایک واجب تکلیف ہے، کیا حرج ہے تبلیغ پر جائے اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے بدلے میں محترمانہ اور شان روحانیت کی رعایت کرتے ہوئے نیز کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے روحانیت کی بدنامی ہو، اگر اسے کوئی نذرانہ دیا گیا تو وہ اسے قبول کرلے اگر اسکی نیت یہ ہو کہ تبلیغ پر جائے اگر اسے کوئی نذرانہ دیا گیا تو اس سے اپنا قرض ادا کرے گا تو اس نے کوئی خلاف شرع کام انجام نہیں دیا ہے، اگر چہ نفس کو جس کمال تک پہنچنا چاہئے تھا نہیں پہنچتا ہے ۔

لیکن اس کام میں بھی اخلاص کا قصد کیا جا سکتا ہے ،کیونکہ قرض ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کی نیت یہ ہو کہ چونکہ خدائے متعال نے واجب کیا ہے کہ قرض کو ادا کیا جائے میں راہ خدا کی تبلیغ پر جاتا ہوں تاکہ کچھ پیسے حاصل کروں اور اس سے قرض ادا کروں، اس طرح اس کا عمل عبادت ہو جائیگا ۔

بہر صورت ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ دینوی تمایلات کو کم کریں اور مال دنیا کی نسبت بے اعتنائی دکھائیں اور دیکھ لیں کہ ہمارے مولا و مقتدا حضرت علی علیہ السلام ہیں کہ جن کی نظر میں دنیا کی رعنائیاں کس قدر پست و حقیر تھیں فرماتے ہیں: (دیکھو اس ذات کی قسم کہ جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں ۔ اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنیوالوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علما سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالموں کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں، تو میں خلافت کے اونٹ کی باگ ڈور اسی کی پشتپر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا ۔) اس کے بعد آپ نے فرمایا ''ولألفیتم دنیاکم ہذہ ازہد عندی من عفطۃ عنز[1]'' اور تم

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام)خطبہ ۳، ص ۵۲

اپنی دنیاکو میری نظروں میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ناقابل اعتناپاتے۔ ''دوسری جگہ پر فرمایا ہے'': واللہ لدنیاکم ھذہ اھون فی عینی من عراق خنزیر مجزوم[1] ''''خداکی قسم :یہ تمہاری دنیا میری نظروں میں سور کی اس بے گوشت ہڈی سے بد تر ہے جو کسی مجزوم و مبروصکے ہاتھ میں ہو''جزام و برص میں مبتلا شخصکی صورت اس قدر بری اور گھناونی ہوتی ہے کہ کوئی اسکے نزدیک جانا پسند نہیں کرتاہے،خاص کر اس وقت جب بیماری کے سرایت کرنے کا خوف ہو۔ اب اگراس جزام وبرص کے مریض کہ جس کو انسان دیکھنا بھی برداشت نہیں کرتا چہ جائے کہ اس کے ہاتھ میں سورکی ہڈی ہو،کون چاہے گا کہ اس ہڈی کواس کے ہاتھ سے لے !دنیا،اس کی رعنائیاں ،لباس ،گاڑی ،گھر،فرش اور دوسرے دنیوی امکانات و وسائل حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں جزامی کے ہاتھ میں سور کی ہڈی سے بدتر ہے!

ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں '': فلتکن الدنیا فی اعینکم اصغر من مثالہ القرظ وقراضۃ اللحم واتعظوا بمن کان قبلکم قبل ان یتعظ بکم من بعدکم وارفظوہا ذمیمۃ فانہا قد رفضت من کان اشغف بہا منکم[2] ''''پس تمہاری نظر میں دنیادرخت سلم کے پتے کے کوڑے سے پست تر ہونی چاہئے (سلم بیابان میں اگنے والا ایک درخت ہے اس کے بدبودار پتے دباغت میں استعمال کئے جاتے ہیں)اور کپڑے کو کاٹتے وقت قینچی سے گرے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے زیادہ چھوٹی ہونی چاہئے ۔

اپنے اسلاف کے حالات سے سبق حاصل کرو،اس سے پہلے کہ آنے والی نسل تم لوگوں سے سبق حاصل کرے۔دنیا کو چھوڑدو یہ قابل مذمت اورناپسندیدہ ہے، کیونکہ اس دنیا نے ان لوگوں کے ساتھ وفانہیں کی ہے جو تم لوگوں سے پہلے اس سے محبت کرتے تھے''البتہ فرائض کو انجام دینے کے لئے اور جس حد میں خدائے متعال راضی ہے اورتمام شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے انسان کے لئے مباح مال کوحاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ ورنہ یہ انتہائی بے غیرتی ہے کہ انسان حیلہ،فریب کاری ،لوگوں کی چاپلوسی،اور دوسروں کی بے احترامی اور اسلام وروحانیت کو خطرے میں ڈال کر مال دنیا حاصل کرنے یااس میں اضافہ کرنے کی

[1] نہج البلاغہ حکمت ۲۲۸،ص۱۱۹۲
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳۲،ص ۱۰۸

کوشش کرے۔ کیا خوب ہے کہ میرالمؤمنین علیہ السلام کے ان بیانات کو اپنا سر مشق اور نصب العین قرار دیں تاکہ دنیا کے لالچی نہ بنیں، کیونکہ اگر اس پست و حقیر دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں جگہ پا گئی، تو تقوی اور خدا کی محبت ہم سے دور ہو جائے گی۔ جس دل میں دنیا کی محبت جگہ بنالے وہ حضرت علی ں کی نظر میں ایک جزامی کے ہاتھ میں سور کی ہڈی سے پست تر ہے اس دل میں خدا علی علیہ السلام اور حسین کی محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمیں دل کی صفائی کرنی چاہئے اور آلودگیوں اور کدورتوں سے پاک کرنا چاہئے تاکہ اس میں خدائے متعال اور امام حسین علیہ السلام کی محبت جگہ بنالے، اور اگر دین خدا، الہی اقدار اور اسلامی اخلاق کی بات آئے تو دل کو اس کی ہمراہی کرنا چاہئے تاکہ دوسروں پر شائستہ اثر پڑے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین وصلی الله علی سیدنا محمدوآله الطیبین الطاهرین ولعنة الله علی اعداءهم اجمعین